نگارشات

(ادبی اور علمی مضامین کا مجموعہ)

از

جناب آغا محمد باقر صاحب
ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل، بی۔ ٹی،
نبیرۂ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم

حسب فرمائش
شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

سنہ ۱۹۴۵ء

عالمگیر الیکٹرک پرنٹنگ پریس تحصیل بازار لاہور میں باہتمام ... چھپی
سر ایڈیشن ایک ہزار

ہمارے دور
...رق ریزی سے
...ر کی لکیر سمجھتے ہیں،

مضامین

"انشاپردازی"

دُنیا میں ہر شخص کوئی نہ کوئی وصف لے کر آیا ہے۔ اور وہ اپنے مخصوص اوصاف سے دوسروں کو کچھ نہ کچھ فائدہ بھی ضرور پہنچاتا ہے ہمارے جن مضمون نگاروں کو انشاپردازی کا وصف عطا ہوا ہے وہ اپنے زورِ قلم سے زندگی کے رُوحانی اور جمالی شعبوں کو چمکاتے اور انسان کی دماغی، رُوحانی اور وجدانی گرسنگی کو دُور کرنے کے لئے لطیف غذا مہیّا کرتے ہیں، انشاپرداز کسی موضوع کے متعلق اپنے تاثرات کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا انشاپرداز کی حیثیت ایک مُصوّر کی سی ہے، لیکن مصوّر اور انشاپرداز میں کچھ فرق ہے، انشاپرداز کسی چیز کے انہی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جو اس کے دل و دماغ کو زیادہ متاثر کرتے ہیں، اور ان چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے، جو اس کے زورِ بیان سے خود بخود تصوّرات میں آسکتی ہیں، اس کے مقابلے میں مصوّر مجبور ہو جاتا ہے کہ ماڈل کو پورا کرنے کے لئے ضروری چیزوں کے ساتھ ساتھ غیر ضروری چیزوں کو بھی پس منظر میں پیش کرے۔ ہمارے دور

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انشاپرداز ... حرف ریزی سے ... کی لکیر سمجھتے ہیں،

گورکھ دھندا یا خیالات کا زرّیں جال ہے اس سے عملی دُنیا
میں کچھ فائدہ پہنچتا ہے نہ اس میں صداقت ہوتی ہے اِس
لئے اس پر وقت ضائع کرنا فضول ہے، بے شک فنِّ لطیف
میں عام طور پر ظاہری صداقت کو مدِّ نظر نہیں رکھا جاتا، لیکن
اس کے باوجود انشا پردازی جس قسم کی صداقت کو بے نقاب
کرتی ہے عملی دُنیا میں اس سے لطف اندوز ہونا اور واقفیّت
حاصل کرنا ازبس ضروری ہے، مثلاً بعض اوقات انسان اپنے کام
کاج اور روزانہ کی پریشانیوں سے تھک ٹوٹ کر بالکل پژمُردہ
ہو جاتا ہے۔ اگر ایسے اوقات میں اس کے سامنے کوئی ادبی
تصنیف آجائے تو وہ اس میں مستغرق ہو کر اپنے تمام رنج و الم
اور کسل کو بھول جاتا ہے، کبھی روتا کبھی کھلکھلا کر ہنستا ہے، کبھی
مُسکراتا ہے، غرض ادب کی بدولت وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر
ہلکا ہو جاتا ہے۔

فنِ انشا پردازی ایک قسم کی دماغی ورزش ہے جو شخص یہ
ریاضت کرتا ہے، وہ ضرور انشا پرداز بن سکتا ہے، لیکن ہم
[illegible]دلوں میں یہ غلط خیال مستحکم ہو گیا ہے کہ انشا پردازی
[illegible]ہے، اور وہ اِن لوگوں کے لئے مخصوص ہے
[illegible]نے کے مستحق ہیں، اس خیال کی بدولت ہمارے
اچھّے انشا پردازوں کی تعداد میں کمی واقع ہو

رہی ہے، جو انشاپرداز اپنی جگہ خالی کرتا ہے، دوسرا کوئی شخص اُس کی جگہ کو پُر نہیں کرسکتا، ہم تسلیم کرتے ہیں، بعض انشاپرداز پیدائشی اور فطری انشاپرداز بھی ہوتے ہیں، لیکن یہ فیصلہ کرلینا سراسر غلطی ہے کہ اس قدرتی صلاحیّت کے لئے مشق کی ضرورت نہیں اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی درست نہیں کہ انشاپردازی اہلِ زبان کا ورثہ ہے، انشاپردازی ایک فنِّ لطیف ہے، اور یہ ان لوگوں کا جائز ورثہ ہے جو اپنے خیالات اور تاثرات کو نہایت اچھے اور موزوں الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش مسلسل جاری رکھتے ہیں، اگر آپ کو کسی باکمال مُصنّف کا قلمی مسوّدہ دیکھنے کا اتفاق ہو تو آسانی سے اندازہ ہو سکے گا کہ وُہ ہر لفظ کی نشست، آواز، اثر اور موزونیّت پر کس قدر عرق ریزی کرتا ہے، کسی لفظ کو آگے پیچھے کر کے فقرے کا زور بڑھاتا ہے کہیں کاٹ چھانٹ کر کے فقرے پر فقرہ اور لفظ پر لفظ چڑھاتا اور اپنے طرزِ بیان کی موزونیّت اور دل نشینی میں اضافہ کرتا ہے، غرض ایک ایک لفظ پر پسینہ بہاتا اور آنکھوں کا تیل ٹپکاتا ہے پھر کہیں جاکر ایسا مضمون تیار ہوتا ہے جو قبول کی سند پاتا ہے، ہمارے دَور کے عام مصنّفین اور انشاپرداز اس قسم کی جانکاہی اور عرق ریزی سے گریز کرتے، اور جو کچھ اپنے قلم سے لکھ دیں اُسے پتھّر کی لکیر سمجھتے ہیں، اہلِ زبان کا تو کہنا ہی کیا ہے وہ تو یہ سمجھے بیٹھے ہیں ۵

سند ہے جو بھی ہم کہہ دیویں عارفؔ
زبانِ ریختہ اپنی زباں ہے

یہی وجہ ہے کہ اب نہ تو پہلے جیسے باکمال انشا پرداز پیدا ہوتے ہیں اور نہ آج کل کے انشا پردازوں کی تحریروں میں پرانے انشا پردازوں کی تحریروں کا سا ادبی لطف آتا ہے۔

(شمس العلما مولانا آزاد مرحوم اردو کے بہترین انشا پرداز تھے، وہ انشا پردازی کے متعلق اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں "یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر باپ چاہے بیٹے کو سکھاؤں اور اس میں مادہ نہ ہو تو کچھ بنا نہیں سکتا، اور اگر اس میں مادہ کامل موجود ہے تو کتابیں بھی اُستاد کافی ہیں، میرے اُوپر جو کچھ تمہیں خیال ہے یہ فقط بھرم ہی بھرم ہے، مَیں نے اس کام میں کبھی اصلاح نہیں لی، نہ عربی میں نہ فارسی میں نہ اُردو میں، ہاں اچھے اچھے صاحب کمالوں کے کلام دیکھتا رہا، ان کے دیکھتے دیکھتے ایک رنگ ایسا بے رنگ پیدا ہو گیا کہ سب سے الگ ہے، اب چاہے کوئی اسے بے رنگ کہے چاہے خوش رنگ، بس یہی طریقہ اُستادی شاگردی کا ہے، اگر چند روز پہلے تم یہاں آؤ پھر اپنے سامنے چند کاغذ مَیں تم سے لکھواؤں اور تمہارے سامنے خود بناؤں، شاید اُس کا اثر کچھ بہتر ہو۔"

انشا پردازوں کے فقدان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج کل ابتدائی تعلیم ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو خود صحیح معنوں میں

تعلیم یافتہ کہلانے کے مستحق نہیں، جو شخص چند ابتدائی کتابیں پڑھا سکتا ہے وہ معلّم بن جاتا ہے، معلّمین کی ناقص تعلیم کا اثر طالب علموں کے لئے زہرِ قاتل کا اثر رکھتا ہے، نااہل اساتذہ طلبا میں علم حاصل کرنے کا شوق ہی پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ اگر کسی طالب علم میں کچھ شوق ہوتا بھی ہے تو وہ اس کو فنا کر دیتے ہیں، ان اثرات سے ذہین اور ہوشیار طالب علم کور ذوق بن جاتے ہیں۔ ان کی توجہ تحصیل علوم کی طرف سے ہٹ کر غیر ضروری اور نقصان دہ مسائل کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔

اس قومی نقصان کی ذمّہ دار موجودہ طرز تعلیم ہے، ورنہ پہلے زمانے میں بھی یہی لڑکے تھے، بلکہ آجکل تعلیم حاصل کرنے میں پہلے سے بہت زیادہ آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں، پھر بھی کوئی ایک مدرسہ ایسے طالب علم پیدا نہیں کر سکتا جن کا پہلے زمانے کے باکمال لوگوں سے مقابلہ کیا جا سکے، اگر ہماری ابتدائی تعلیم نہایت قابل اور ہوشیار معلّمین کے سپرد کی جائے تو یقیناً ع

"جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را"

کا سماں پیدا ہو جائے، بہت سے کور ذوق طلبا، "لوہے کے چنے" بڑے شوق سے چبایا کریں اور اُستاد کی علمی قابلیت اور عالمانہ ذہنیت ان پر وہ اثر کرے جو پارس لوہے پر کرتا ہے۔

انشا پردازی کی ابتدائی مشق

ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے زمانے میں

ہر طالب علم کو امتحان میں کامیاب ہونے کی غرض سے اُردو میں مضمون لکھنے کی کچھ نہ کچھ مشق ضرور کرنی پڑتی ہے، طلباء کو عام طور پر مضمون لکھتے وقت بڑی دقتوں کا سامنا ہوتا ہے، اکثر طالب علم دوسروں کے لکھے ہوئے مضامین سے استفادہ کرتے ہیں، کبھی ماسٹر صاحب اپنی قابلیت کے مطابق خود ہی انٹ شنٹ لکھواکر خانہ پری کر دیتے ہیں، بعض ذہین طالب علم اکثر ضروری مضمون کتابوں میں سے زبانی یاد کر لیتے ہیں، ان طریقوں سے وہ امتحان میں کامیاب تو ہو سکتے ہیں، لیکن اس طریق کار سے انشا پردازی کا اصل مطلب فوت ہو جاتا ہے، قوت متخیلہ نشو و نما نہیں پاتی، خیالات کی پرواز بھی بلند نہیں ہو سکتی، میرے نزدیک مضمون نویسی سکھانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُستاد جس موضوع پر مضمون لکھوانا چاہے، پہلے خود اُس کا اچھی طرح مطالعہ کرے، ضروری نکات ترتیب وار اپنے ذہن میں یا کسی کاغذ کے پُرزے پر محفوظ رکھے، پھر طلباء کے سامنے نہایت دلچسپ انداز میں ہر نکتہ پر بحث کرے، اس طریق سے چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے طالب علم بھی ہر مضمون کو اچھی طرح سمجھ کر اپنے خیالات کا اظہار کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ انشا پردازی سیکھنے اور اس کے شوق کو ترقی دینے کے لئے ضروری ہے کہ مطالعہ کو وسعت دی جائے،

بلند پایہ مصنّفین کے عمدہ مضامین، ان کا دلنشین اندازِ بیان، برجستہ محاورات اور دلپذیر طرزِ تحریر کو اپنے دماغ میں محفوظ رکھنے سے بھی خاطر خواہ فائدہ ہو سکتا ہے، اگر کسی انشا پرداز کا کوئی مضمون پسند آئے تو پہلے اس کو اچھی طرح ذہن نشین کیا جائے پھر اس کو دل ہی دل میں دُہرایا جائے، اس کے بعد اس مضمون کو اپنے الفاظ میں لکھا جائے اس کے ساتھ یہ بھی کوشش کی جائے کہ خیالات کی ترتیب اور عبارت کا زور نمونے کے مضمون سے بہتر رہے اور وہ نکات جو کسی وجہ سے پہلے مضمون میں نظر انداز ہو گئے ہیں اپنے مضمون میں آ جائیں، اگر اس قسم کی مشق کچھ عرصے تک جاری رہے تو انشا پردازی بہت آسانی سے آسکتی ہے اور اس پر اگر کوئی اچھا رہنما بھی مل جائے تو سبحان اللہ۔

ابتدائی مشکلات عام طور پر مبتدی انشا پردازی اور مضمون نویسی کا نام سُن کر گھبراتے ہیں اور بہت جلد فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ بات ہمارے بس کی نہیں، اس فرض سے تو زبان دان اور اہلِ زبان یا نہایت قابل آدمی ہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ انشا پردازی بہت مشکل فن ہے لیکن اتنا مشکل نہیں جتنا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ اس غلط احساس کے پیدا ہونے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں طلبہ کی قوّتِ متخیّلہ کو کام میں نہیں لایا جاتا، عام طور پر اساتذہ اکثر مضامین خود ہی تیار کر کے لکھوا دیتے ہیں۔ اس طرح

سے طلبا۔ کی قوتِ متخیلّہ کو آزادانہ کام کرنے کا موقع نہیں
ملتا، مضمون نویسی کے لئے سب سے ضروری یہ بات ہے
کہ انسان سوچ سکتا ہو، نیز جس زبان میں مضمون لکھنا ہو
اسی زبان میں سوچنے کی عادت ہو، قوتِ متخیلّہ اس قدر
تربیت یافتہ ہو کہ جس موضوع پر غور کیا جائے اس میں تسلسل
اور تسلسل میں باقاعدگی قائم رہے، اگر کوئی شخص اپنے
خیالات کو قلمبند کرنے کی کوشش کرے لیکن خیالات میں
تسلسل اور باقاعدگی نہ ہو تو اس کی تحریر دیوانے کی بڑ سے زیادہ
وقعت نہیں رکھتی، برخلاف اس کے اگر کوئی تحریر مسلسل ہو
اس کے نتائج صحیح اور اس کا طریق استدلال درست ہو تو کوئی وجہ
نہیں کہ اس تحریر کو معقول تحریر نہ کہا جائے، اس منزل سے آگے
بڑھو تو زبان اور زورِ بیان کا درجہ آتا ہے، غرض جو انشاپرداز تسلسل
استدلال، زبان اور زور بیان وغیرہ کا باقاعدہ خیال رکھتا ہے تو
اس کے مضامین کی شان اور بھی دوبالا ہو جاتی ہے۔

وسیع مطالعہ دماغ میں نئے خیالات اور ان میں تسلسل پیدا کرنے
کے لئے ضروری ہے کہ مطالعہ کو زیادہ سے زیادہ وسعت دی جائے،
لیکن ہمارے نام نہاد انشاپرداز عام طور پر مطالعہ سے جی چراتے
ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین واقفیتِ عامہ میں اضافہ
کرتے، نہ خیالات کی گتھیاں سلجھا کر روحانی لذتیں حاصل کرنے کا

سامان بہم پہنچاتے ہیں، محدود مطالعہ کی وجہ سے ان کے خیالات پست اور تاثرات عامیانہ صورت اختیار کر لیتے ہیں، انشاپرداز کے لئے بالغ نظر اور نکتہ رس ہونا بھی نہایت ضروری ہے اور یہ خصوصیات محض وسیع مطالعہ ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔

رُوحانی اور استفادی نقطۂ نظر

آج کل "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا" بہت بڑا کمال سمجھا جاتا ہے، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ فن انشاپردازی کا یہ بھی ایک دلچسپ شعبہ ہے، اور اس کے مطالعہ سے ایک قسم کی رُوحانی مسرّت ضرور حاصل ہوتی ہے، لیکن ایسا لٹریچر محض دفع الوقتی اور اوقات گزاری کا کام دیتا ہے اور کوئی شخص اس سے حقیقی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، بعض انشاپردازوں کا خیال ہے کہ صحیح معنوں میں "ادب" اسی تحریر کو کہا جاسکتا ہے جس سے محض روحانی لطف حاصل ہوتا ہے، اور بعض کا خیال ہے ایسی انشاپردازی قطعی لاحاصل ہے، جس میں لفاظی ہی لفاظی ہو یا جو کچھ بیان کیا جائے اُس کا ہماری عملی دُنیا سے کوئی تعلق نہ ہو مضامین وہی اچھّے کہلائے جاسکتے ہیں جن کو پڑھ کر کوئی مفید مطلب اور نئی بات حاصل ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ادبیت کا رنگ اور لطف بھی دست و گریبان رہے، ہمارے ملک میں اس وقت ایسے انشاپرداز کافی سے زیادہ موجود ہیں جو محض دلچسپ ادبی مضامین لکھنے میں کمال رکھتے ہیں، یقیناً وہ اپنی مخصوص انشاپردازی

کی بدولت قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ ان کی تحریریں ادب کی کوئی حقیقی خدمت انجام نہیں دیتیں، اس صنف ادب میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ کسی مضمون کو ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد دوبارہ پڑھنے میں کوئی خاص لطف نہیں آتا۔ برخلاف اس کے وہ مضامین جو وسیع مطالعہ اور گہری تحقیقات کا نتیجہ ہوتے ہیں ان کی دلچسپی ہمیشہ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

ضروری نکات | جب کوئی انشا پرداز مضمون لکھنے کے لئے بیٹھتا ہے تو وہ یقیناً خالی الذہن نہیں ہوتا، مضمون شروع کرنے سے پہلے کچھ نہ کچھ خیالات اُس کے دل و دماغ پر ضرور محیط ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں مضمون لکھنے سے پہلے ان خیالات کے متعلق کچھ مختصر حوالہ جات لکھ کر سامنے رکھ لئے جاتے ہیں، بعض محتاط انشاپرداز اکثر اوقات ان نکات کو ایک خاص ترتیب بھی دے لیتے ہیں، اس مشکل مرحلے کو طے کرنے کے بعد وہ ہر نکتہ کو اپنی مخصوص زبان اور خاص انداز بیان میں قلم کی وساطت سے کاغذ کے سپرد کرتے چلے جاتے ہیں، انشا پردازی کے نو آموز اگر اس طریق کار کو کام میں لائیں تو ان کو مضمون نگاری میں بہت آسانیاں حاصل ہو سکتی ہیں۔

ابتدائے مشق میں اس قسم کی تدابیر پر عمل پیرا ہونا نہایت ضروری ہے لیکن مشق پختہ ہونے پر یہ مشکلیں خود بخود آسان

ہو جاتی ہیں۔ ذرا سا دماغ پر دباؤ ڈالنے کی دیر ہوتی ہے کہ خیالات دست بستہ سامنے حاضر ہو جاتے ہیں اور بغیر کسی خاص کوشش کے خود بخود مسلسل قلمبند ہوتے چلے جاتے ہیں، پھر بھی ہر انشا پرداز کو لازم ہے کہ اپنے خیالات کے لشکر کو منظم رکھنے اور باترتیب جنبش دینے کے لئے بدنظمی اور انحراف کا موقع نہ دے جس طرف بڑھے اُس طرف کا نقشہ پہلے سے نظروں کے سامنے ہو، تاکہ عین وقت پر کسی پہلو پر غور کرنے میں وقت ضائع نہ ہونے پائے، اور یہ خرابی بھی واقع نہ ہو کہ جس ارادے سے خیالات کا لشکر ترتیب دیا گیا تھا، وہ تجاویز اور تدابیر کی افراتفری میں منتشر ہو جائے اور غیر منظم لشکر کی ریل پیل میں خود کہیں کا کہیں جا پڑے، ظاہر ہے کہ یہ کامیابی اُسی صورت میں ہو سکتی ہے جب ایک باکمال سپہ سالار کی طرح میدان اور فوج کا پُورا نقشہ اس کے ذہن میں پہلے سے محفوظ ہو، اور وہ سکونِ قلب کے ساتھ دائیں بائیں سے خبردار باقاعدہ پیش قدمی کرتا چلا جائے۔

تمہید و اختتام اس ضروری بات سے ہر مضمون نگار واقف ہے کہ کسی مضمون کے آغاز اور اختتام میں بہت فرق ہوتا ہے، یعنی جو پیراگراف کسی مضمون کے شروع میں تمہید کا کام دے سکتا ہے آخری اور اختتامی پیراگراف کا مطلب ادا نہیں کر سکتا، اسی طرح خاتمے کا پیراگراف بھی تمہیدی پیراگراف کا بدل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

عام طور پر تمہید میں مضمون کی عمومی کیفیت سے بحث کی جاتی ہے، بیچ کے حصّوں میں اس کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں، اور اسی طرح بڑھتے چلے جاتے ہیں، اختتام پر کبھی مضمون کو کسی خاص انجام کی طرف ڈھال کر نصیحت آمیز پُر زور فقروں پر ختم کر دیتے ہیں، بعض اوقات آخری پیراگراف میں نہایت مختصر جامع اور زوردار الفاظ میں مضمون کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے مضمون تمام کرتے ہیں، آج کل یہی طریقہ مطبوع اور مرغوب ہے، کیونکہ اسی طرح مضمون ختم کرنے سے مضمون کا سارا خاکہ دوبارہ ذہن میں پھر جاتا ہے، اور اس کا خاطر خواہ اثر باقی رہتا ہے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ مضمون کو ختم کرنے میں اتنی دقتیں پیدا نہیں ہوتیں جتنی کسی مضمون کی تمہید میں پیش آتی ہیں، بعض اوقات کتنی کتنی گھنٹے اس فکر میں ضائع ہو جاتے ہیں کہ مضمون کس طریقے سے شروع کیا جائے، یہ مشکل عام طور پر ایسے انشا پردازوں کو زیادہ پریشان کرتی ہے، جن کے پاس خیالات اور ضروری مواد کا ذخیرہ کم ہوتا ہے، اس دقت کا بہترین حل یہ ہے کہ زیر بحث موضوع کے متعلق کچھ نوٹ لکھ لئے جائیں، پھر ان کو ایک خاص ترتیب سے پھیلا کر اپنے الفاظ میں ان پر بے تکلف بحث کی جائے، اور آخر میں ان سب کو سمیٹتے ہوئے مضمون ختم کر دیا جائے۔

بعض نوآموز مضمون نگار اپنے موضوع کی تمہید اس قدر لمبی چوڑی لکھ جاتے ہیں کہ اصل مضمون کا اس سے کوئی معقول تعلّق باقی نہیں رہتا، پختہ مشق انشا پرداز نہایت شاندار انداز سے اپنے مضمون کو اُٹھاتے ہیں اور اختتام پر اپنی طبیعت اور قابلیّت کا پُورا زور صرف کرتے ہیں، آج کل اکثر انشا پرداز مضمون کو بلاتکلّف شروع کر دیتے ہیں، گویا تمہید پر زیادہ وقت ضائع نہیں کرتے، اس طریقے پر عمل کرنے سے وقت ضرور بچتا ہے، لیکن مضمون میں وہ لطف اور زور پیدا نہیں ہوتا جو عمدہ اور پُر زور تمہید سے مخصوص ہے، میرا خیال ہے کہ مضمون نگاری میں تمہید کو بہت کچھ اہمیّت دینی چاہیئے، اگر اس اہم فرض پر تھوڑا سا وقت بھی ضائع ہو جائے، تو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے، عام طور پر اچھی تمہید مضمون کی اہمیّت کو چاند لگا دیتی ہے، اور اس کے اثر سے پڑھنے والا کسی نہ کسی حد تک ضرور مرعوب ہو جاتا ہے، جو لوگ انسانی جذبات اور دماغی کیفیات سے واقف ہیں وہ اچھّی طرح جانتے ہیں کہ پہلا اور آخری اثر زندگی کے ہر شعبے میں بڑی اہمیّت رکھتا ہے، بعینہٖ یہی کیفیّت مضامین کی ہے، اگر ان کی ابتدا اور انتہا اچھی ہو تو پڑھنے والے کا دل ان سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔

طویل مضامین | اکثر انشا پردازوں کو طویل مضمون لکھنے کا بہت شوق

ہوتا ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ طویل مضمون لکھنا قابلیت کی دلیل ہے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انشا پرداز طویل مضامین میں دلچسپی اور زورِ بیان کو بھی قائم رکھ سکتا ہے یا نہیں، اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو بیجا طوالت مضمون کو بدمزہ اور پھیکا بنا دے گی، مضمون نگار کی خوبی یہ ہے کہ اس کا طرزِ بیان اور اندازِ بحث غیر دلچسپ موضوع کو بھی دلچسپ بنا دے، اور اس کے ساتھ ساتھ صداقت اور حقیقت نمائی کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

طویل مضامین لکھنے کے شوق میں ہمارے اکثر انشا پرداز بے معنی اور غیر متعلق مسائل کو بھی معرضِ بحث میں لے آتے ہیں، اس طریق کار سے مضمون کی اہمیّت ہی کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ ان کے فنِّ انشا پردازی پر بھی حرف آتا ہے، ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایک اچھا اور مطلب خیز مضمون چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو ایک طویل مگر بے معنی مضمون سے یقیناً بہتر ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو سکے انشا پرداز کو غیر ضروری طوالت سے گریز کرنا چاہیئے۔

امتحانات میں طلبہ سے مضمون لکھوا کر اس بات کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ امیدوار معینہ وقت میں دلنشین انداز اور فصیح زبان میں اپنے خیالات اظہار کر سکتا ہے یا نہیں، نیز اس کی وسعتِ مطالعہ بلندیٔ خیالات، قدرتِ بیان، ذخیرۂ الفاظ اور معلوماتِ عامہ وغیرہ

کس پائے کی ہیں۔ اگر کسی امیدوار کا مضمون اس معیار پر پورا نہیں اُترتا تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ فنِ انشاپردازی سے نابلد ہے۔ ہمارے اکثر طلبہ اپنی خامیوں کو طوالت کے پردے سے ڈھانکنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کا مضمون جس قدر زیادہ پھیلتا جاتا ہے۔ اسی قدر نقصانات کے امکانات بڑھتے جاتے ہیں۔

پیراگراف اور عنوان تسلسل اور ترتیب کے بعد لازم آتا ہے کہ ہر مبحث اور خیال کو الگ الگ پیراگراف میں لکھا جائے۔ تاکہ زیرِ بحث موضوع کے مختلف پہلو ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ رہیں۔ اگر یہ احتیاط نہ برتی جائے تو پورا مضمون ایک مسلسل تحریر بن جاتی ہے جس کو دیکھتے ہی پڑھنے والا اُکتا جاتا ہے۔ پیراگراف مرتب کرنے سے ایک طرف مضمون کے مختلف پہلو نمایاں رہتے ہیں۔ اور دوسری جانب ظاہری جاذبیت بڑھ جاتی ہے۔ پیراگرافوں کا تسلسل خیالات کو ریلتا اور دھکیلتا انشاپرداز کے مقصدِ اصلی کی طرف لے جاتا ہے۔ اِس ترتیب سے نہ صرف موضوع کی خشکی اور بدمزگی دور ہوتی ہے۔ بلکہ پڑھنے والا خیال کی رَو میں بغیر اُکتائے بہتا چلا جاتا ہے۔ اور آخرکار اس منزل پر پہنچ کر دم لیتا ہے جہاں انشاپرداز اسے پہنچانا چاہتا ہے۔

اگر ہر پیراگراف کا کوئی دلچسپ اور جاذب عنوان بھی قائم کردیا جائے۔ تو مضمون کی دلچسپی میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوسکتا ہے۔

عنوانات قائم کرنے کا طریقہ اخشک اور طویل مضامین میں بہت کافی دلچسپی پیدا کر سکتا ہے، عنوان قائم کرنا بڑا مشکل کام ہے، اس کے لئے خاص تجربے اور ذہانت کی ضرورت ہے، ویسے عنوان تو ہر شخص قائم کر سکتا ہے۔ لیکن ان کی خوبی یہ ہونی چاہیئے کہ عنوان پر نظر پڑتے ہی ان کی بحث کو پڑھنے کا شوق دل میں گُدگُدیاں لینے لگے۔ اور انسان ان سطور کو پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔

امتحانی مضامین میں عنوان قائم کرنے سے بہت فائدے پہنچ سکتے ہیں مثلاً ممتحن کو عنوان دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے تحت میں کس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور ہونہار انشا پرداز کے خیالات کس قدر وسیع اور وقیع ہیں۔ جاذب اور دلچسپ عنوانات مضمون کے متعلق عمدہ رائے قائم کر دیتے ہیں، اور زیادہ مارکس دینے کی پُر زور سفارش کرتے ہیں۔

زبان کی شان جس طرح مختلف قابلیّت کے لوگوں سے بات چیت کرتے وقت ان کی قابلیّت اور علمیّت کو مدّنظر رکھ کر گفتگو کی جاتی ہے، اسی طرح انشا پردازی کا کمال بھی یہی ہے کہ ہر موضوع کی اہمیّت کے مطابق زبان استعمال کی جائے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے، کہ ہمارا مضمون کس قابلیّت کے لوگوں سے تعلق رکھتا ہے، بعض اوقات عبارت کو شاندار اور زور دار بنانے کے لئے پُرشکوہ الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور کبھی نہایت نرم اور نازک

الفاظ استعمال کر کے مقصد حاصل کیا جاتا ہے، برخلاف اس کے اگر ہر موضوع اور ہر بحث کے لئے ایک جیسی زبان سے کام لیا جائے تو خاطر خواہ اثر پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے انشا پرداز کو لازم ہے۔ ہے کہ وہ اپنے موضوع کی اہمیت کے مطابق الفاظ صرف کرے، اس سے نہ صرف مضمون کی دلچسپی اور شان بڑھتی ہے بلکہ انشا پرداز کے زورِ قلم کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

نکتہ چینی میں احتیاط ہر انشا پرداز کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ کسی حال میں بھی بازاری اور سوقیانہ الفاظ اور محاورات استعمال نہ کرے، تاکہ اس کے مضمون میں ابتذال پیدا نہ ہونے پائے۔ نکتہ چینی کرتے ہوئے بعض انشا پرداز بڑی ہی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہیں، اس قسم کی عادات ادب کے سراسر خلاف ہیں۔ ان سے محض اخلاقی معیار ہی پست نہیں ہوتا بلکہ مضمون کی تنقیدی حیثیت بھی متعصبانہ ہو جاتی ہے۔ تنقیدی مضامین لکھتے وقت انشا پرداز کو اپنی طبیعت اور قلم پر قادر ہونا چاہیئے تاکہ پڑھنے والے کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ یہ مضمون کسی خاص جذبے کے ماتحت لکھا گیا ہے۔ ایسے مضامین میں زبان بھی نہایت نرم اور ملائم ہونی چاہیئے۔ تاکہ نقاد پر جانب داری کا الزام عائد نہ ہو۔

قابلیت کا اظہار اکثر انشا پردازوں کو عادت ہوتی ہے کہ وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر عربی فارسی کے مشکل الفاظ اپنی تحریروں میں صرف کرتے

ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ اس طرز تحریر سے ان کی قابلیت ٹپکتی ہے، یاد رہے غیر مانوس الفاظ چاہے وہ سنسکرت یا ہندی کے ہوں یا عربی فارسی کے، مضمون کی ادبی حیثیت کو گھٹا دیتے ہیں۔ پڑھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی سخت یا ناگوار چیز بار بار کام و دہن میں اٹکتی اور ادبی لطف کو بدمزہ کر دیتی ہے، انشاپرداز کی تعریف اور قابلیت یہ ہے کہ وہ ادق سے ادق مضمون کو بھی ایسی سلیس اور صاف زبان میں لکھے جس سے پڑھنے والا یہ سمجھے کہ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے وہ اس کے اپنے دل کی آواز ہے۔ گویا روانی کا یہ عالم ہو کہ کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہ آئے تاکہ طبیعت بدمزہ ہو کر دلچسپی کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ انشاپرداز کو صحیح اور سلیس مفرد و مرکب فقرے بنانے میں بھی کافی دستگاہ ہونی چاہئے، پیچیدہ اور غیر مانوس فقرے عام طور پر طبیعت پر بار گزرتے اور عبارت کے لطف اور روانی کو خراب کر دیتے ہیں۔ اس کمال کے حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انشاپرداز اپنے مطالعہ کو وسعت دے اور الفاظ و محاورات کے ذخیرے میں اضافہ کرنے کی کوشش ہمیشہ جاری رکھے۔

ضرب الامثال اور اشعار

بعض انشاپرداز ہر موقع پر کوئی نہ کوئی ضرب المثل، شعر یا مصرعہ ضرور چسپاں کر دیتے ہیں، اور اس کو ذہنی قابلیت اور حاضر دماغی کی نشانی سمجھتے ہیں، یہ طرز انشاپردازی

قدیم زمانے میں بہت مطبوع و مرغوب تھا اور یہ وہی قدیم اثر ہے جو اب تک چلا آتا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اچھے شعر واقعی اچھے ہیں اور موقع کی ضرب المثلیں یقیناً بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ہر دو چار فقروں کے بعد ایک شعر یا کسی ضرب المثل کو چسپاں کرنا نہ تحریر میں اچھا لگتا ہے نہ تقریر میں، یہ طرز بہت دقیانوسی ہوگئی ہے، اب اسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ اس لئے اشعار اور ضرب الامثال کو بہت کم مواقع پر صرف کرنا چاہئے، وہ زمانہ گیا جب ہر بات کی سند کسی محاورے یا مشہور شعر سے طلب کی جاتی تھی۔ ہاں اختلافی امور میں یہ طریقہ اب بھی مستحسن خیال کیا جاتا ہے۔ ہر بات پر شعر پڑھنے یا محاورہ بولنے سے یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو بہت سے برمحل اشعار اور ضرب الامثال وغیرہ یاد ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی کسی قدر اوچھے پن کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ جو موجودہ دور میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ ہاں کبھی کبھی اور کہیں کہیں کسی عمدہ شعر کو برمحل پڑھنا یا لکھنا گفتگو اور تحریر کے لطف کو ضرور دوبالا کر دیتا ہے۔

تاریخی واقعات اور کہانیاں

بعض نو آموز انشا پرداز اپنے مضامین میں تاریخی واقعات کثرت سے نقل کرتے ہیں یا اکثر مواقع پر کوئی اچھی سی کہانی بیان کر دیتے ہیں، میرے نزدیک انشا پردازی میں یہ طریقہ بھی محمود نہیں، اس طرح

مضمون غیر معمولی طور پر طویل اور بعض اوقات دلچسپ بھی بن جاتا ہے۔ لیکن یہ اسلوبِ بیان باعتبارِ فن نامرغوب ہے۔ انشاپرداز کا فرضِ اصلی یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع کے حقیقی مطالب سے بحث کرے، اور جا و بیجا تاریخی واقعات اور حوالہ جات کو بیچ میں نہ آنے دے۔ تاریخ دانی واقعی بڑی مفید ہے۔ مگر انشاپردازی کا کمال اس بات کا متقاضی ہے کہ انشاپرداز اس کی روشنی سے اپنے مطالب کو جگمگائے۔ ہاں اگر کوئی خاص واقعہ مضمون کی غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہوسکتا ہے تو اس کے بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اگر امتحانات میں کوئی امیدوار کسی موضوع پر آسانی سے سیرحاصل بحث نہ کرسکے۔ نیز غور و فکر وغیرہ کے لئے بہت کم وقت ہو، تو صفحات کالے کرنے کے لئے تاریخی واقعات اور دلچسپ قصّے کہانیوں سے مناسب امداد لے کر وہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی کسی نہ کسی حد تک پردہ پوشی ضرور کرسکتا ہے۔

یہاں اس بات کو بیان کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مضامین میں جب کبھی حوالجات اور واقعات بیان کرنے کی نوبت آئے تو انشاپرداز کو اپنے ملک کی مثالیں پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس سے کئی ایک فائدے متصوّر ہیں۔ اوّل یہ کہ ہر شخص اپنے ملکی معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ دوسرے

غیر ملکی عظمت کے کارنامے ہمارے ملک کے وقار کو ٹھیس نہیں لگاتے۔ تیسرے اپنے ملک کی خوبیوں کی شہرت اور کمزوریوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات کچھ دل کو بھی نہیں لگتی کہ اپنی اچھی یا بری باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے اور پرائے ملکوں کی خوبیوں اور برائیوں سے بحث کی جائے۔ ممکن ہے اس تجویز پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہو کہ ہمارا لٹریچر بہت محدود ہے، بے شک ہمارا لٹریچر محدود سہی، لیکن جس قدر بھی ہے اگر اس پر عبور حاصل کر لیا جائے تو بہترین اقوال و اسناد مہیا ہو سکتے ہیں۔

ناصحانہ طرزِ تحریر فطرت انسانی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ عام طور پر نصیحت قبول نہیں کرتی، اکثر اوقات پند و نصیحت کا الٹا اثر پڑتا ہے، انسان کی طبیعت کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد ماہرین ادب نے فیصلہ کیا ہے کہ انشا پرداز کو ناصحانہ انداز اختیار نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ ادب روحانی تسکین بخشتا ہے اور نصیحتیں طبعیت کو منغّض کر دیتی ہیں، بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں ایک سے ایک زیادہ عقلمند اور تجربہ کار موجود ہے، لہٰذا ہر کس و ناکس کا نصیحتیں کرنا زیب نہیں دیتا، درحقیقت ناصح بننا بہت ہی سن رسیدہ تجربہ کار اور عقلمند آدمی کو بھلا لگتا ہے، ہمارے ادیبوں میں ناصحانہ

طرزِ تحریر بہت ہی زیادہ مقبول ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بچپن میں جو انشا پردازی کے نمونے یا مضامین ہمارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں ان کا انداز ہمیشہ ناصحانہ ہوتا ہے، جس وقت انشا پردازی کے جوہر چمکانے کا وقت آتا ہے ہمارے معلمین اپنی ہدایات سے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے، حقیقتاً وہ اپنی ناصحانہ افتادِ طبع سے مجبور ہوتے ہیں، اس لئے یہ اثر آخر عمر تک ہمارے ہونہار انشا پردازوں کی تحریروں میں ہمیشہ جھلکیاں دکھاتا رہتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ پند و نصیحت کی تلخیوں سے اپنے مضمون کو آلودہ اور قارئین کی طبیعت کو مکدّر نہ کیا جائے، ادب کا حقیقی منشا یہ ہے کہ وہ زندگی کی تلخیوں کو بھلا کر ہمیں ایسے خوشگوار ماحول میں پہنچا دے جہاں ہم روحانی لذّتوں اور جمالیاتی کیفیتوں سے سرمست ہو جائیں۔

صفائی | انشا پردازی میں صفائی کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے، گویا انشا پرداز کے لئے صفائی کی اسی قدر ضرورت ہے، جس قدر عشقِ صادق میں صفائے باطن کی؛ عمدہ اور صاف کاغذ، اچھا قلم اور دوات، ستھرا ماحول، پاک زبان، پاکیزہ خیالات، خوشنما خط اور صفائیِ قلب انشا پردازی کی عام اور ناگزیر ضرورتیں ہیں، جن کی نگہداری اور فراہمی ہر معقول انشا پرداز کا اوّلین

فرض ہے۔

"ملک الشعرا مرزا رفیع سودا شاہ عالم بادشاہ کے اُستاد تھے۔ ایک دن بادشاہ نے کسی غزل کے لئے تقاضا کیا کہ ابھی تک اصلاح نہیں ہوئی، مرزا صاحب نے عُذر کیا، بادشاہ نے فرمایا، ارے بھئی مرزا تم کتنی غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟ مرزا صاحب نے کہا، پیر و مرشد جب طبیعت حاضر ہوتی ہے تو بھی دو چار شعر کہہ لیتا ہوں، بادشاہ نے فرمایا، بھئی ہم تو پاخانہ میں بیٹھے بیٹھے دو چار غزلیں کہہ ڈالتے ہیں، اس پر مرزا صاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ حضور پھر ان میں سے بُو بھی ویسی ہی آتی ہے"

ممکن ہے بعض انشا پردازوں کے لئے انشا پردازی کے یہ سامان غیر ضروری ہوں، لیکن تجربہ سے ثابت ہے کہ اچھے ماحول اور عمدہ سامان کا طبیعت پر کچھ ایسا ہی اثر پڑتا ہے، میرا تجربہ ہے کہ یہ سامان انشا پرداز کے لئے یکسوئی اور اطمینان قلب مہیّا کرنے میں اندازے سے زیادہ مددگار ثابت ہوتا ہے۔

آخری مگر ضروری بات مضمون لکھنے کے بعد اس کو دوبارہ دیکھنا بیحد ضروری ہے۔ میرے نزدیک نظرِ ثانی انشا پرداز کا ایمان ہونا چاہیئے، نظرِ ثانی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر مضمون میں کوئی غلطی یا

سُقم باقی رہ جائے تو وہ نظرثانی میں درست ہو جاتا ہے، اکثر دیکھنے میں آیا ہے خیالات کی رو میں بعض غیر ضروری باتیں بیچ میں آجاتی ہیں یا کوئی ضروری نکتہ چھُوٹ جاتا ہے بعض اوقات کوئی خاص لفظ یا فقرہ یا زبان پر چڑھا ہوا مخصوص محاورہ یا جملہ بار بار استعمال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض مطالب بھی مکرّر آجاتے ہیں نظرثانی اس قسم کی تمام غلطیوں کی تلافی کرنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے، ایسے مضامین جو نظرثانی سے محروم رہ جاتے ہیں ان میں اس قسم کی بہت سی خرابیاں باقی رہ جاتی ہیں، اور مضمون نگار کی قدر اور اہمیّت کو نقصان پہنچاتی ہیں۔

نظرثانی سے مضمون کی تصحیح ہوتی ہے، موضوع کے متعلق بہت سی نئی نئی باتیں اور اچھوتے پہلو سامنے آتے ہیں، اگر انشاپرداز دوبارہ لکھنے کی زحمت گوارا کرے تو مضمون میں اور بھی چار چاند لگ جاتے ہیں، تو مشقی کے زمانے میں اگر کوئی اچھا اُستاد نہ ملے تو اپنے مضمون کی اصلاح کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے لکھ کر رکھ دیا جائے، جب وہ مضمون دماغ سے بالکل اُتر جائے تو اس پر نظرثانی کرلی جائے، ایسا کرنے سے اپنے مضمون کے محاسن اور کمزوریاں خود بخود نظر آنے لگتی ہیں، اور بہت سی خامیوں کی اصلاح انسان خود ہی کرلیتا ہے، یہ طریقۂ اصلاح اگرچہ دیر طلب ہے، لیکن نہایت مفید ہے، اچھے اچھے انشاپرداز ہمیشہ یہی کرتے آتے ہیں

اگر آپ کو گزشتہ صدی کے کسی ادیب کا قلمی مسودہ دیکھنے کا اتفاق ہو تو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کس طرح اپنی تحریروں میں بار بار کانٹ چھانٹ کرتے رہے ہیں۔

انشا پردازی میں ترقی کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نظرِ ثانی اور تصحیح کے کام پر کافی سے زیادہ وقت صرف کیا جائے، تاکہ زیادہ سے زیادہ سُقم دُور ہو جائیں، اور انشا پرداز کی جانکاہی عرق ریزی، قابلیّت اور فنِ انشا پردازی کا سکّہ پڑھنے والوں کے دلوں پر مستقل طور پر ثبت ہو جائے۔

"قومی زبان"

قومی زبان کی ضرورت اور اہمیت

جب سے ہندستان میں سیاسی بیداری اور قومی احساس پیدا ہوا ہے۔ عوام میں اس بات کا بہت چرچا ہے کہ ہمارے مُلک میں کسی دیسی زبان کو اس قدر ترقی دینی چاہیئے کہ وہ ہر صوبے میں بولی اور سمجھی جا سکے۔ موجودہ طرزِ تعلیم اور حکومت نے یہ فخر انگریزی زبان کو بخشا ہے جو غیر مُلکی زبان ہے، قوم پرست طبقہ انگریزی زبان کا ملکی زبان بن جانا ہندستانیوں کے ملکی وقار کے منافی سمجھتا ہے۔

ہمارے سیاست دانوں اور ملک کے بہی خواہوں کا خیال ہے کہ ہندستانیوں کے بہت سے داخلی اور سیاسی مسائل قومی زبان کا سکّہ چلنے سے خود بخود حل ہو جائیں گے، اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی یگانگت میں تہذیب و تمدّن کی ترقی کا راز مضمر ہے، پھر جس مُلک میں اَن گنت قوموں کے لوگ آباد ہوں وہاں قومی اتحاد و اتّفاق اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ مختلف اقوام میں ایک زبان تبادلہ خیالات کا ذریعہ نہ بنے۔ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے، کہ وہ ہندستانی اقوام جو ہم مذہبی کے لحاظ سے ایک دوسرے کی

ہمدرد اور ہم خیال ہونی چاہیئے نہیں زبان کے اختلاف کی بدولت عام طور پر ایک دوسرے کی مخالف ہیں، نیز صوبائی تعصب اور لسانی اختلاف نے ان کے درمیان نااتفاقی اور اختلاف کی خلیج اور بھی زیادہ وسیع کر دی ہے۔

ہندستان کے ہر صوبے میں مختلف زبانیں رائج ہونے سے جو نقصان ہماری تہذیب اور تمدن کو پہنچا وہی صنعت وحرفت اور تجارت کی ترقی میں بھی سنگ گراں ثابت ہوا، زبان کے اختلاف سے ملکی تجارت نے ہمیشہ نقصان اٹھایا، یاد رہے جب تک ہندوستان میں ایک قومی زبان رائج نہ ہوگی بحیثیت مجموعی تجارت کو کبھی فروغ حاصل نہیں ہو سکتا، تجارتی ایجنٹ اور صنعت وحرفت کی بڑی بڑی کمپنیاں ہر صوبے کی زبان سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے اپنے کاروبار کو فروغ دینے کی کوشش میں اکثر ناکامیاب ہوتی ہیں، اگر کسی صوبے میں علمی ادبی یا سائنٹفک تحقیقات کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو مشترکہ زبان نہ ہونے سے جن دقتوں کا سامنا ہوتا ہے اُس سے ہر تعلیم یافتہ شخص کسی نہ کسی حد تک ضرور واقف ہے، نیز ملکی زبان کا فقدان حکومت کے لئے گوناگوں دقتوں کا موجب ہے، ہم لوگوں کی بے پروائی سے ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے حاکم قوم کی زبان نے ملکی زبان کی صورت اختیار کر لی، ورنہ اگر کوئی ایک دیسی زبان ہندوستان میں رائج ہوتی تو انگریزی اس کی جگہ ہرگز

نہ لے سکتی۔ اب حُبّ وطنی کے جوش اور وطن پرستی کے خدوش نے اس مفید اور اہم مسئلے کی طرف عوام کو متوجہ کیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے ہندستان کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

قومی زبان کا انتخاب | عوام کی جمہوریت پسندی اور جمہوری طرز حکومت نے ہم لوگوں کو انتخاب لڑنا سکھا دیا ہے، جب کسی چیز کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو عجب لطف آتا ہے، سرزمین انتخاب میدانِ حشر کا نمونہ بن جاتی ہے، جس وقت قومی زبان کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا تو انتخاب کی جنگ میں بے شمار زبانیں کمربستہ اُتر آئیں، قومی زبان پر مدّتوں تحریری اور تقریری جنگیں ہوتی رہیں بلکہ بعض مقامات پر تحریر و تقریر سے گزر کر ہاتھا پائی تک نوبت پہنچی۔

ہندستان ایک طویل و عریض ملک ہے۔ اس میں مختلف قومیں اور متعدد نسلیں آباد ہیں، خطّے خطّے کی آب و ہوا جُدا ہے، آب و ہوا، قومیّت، نسل اور مذہب کی تفریق سے یہاں زبانیں بھی مختلف بولی جاتی ہیں، گزشتہ صدیوں کے اعداد و شمار کے مطابق کسی زمانے میں یہاں دو سَو سے اُوپر زبانیں موجود تھیں اور اب بھی درجن بھر سے کم نہیں، ان حالات میں یہ کوشش کرنا کہ سارے مُلک میں ایک زبان بولی جائے بڑے معرکے کا کام ہے، لیکن خوش قسمتی سے یہ مسئلہ جس قدر پیچیدہ اور اُلجھا ہوا معلوم ہوتا ہے، اس کا حل اس قدر دُشوار نہیں، اگر یُورپ کے لوگ اپنے علیحدہ علیحدہ

حکومتوں والے مُلک میں ایک بالکل نئی اور مشترکہ زبان سپرانٹو کے نام سے پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو اس کے مقابلے میں ہندستانیوں کے لئے یقیناً یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ وہ اپنی دیسی رائج الوقت زبانوں میں سے کوئی ایک ایسی زبان انتخاب کرلیں جو تمام مُلک میں بولی اور سمجھی جائے اور قومی زبان کہلائے۔

ظاہر ہے موجودہ زبانوں میں سے انتخاب کا فخر اسی زبان کو حاصل ہو سکتا ہے، جو اس وقت زیادہ سے زیادہ رقبے میں بولی اور اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس انتخاب کی جنگ میں ہر شخص اپنی زبان کی خوبیاں گنوانے اور اسے کامیاب بنانے کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہو کر آن کودا اور بہ بانگ دہل دعوے کیا کہ صرف ہماری زبان ہی میں سارے ہندستان کی زبان بننے کی صلاحیت موجود ہے، بنگالی بولے ہماری زبان کو عمومیت کی سند ملنی چاہیئے کہ ادبی جواہر ریزوں سے مالا مال ہے اور اس کی شیرینی مالا کلام ہے، مرہٹی بولنے والوں نے اپنی زبان کے دلکش گیت گا کر دوسروں کو قائل کرنا چاہا، غرض ہر دعویدار نے اپنی زبان کی وسعت اور مقبولیت کا سہارا لے کر قومی زبان ہونے کی سند مانگی، لیکن قرعۂ فال ان دو زبانوں کے نام نکلا، جن کو عوام اُردو اور ہندی کہتے ہیں، ۱۹۳۱ء کے اعداد و شمار کا جائزہ لینے سے

اندازہ ہوا کہ اُردو اور ہندی ہندستان میں بہت مقبول اور محبوب ہیں اور سب زبانوں سے زیادہ اہلِ ہند ان کے رطب اللسان ہیں، ہندستان کے گوشے گوشے میں ان کے قدردان اور واقفکار موجود ہیں، اس کے علاوہ ماہرین زبان کا یہ فتویٰ کہ ان دونوں کا تعلق انڈوایرین زبانوں کے خاندان سے ہے، ان کا حق تسلیم کرلنے میں آسمانی حکم ثابت ہوا، انصاف پسند افراد نے باقرار صالح شہادت دی، کہ ان زبانوں کے صحیح النّسب ہونے میں کلام نہیں، ان میں ابھی تک قدیمی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ بنگالی اور گجراتی بولنے والا بھی ان کو آسانی سے سمجھتا ہے، اور اگر ذرا سی ہمّت کرے تو بغیر دِقّت کے انہیں بول بھی سکتا ہے بعض نے کہا کہ یہ سراسر دھوکا ہے، ہندی اور اُردو دونوں ہندستان کی چشم و چراغ سہی لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ بہت سی زبانوں کا مجموعہ ہیں، ہم تسلیم کرتے ہیں اُردو اور ہندی دو علیحدہ علیحدہ زبانیں ہیں، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ دونوں آپس میں شیر و شکر ہیں، فرق صرف اِتنا ہے کہ ہندی اپنی قدامت پرستی کی بدولت سنسکرت کے زیر اثر رہی، اور اُردو نے اپنی فراخ دلی سے ہر زبان سے میل کھایا، اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اُردو اور ہندی بہت سی زبانوں کے ملاپ سے نہیں بنیں تو ہر شخص انہیں کیونکر سمجھ لیتا ہے، نیز ان میں ہر زبان کے الفاظ اور

محاورات آپ ہی آپ کہاں سے آکر پیوست ہو گئے ہیں۔

اس دوران میں ایک اور جماعت نے قومی زبان کے مسئلے کو یہ کہہ کر زک پہنچانے کی سعی کی کہ قومی زبان کا ہونا واقعی ضروری ہے لیکن کسی ایک زبان کو آل انڈیا زبان بنانے سے صوبائی زبانوں کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، اس بیجا خطرے سے ڈبلے ہونے والے قاضیوں کو تاریخ دانوں نے یہ جواب دے کر ٹھنڈا کیا کہ انگلستان ایک چھوٹا سا ملک ہے، اس میں متعدد حکومتیں ہیں، اور وہاں عام طور پر ویلش اور سکاٹش دو زبانیں بولی جاتی ہیں، لیکن پھر بھی انگریزی کو قومی زبان کہلانے کا فخر حاصل ہے، یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، مگر باوجود اس بنیادی اختلاف کے کسی ایک کی ترقی سے تینوں زبانوں میں سے کسی ایک زبان کو بھی نقصان نہیں پہنچا، اس لئے اگر ہندستان میں ملکی زبان کے ساتھ ساتھ صوبائی زبانیں بھی بولی جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں، اس سے نہ تو قومی زبان پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے اور نہ صوبائی زبانوں کو کسی قسم کا کوئی خطرہ ہے۔

اُردو کا مقدمہ

جب زبانوں کے انتخاب کا مسئلہ چھڑا تو اس وقت اہلِ نظر کی نگاہِ انتخاب اُردو پر پڑ رہی تھی، اور حقیقتاً یہی وہ زبان ہے جو ہندو مسلمانوں میں یکساں محبوبیت حاصل کر چکی ہے، ہندی اور اُردو میں بڑا فرق یہ ہے کہ کثیر التعداد ہندو اُردو بولتے اور لکھتے

ہیں، بر خلاف اس کے ہندی مسلمانوں میں بہت کم مقبول ہے، اُردو کی ہمہ گیری اور دلپذیری کے یُورپین محقق بھی ہمیشہ سے قائل تھے، چنانچہ انڈین فلالوجی کے مشہور مُصنّف نے آج سے نصف صدی پہلے اُردو کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ "اُردو ایک وسیع اور فصیح، معنی خیز اور جامع زبان ہے، نہایت ترقّی کرنے والی معلوم ہوتی ہے، اور یہ شائستہ صُورت اس زبان کی ہے جو سارے ہندستان میں رائج ہے۔"

مشہور مستشرق گارسن دی تاسی نے لکھا ہے کہ "اُردو ہندستان میں اسی طرح بکثرت مستعمل ہے، جس طرح یُورپ میں فرنچ" جارج کیمبل کا خیال تھا کہ اُردو تمام ہندستان کی زبان بنانے کے قابل ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں اس طرح جذب کر لیتی ہے کہ اس کی اپنی زبان کے لفظ معلوم ہوتے ہیں۔"

ہسٹری آف انڈیا کے مُصنّف ونسنٹ سمتھ لکھتے ہیں کہ "ہندستان کی زبانوں میں اُردو ہی اس قابل ہے کہ اس میں تمام مطالب آسانی سے ادا ہو سکتے ہیں۔"

یہ الفاظ ان مشہور و معروف مصنّفوں کی زبان سے اس وقت نکلے ہیں جب ہندستان نے قومی زبان کا خواب بھی نہ دیکھا تھا، اس لئے ان لوگوں کی باصواب رائے پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں ہو سکتی۔

غرض اُردو ہی وہ زبان ہے جو ہندوستان اور غیر ممالک میں تقریباً ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، ہر صوبائی زبان کے محاورات اور الفاظ اس میں ایسی خوبصورتی سے پیوست ہیں کہ اس کا بولنا اور سمجھنا اور بھی زیادہ آسان ہوگیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شروع سے اس زبان کے ساتھ بڑی بڑی تمنّائیں وابستہ تھیں اور قوی امید تھی کہ جب ہندستانی اقوام اتحاد و اتفاق کی اہمیّت کو محسوس کریں گی تو اس زبان کو کل ہندستان کی زبان تسلیم کیا جائیگا۔ لیکن بدقسمتی سے اُردو کی جادو بیانی اور دلپذیری کچھ بھی کام نہ آئی۔ باہمی نفاق اور مذہبی تعصب نے اس کی مقبولیّت کو نذر اغدار کر کے اس سے وہ حق بھی چھین لیا جس کی وہ شروع سے بلا شرکت غیرے حقدار چلی آتی تھی، خیر اب بھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے، اگر اُردو کے حامی موجود ہیں اور ان کو اُردو سے سچّی محبّت ہے تو اس کو کسی قسم کا خطرہ نہیں۔

قومی زبان کے انتخاب میں اُردو اور ہندی کو برابر کا مرتبہ دیا گیا ہے۔ اگر تعصّب کی عینک اُتار دی جائے اور انصاف سے دونوں زبانوں کا جائزہ لیا جائے تو اُردو اور ہندی میں زمین آسمان کا فرق نکلے گا۔ جو مقبولیت اور ہمہ گیری اُردو کو حاصل ہے، ہندی کو اس کا عشر عشیر بھی میسّر نہیں، دونوں کے ادبی اور علمی تحصیلات اور ذخیرے مابہ الامتیاز ہیں، فیصلہ کیا گیا ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں ایک ہی ہیں، ان میں صرف تدریجی فرق ہے، اصل دونوں

کی ایک ہے، ہندو مسلم نااتّفاقیوں اور منافشوں کی بدولت یہ زبانیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئی ہیں۔ ہندو ہندی کو اپنی زبان کہتے ہیں، مسلمان اُردو پر اپنی ملکیّت ثابت کرتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان ہندستانی اور غیر ملکی زبانوں مثلاً عربی فارسی اور ترکی وغیرہ کے اختلاط سے پیدا ہوئی ہے اور ہندو مسلمانوں کی یگانگت اور محبّت کا زندہ ثبوت ہے، اور یہی وہ زبان ہے جس کو زمانۂ قدیم میں ہندی کہا جاتا تھا، لیکن جب انگریزوں نے دہلی کے اُردوئے معلّٰی کو اُجاڑا اور فورٹ ولیم کالج قائم کیا تو ان کی دُور بین عقل نے ہندی اُردو کے جھگڑوں کا سنگ بنیاد رکھا۔ اُردو اور ہندی کے نام سے دو شعبے جاری کئے گئے، جس کا ظاہرا مقصد اُردو اور ہندی کی قدر دانی تھا، لیکن حقیقت میں اِس نااِتّفاقی کا پیش خیمہ، جو آج اُردو ہندی کے نام سے جاری ہے، اس لبس بھرے بیج کے پھیلاؤ سے اس متحدہ قومیّت کا خاتمہ ہوا، جو کئی صدیوں میں اُردو زبان نے پیدا کی تھی، اصل میں اسی وقت سے اُردو اور ہندی دو الگ الگ زبانیں بنیں، ابتداءً ان میں صرف محض رسم الخط کا فرق تھا، دونوں فرقوں کی تنگ نظری اور تعصب پرستی نے انہیں بالکل علیحدہ علیحدہ کر دیا، مسلمانوں نے اُردو کو فارسی اور عربی کے الفاظ سے باردار کر کے عام فہم ہونے کے رُتبہ سے گرایا، اِدھر ہندوؤں نے ہندی کو سنسکرت اور ٹھیٹھ ہندی کے مشکل الفاظ

کی بھرمار سے ممیز کیا، لیکن لطف یہ ہے کہ دونوں فرقوں میں جو زبان عام طور پر بولی جاتی تھی وہ بدستور عام فہم رہی۔

قومی زبان کا نام | ان حالات میں ایک ایسے ثالث بالخیر کی ضرورت تھی، جس کا اثر اُردو ہندی کے دعویداروں پر یکساں ہو، تاکہ اس کا فیصلہ دونوں جماعتیں تسلیم کرلیں، ایسی جماعت ہمارے مُلک میں انڈین نیشنل کانگریس ہے، اس کے صدر مُلک کے بے تاج بادشاہ کہلاتے، اور ان کی ہر بات کو عوام قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، کانگریس نے دونوں جماعتوں کی اشک شوئی کی اور متفقہ طور پر قرار دیا کہ وہ زبان جو ہندستانی میں قومی زبان ہونے کا فخر حاصل کرسکتی ہے، ہندی اور اُردو کے بین بین ہونی چاہیئے، نہ وہ اُردو جو فارسی اور عربی کے الفاظ کی کثرت سے عام ہندستانیوں کے ناقابل فہم بن گئی ہے، مُلک کی زبان بن سکتی ہے اور نہ ہندی جو ٹھیٹھ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی آمیزش سے بھرپور ہے، قومی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، باہمی سمجھوتے اور قرارداد سے ان دونوں زبانوں کو ملا کر ایک ایسی زبان ترتیب دینی چاہیئے جو ہندستانی کہلائے اور ہندو مسلمانوں کی سمجھ میں بہ آسانی آئے، ظاہر ہے کانگریس کا یہ فیصلہ نہایت منصفانہ اور خوش آیند ہے، لیکن سیاسی اختلاف اور باہمی نفاق کی وجہ سے ارباب غرض اس پر طرح طرح کی نکتہ چینی کر رہے ہیں، اور جا و بیجا نقصان کے پہلو

جھکاکر عوام کو اس فیصلے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔

بعض ہندو کہتے ہیں کہ اس قومی زبان کا نام ہندستانی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کو ہندی کہنا چاہیئے، ادھر مسلمانوں کا یہ دعوےٰ بدستور قائم ہے کہ یہ زبان اُردو ہی کہلانی چاہیئے، اعتدال پسند کہتے ہیں کہ اُردو اور ہندی کو ہندستانی کہدینے سے اصل زبانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، یہ تو محض نام کا جھگڑا ہے، ہندستانی جو کچھ ہوگی وہ ظاہر ہے۔

تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے لئے ہندستانی نام کچھ نئی چیز نہیں۔ سنہ ۱۶۱۶ء تک کی کتابوں میں ہندستان کی زبان کو مصنفین نے ہندستانی کے نام سے یاد کیا ہے، انگریز اب تک اُردو کو ہندستانی کہتے ہیں، لیکن اُردو پرست طبقہ اس کو اپنی زبان کے وقار کے خلاف سمجھتا ہے، قدیم یورپین مورخوں نے اُردو کو لفظ اندوستان سے تعبیر کیا، اٹھارھویں صدی کے مصنفوں نے لاطینی زبان میں "لنگوا اندوستانیکا" لکھا، جان گلکرسٹ نے سنہ ۱۸۷ء میں اس کو محض ہندستانی کہا اور اس کے بعد سے "ہندستانی" نام غیر ملکی اقوام میں عام طور پر مقبول ہوگیا۔ شاہجہان بادشاہ نے سب سے پہلے اس زبان کو زبان اُردوئے معلّی کا لقب دیا اور یہ نام عوام میں مقبول ہوا، اختصار ہوتے ہوتے زبان اور معلّی دونوں حذف ہوگئے اور محض اُردو باقی رہ گیا، بعد کے مصنفین

نے اس کو ریختہ کہنا شروع کیا کہ ادبی زبان اور عام زبان میں امتیاز ہو سکے، نظم کے لئے ریختہ کا نام مخصوص ہو گیا۔ لیکن میر تقی اور مصحفی مرحوم نے اُردو کو ہندی ہی کہنا پسند کیا۔ غرض تواریخ سے ثابت ہے کہ ہندی اور اُردو دو الگ الگ زبانیں نہیں تھیں، محض سر پرستی اور نام کے فرق سے ایک دوسرے سے دُور جا پڑیں، مختلف اثرات اور ماحول نے ان کو ایسا لباس پہنایا کہ پہچانی تک نہیں جاتیں۔

بعض اعتراضات اور اُن کے جوابات

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ وہ زبان جس کو ہندستانی کہا جائے گا، ہندستان کی مشترکہ اور قومی زبان نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس نئی زبان کا نہ کوئی وجود ہے اور نہ اس کا کوئی خاص لٹریچر ہے، زبان بننے کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ قدرتی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے مصنوعی طریقوں سے نہیں بنتی، اس لئے مجوزہ ہندستانی زبان کے خواب کی تعبیر کچھ بھی نہ ہو گی، ان دلائل کی صحت میں واقعی شُبہ کرنے کی گنجائش نہیں۔ لیکن اگر کوئی زبان پہلے سے موجود ہو اور باہمی نفاق انگیزیوں اور افتراق پردازیوں سے اس کی دو شاخیں ہو گئی ہوں تو اس کی تجدید ناممکن نہیں، اس وقت جس زبان کو ہم قومی زبان بنا رہے ہیں، ملک میں اس کے دو سٹائل یا طرزِ تحریر مروّج ہیں، ایک طرز میں فارسی اور عربی کے الفاظ کی کثرت

ہے، دوسرے میں سنسکرت اور ہندی الفاظ کی بھرمار، اور یہ صورت اُن لوگوں کی بدولت پیدا ہوئی ہے جو تعصب اور تنگ نظری کے شکار رہے ہیں، اگر تعصب کی عینک اُتار دی جائے تو یہ دونوں زبانیں ایک ہی نظر آئیں گی، گویا اُردو اور ہندی ایک ہی ماں کی دو بیٹیاں ہیں، ایک کی سسرال ہندو گھرانوں میں ہے، دوسری مسلمانوں میں بیاہی گئی ہے، ایک پر مسلمانوں کے تمدّن کا اثر پڑا، دوسری خالص ہندو تہذیب کا نمونہ بنی۔ اگر مذہبی تعصّب بالائے طاق رکھ کر ان دونوں بہنوں کو ملنے جُلنے کی اجازت دی جائے تو ایک دفعہ پھر وہی محبّت اور یگانگت کا زمانہ آسکتا ہے۔

اس وقت ہمارے ملک میں بہت سے ایسے مصنّف موجود ہیں جو ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور ہندو مسلمان ان کی تحریریں برابر کی دلچسپی سے پڑھتے ہیں، قومی زبان کے حامیوں کا خیال ہے کہ جب مصنّفین میں یہ خیال پیدا ہو گا کہ ہماری تحریریں اور خیالات تمام ہندوستان کے لئے ہیں اور ان کا کسی خاص فرقے اور جماعت سے کوئی خاص تعلق نہیں تو وہ خود بخود عام فہم زبان استعمال کرینگے۔ ظاہر ہے یہ کام مولویوں اور پنڈتوں کا نہیں ان کا اثر و رسوخ تو ایک خاص حلقہ تک محدود ہے، اس مفید مقصد کی تبلیغ اور اشاعت اُن لوگوں پر فرض ہے جن کا واسطہ براہ راست تمام ہندستان سے ہو سکتا ہے۔

وہ زبان جس کو ہر ایک ہندستانی سمجھ اور بول نہیں سکتا تمام ہندستان کی زبان ہرگز نہیں ہو سکتی، چاہے کوئی جماعت ایسی زبان کی مقبولیت کے لئے کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے، ایسی تحریریں اور تقریریں جن میں قومی زبان استعمال نہ کی جائیگی خود بخود مقبولیت کے درجے سے گر جائیں گی، اُمید ہے اس طرح آپ ہی آپ ادیبوں اور مصنّفوں کا رُجحان ایسی عام فہم اور آسان زبان کی طرف ہو جائیگا، جس کو عوام آسانی سے سمجھ سکیں گے، وہ زبان جو کسی خاص طبقے کی زبان ہوگی وہ اسی مخصوص حلقے میں محدود رہ جائے گی، آخر کار زمانہ اُس کی اصلاح کریگا، ہوا کے رُخ کے ساتھ ایسے مصنّفین کو اپنا رُخ مجبوراً بدلنا پڑیگا، ورنہ ان کی تقریریں اور تحریریں گمنامی کے کونوں میں روپوش ہو جائیں گی۔

صُوبائی زبانوں کا مسئلہ | بعض نکتہ چینیوں کا خیال ہے کہ ہندستانی کی ترویج و ترقی سے صُوبائی زبانوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ اور ہندستانی کی مقبولیت بڑھتے بڑھتے ایک وقت ایسا آئے گا کہ صوبائی زبانوں کا بالکل خاتمہ ہو جائیگا۔ یاد رہے یہ خطرہ بھی بالکل بے بُنیاد ہے، ہندستانی سے کسی ایک زبان کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں، اس زبان کی ترویج کا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ ہندستان میں رہنے والے ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں، اور مُلکی مسائل کو وہ اچھی طرح سے سمجھ سکیں، اگر کسی

صوبے میں کوئی خاص زبان عام طور پر بولی جاتی ہے، تو بڑے شوق سے بولی جائے، اس میں تالیف و تصنیف کا سلسلہ اسی جوش و خروش سے جاری رہے، جس طرح اب ہے، مگر باوجود اس کے ان کا تعلق دوسرے صوبوں اور تمام ہندستان سے مضبوط اور مستحکم رہے، ظاہر ہے یہ نیک مقصد صرف ہندستانی زبان ہی پورا کر سکتی ہے، اس کے علاوہ اس وقت عوام میں تبادلۂ خیالات اور میل ملاپ کا ذریعہ ہمارے ملک میں انگریزی زبان بنی ہوئی ہے۔ لیکن انگریزی سے ہم لوگوں کا اتنا ہی واسطہ ہے کہ وہ حاکم قوم کی زبان ہے یا اس وقت تمام دُنیا میں سب سے زیادہ ادبی اور علمی ذخائر کی مالک، ایک خوددار اور باعزّت قوم کے لئے اس سے زیادہ شرم کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی دیسی زبانوں کو چھوڑ کر ایک غیر ملکی زبان کو اظہار خیالات کا ذریعہ بنائے اور اس کو قومی زبان کی جگہ دے، ہر خوددار ہندستانی کا فرض ہے کہ وہ رُتبہ جو اس وقت ہمارے ملک میں غیر ملکی زبان کو حاصل ہے ہندستانی زبان کو دے کر اپنے سیاسی اور ملکی وقار کو قائم رکھے۔

جنوبی ہندستان میں آج کل ہندستانی کی مخالفت محض اس بنا پر ہو رہی ہے کہ ابتدائی اور ثانوی مدارس میں ہندستانی زبان کا لازمی ہونا صوبائی زبان کو پس پُشت ڈال دے گا اور ہندستانی

زبان کی ترقی سے آہستہ آہستہ صوبائی زبان مردہ ہو جائے گی، معلوم ہونا چاہیئے کہ ہندستانی کی ترویج سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ صوبائی زبانیں مُردہ زبانیں بن جائیں یا ان کو کسی قسم کا نقصان پہنچے، ہندستانی سکیم کے ماتحت ہر صوبے میں صوبائی زبان کو وہی اہمیّت حاصل رہے گی جو پہلے تھی، ہندستانی محض دوسرے درجے کی زبان ہوگی، جس سے دوسرے صُوبوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات برقرار رہیں گے، بعض لوگ یہ خیال کر رہے ہیں کہ ہندستانی کو تمام صوبوں میں ذریعہ تعلیم قرار دے دیا جائیگا، یہ سراسر وہم ہے، ذریعہ تعلیم ہر صوبے کی اپنی زبان ہوگی۔ صوبائی زبانیں اپنے مخصوص صوبوں میں عدالتوں اور اسمبلی میں آزادانہ استعمال کی جائیں گی، ہاں جو یونیورسٹیاں آل انڈیا حیثیت کی مالک ہونگی وہاں ہندستانی کو ذریعہ تعلیم قرار دینا ضروری ہوگا، تاکہ ہر صوبے کے رہنے والے خاطر خواہ فائدہ حاصل کر سکیں۔

یہ مسلّمہ امر ہے کہ بہترین لٹریچر مادری زبان ہی میں پیدا ہو سکتا ہے، اس لئے ہندستانی کی ترویج سے صوبائی لٹریچر کو بھی کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں، گویا جن صوبوں کی مادری زبان ہندستانی ہے وہ اپنی صُوبائی زبان کی خدمات جوش و خروش سے بجا لاتے رہیں گے۔ لیکن سیاسی اور مُلکی ضرورتوں کو مدّنظر رکھ کر انہیں اپنی زبان کو ضرور کسی قدر زیادہ عام فہم بنانا پڑیگا، اس بیان سے یہ

غلط فہمی خود بخود دُور ہو جاتی ہے کہ ہندستانی محض کاروباری یا بازاری زبان ہوگی، یا کسی طریقے سے اپنی بُنیادی زبانوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکے گی، ان حالات کے پیش نظر یہ اُمید اور بھی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے کہ ایک زمانہ ضرور ایسا آئے گا جب ہندستانی اپنی مقبولیّت عامہ اور عام فہم مفید لٹریچر کی بدولت سب زبانوں کی سرتاج کہلائے گی۔

رسم الخط کا جھگڑا

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ ہندستانی زبان آسان ہندی اور سیدھی سادی اُردو ہونی چاہئے، رسم الخط کا جھگڑا پیدا ہوتا ہے، ہندو اس بات پر مصر ہیں کہ دیوناگری رسم الخط کو آل انڈیا حیثیت دینی چاہئے اور مسلمانوں کی ضد ہے کہ فارسی رسم الخط کو رواج دیا جائے۔

رسم الخط کا مسئلہ واقعی بہت پیچیدہ ہے، اور اس کی دقتّیں تقریباً ہر زبان میں تکلیف کا باعث ہیں، انگریزی رسم الخط کے خلاف بھی مدتوں سے جہاد جاری ہے اور ایک مخصوص جماعت ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتی رہی ہے کہ مرّوجہ ہجّوں پر تلفظ کے ہجّوں کو ترجیح دی جائے، گویا ہجوں میں آواز کا تتبّع کیا جائے تاکہ مقررہ ہجّوں کو زبانی یاد کرنے میں وقت ضائع نہ ہو، اُردو لکھنے والے بھی اس دِقّت کو محسوس کر رہے ہیں، لیکن آج تک کسی عالم نے اس دِقّت کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ ماننا پڑے گا کہ اُردو کی ادبی ترقّی نے اس مسئلے کو ثانوی حیثیت دیدی ہے، لیکن اگر عوام اس دِقّت کا حل

خود ہی تلاش کر لیں جیسا کہ عام طور پہ ہوا کرتا ہے تو عالم کو عامی پر اعتراض نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہیے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے بعد ٹائپ کا نہ ہونا بھی مختلف اعتراضات میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے، لیکن مدت دراز کی کوششوں سے نستعلیقی ٹائپ وجود میں آ چکا ہے جو بہت جلد قبول کی سند حاصل کر لے گا، اور اس طرح سے فارسی رسم الخط پر سے یہ اعتراض بھی دور ہو جائیگا۔

ہندی رسم الخط میں یہ خوبیاں بتائی جاتی ہیں کہ اس میں مخصوص ہجوں کی مصیبت نہیں، صرف آواز کی پیروی کی جاتی ہے۔ ہندستان کی بہت سی صوبائی زبانیں اسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں، اس کا ٹائپ بھی موجود ہے، یہ سب آسانیاں درست، لیکن اس بات کا کیا علاج ہے کہ جس قدر کم جگہ اردو لکھنے کے لئے درکار ہے، ہندی اس سے چہار چند جگہ گھیرتی ہے، اور اس کے ساتھ اردو کی تحریر پڑھنا زیادہ آسان ہے، یہ خوبیاں ایسی ہیں جس کو ہر ہندی جاننے والا تسلیم کرتا ہے، لیکن جس وقت کسی مسئلے پر تعصب کا رنگ چڑھ جائے تو دوسرے کی ہر اچھائی برائی معلوم ہوتی ہے اور اپنی چیز کی برائی بھی بھلی نظر آتی ہے، ان حالات کو دیکھتے ہوئے کانگریس نے فیصلہ کیا ہے کہ زبان کے انتخاب اور نام کا تصفیہ ہو جانے کے بعد رسم الخط کا جھگڑا فروعی رہ جاتا ہے، اس لئے اگر مسلمان فارسی رسم الخط میں لکھیں تو ہندوؤں کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے

اور اگر ہندو پسند کریں تو دیوناگری خط استعمال کریں، اس پر مسلمانوں کو نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیئے، لعض کا خیال ہے کہ ایک زبان کے دو رسم الخط قرار دینے مضحکہ خیز ہیں اس لئے بہترین حل یہ ہے کہ ہر شخص رومن رسم الخط اختیار کرے کہ وہ آسان ترین ہے، نیز ایسا کرنے سے کسی کو اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہے گی، مگر مصیبت یہ ہے کہ رومن رسم الخط بھی عیوب سے پاک نہیں، اس لئے اس کی مقبولیّت میں بھی شبہات ہیں، رومن کے حامی ترکوں کی مثال دیتے ہیں جہاں قدیمی رسم الخط کو چھوڑ کر رومن رسم الخط کو ترجیح دی گئی ہے اور اس طرح بہت سے تضاد دُور ہو گئے ہیں، رومن کے مخالفین وہاں کی سیاسی فضا اور ملکی حالات کو معرض بحث میں لاتے ہیں اور رومن کی خامیوں کو واضح کرتے ہیں، جو ایک حد تک بہت زیادہ وقیع ہیں۔

حقیقتاً رسم الخط کا جھگڑا فروعی ہے، اصل معاملہ طے ہو چکا ہے، ہمیں اس فیصلے کی عزّت اور نگہداری کرنی چاہیئے، اور ایک دفعہ پھر اس زمانے کو زندہ کرنا چاہیئے، جب اُردو زبان ہندی اور فارسی کے ملاپ سے وجود میں آ رہی تھی، اس وقت فرق صرف اتنا ہے کہ اب اُردو اور ہندی کی ترتیب اور تہذیب سے ایک ایسی زبان لباس ہستی پہنے گی جو ہندستانی کہلائیگی اور

ہندو مسلمانوں کو محبوب ہو گی۔

رسم الخط کی بحث ختم کرنے سے پہلے مہاتما گاندھی کی رائے کا نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، ان کا خیال ہے کہ اس جھگڑے میں آخر کار دیوناگری خط کی جیت رہے گی کیونکہ ہندستان کے بیشتر صوبوں میں اکثر صوبائی زبانیں دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں یا ان کا رسم الخط دیوناگری رسم الخط سے ملتا جلتا ہے، اس الہامی رائے سے اردو رسم الخط کے حامیوں کو بد دل نہیں ہونا چاہیئے، اگر وہ اردو سے حقیقی محبّت رکھتے ہیں تو اس کا رسم الخط کبھی مُردہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہمّت اور عمل کی ضرورت ہے۔

ہندستانی کو ترقی دینے کے ذرائع

انتخاب کے مرحلے طے کر کے کسی ایک نتیجے پر پہنچ جانا جمہوریت کا معمولی سا کرشمہ ہے، لیکن اس فیصلے اور عزّت کی نگہداری کرنا بہت مشکل اور ہمّت کا کام ہے، اب ہمیں باہمی تنازعات مٹا کر ہندستانی کو ترقی دینے کے وسائل پر غور کرنا چاہیئے، یاد رہے ہندستانی ہماری وہی پیاری زبان ہے جسے کوئی اردو کہتا ہے کوئی ہندی اور قومی زبان کے نام سے یاد کرتا ہے، ہمیں نام پر نہیں جانا چاہیئے جو نام جس کو پیارا معلوم ہوتا ہے، وہ اس کو اسی نام سے پکارے مگر شرط یہ ہے کہ حقیقی مقصد کو نہ بھولے۔

ہندستانی کو عمومیّت اور مقبولیّت دینے کے لئے ضروری ہے

کہ ہر جگہ ہندستانی کی انجمنیں قائم کی جائیں، ہر ممبر سے اخلاقی معاہدہ لیا جائے کہ وہ سچے دل سے ہندستانی کا چرچا کرے گا، عوام کے جلسوں کی کارروائی ہندستانی زبان میں عمل میں آئے تاکہ مختلف صوبائی زبانیں بولنے والی قومیں ہندستانی سے مانوس ہو جائیں، مشہور اور مقبول گیت اور نظمیں ہندستانی میں لکھے جائیں اور مشہور گانے والے اپنی خوش الحانی سے ان کی مقبولیت بڑھائیں، کاروباری لوگوں اور عوام سے متعلق اشتہارات ہندستانی زبان میں چھپوائے جائیں، اخبارات اور رسائل کو ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے پرچوں کے ذریعہ ہندستانی کا پرچار کریں، جو پرچے سنسکرت آمیز ہندی لکھتے ہیں یا عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں ان سے التجا کی جائے کہ وہ عام فہم زبان استعمال کر کے اپنے پرچوں کی مقبولیت میں اضافہ کریں، نیز یہ کوشش کی جائے کہ ہندی اور فارسی رسم الخط کے پردے میں کوئی قوم ایک دوسرے کے لٹریچر سے محروم نہ رہ جائے، فلم بنانے والوں اور محکمہ ریڈیو پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ عام فہم زبان استعمال کریں، ابتدائی تعلیم کے نصاب میں ایسی کتابیں داخل کی جائیں جن کی زبان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہو اور حقیقی معنوں میں ہندستانی کہلائی جا سکے، صوبجات متحدہ کا محکمہ تعلیم چند سال سے اس تجویز پر عمل پیرا ہے، یہاں ابتدائی جماعتوں کے نصاب ایسی آسان اور پاک زبان میں لکھے جاتے ہیں کہ رسم الخط کی تبدیلی کا اثر

الفاظ پر نہیں ہوتا، ان کتابوں کو ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں چھپوایا جاتا ہے، جو ہندی کا شوق رکھتے ہیں وہ ہندی رسم الخط کا نصاب خریدتے ہیں اور اردو کے دلدادہ فارسی کے رسم الخط سے استفادہ کرتے ہیں، اگر یہ طریقہ ابتدائی مدارس کے نصاب مرتب کرنے میں ہر جگہ برتا جائے تو ہندستانی زبان بہت کم مدت میں مقبولیت عام حاصل کر سکتی ہے۔

موجودہ صدی کے آغاز میں یورپ والے ایک نئی زبان سپرانٹو کے نام سے پیدا کر رہے تھے، اس کی تخلیق کا مقصد یہ تھا کہ یورپ میں سیر و سیاحت اور تجارت کرنے والوں کو آسانی ہو، اس زبان کے سیکھنے میں بڑی قباحت یہ تھی کہ وہ یورپ کی تمام زبانوں سے علیحدہ تھی، ہندستان کی ملکی زبان میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ان تمام زبانوں کا مجموعہ ہے جو ہندستان کے مختلف صوبوں میں بولی جاتی ہیں، یورپ والے اگر مصنوعی زبان پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو کیا ہندستانی ایک ایسی زبان کو رواج دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے جو کم و بیش تمام ہندستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، نیز صدیوں کے ارتباط اور اتحاد کا نتیجہ ہے۔

موجودہ سیاسی بیداری کے دور میں ہندستانی کا مستقبل نہایت شاندار نظر آتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ملک کی بہتری اسی میں ہے کہ سیاسی اور مذہبی اختلافات کے ہوتے ہوئے ہندستا

کا خیر مقدم کرے، مذہبی اختلافات تو آج تک نہ مٹے ہیں نہ مٹیں گے لیکن زبان کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ جس کا مذہبی اعتقادات پر کوئی اثر پڑ سکے، بلکہ اگر باہمی اتحاد اور یگانگت پیدا ہو سکتی ہے تو ایک زبان ہونے سے ہو سکتی ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس متحد مقصد کو حاصل کرنے کے لئے متحدہ کوشش شروع ہو گئی ہیں، امید ہے کہ آئندہ چند سالوں میں ہندستانی کے رواج سے ایک ملک کے رہنے والے ایک مادر وطن کے سایہ میں تربیت اور پرورش پانے والے ایک زبان ہو کر متحد اور متفق ہو جائیں گے۔

اگر ہم ان سب وسائل سے فائدہ اُٹھائیں جو قدرتی طور پر ہم کو حاصل ہیں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہندستانی نصف صدی سے بھی کم مدت میں تمام ہندستان کی قومی زبان نہ بن جائے کیا ہماری زبان جس کے بولنے والے کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں، اپنی معمولی سی کوشش سے اور کئی کروڑ آدمی اپنے ہم زبان نہیں بنا سکتے، ایسا ضرور ممکن ہے لیکن بلند ہمت اور مضبوط ارادے کی ضرورت ہے۔

جن صداقت آمیز جذبات سے ہندستانی کا مسئلہ اُٹھایا گیا ہے اور جس وطن پرستی کے جوش میں اس اہم اور مفید تحریک کو جاری کیا گیا ہے، اس سے بڑی بڑی امیدیں قائم ہو گئی ہیں، ہمیں اُمید ہے کہ ہندستانی کی ہمہ گیر رَو ا۳۱) تیزی اور سُرعت سے تمام ہندستان پر محیط ہو جائیگی کہ دیکھنے والے حیران ہونگے، عمومی تعلیم، سیاسی

بیداری اور جمہوریت پسندی ان تمام مخالف اور ناموافق جذبات کا خاتمہ کردے گی جو اس وقت ہندستانی کے راستے میں سنگِ گراں معلوم ہوتے ہیں، ہندستانی نہ صرف ہمسایہ اقوام کے ساتھ خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کا موجب ہوگی بلکہ ہر ایک صوبے میں باہمی تنازعوں اور جھگڑوں کو مٹائے گی۔ ممالک غیر کی نظروں میں ہندستان کی وقعت کو بڑھائے گی اور اپنے عام فہم اور مفید لٹریچر کی بدولت بہت جلد ان زبانوں کی ہم پلّہ بن جائے گی، جو اس وقت اپنے ادبی ذخیروں اور کارناموں پر ناز کرتی ہیں۔

فنِ تنقید

تنقید؟ | قدرت نے انسان اور حیوان کو اچھی اور بُری چیزوں کی تمیز کرنے کی قوت ارزانی فرمائی ہے، چونکہ حیوانات الفاظ میں اپنے احساسات کو ظاہر کرنے سے قاصر ہیں، اس لئے وہ اپنی حرکات وسکنات کے ذریعہ دلی نفرت اور رغبت کا اظہار کرتے ہیں، حضرت انسان اپنی قوت گویائی اور حرکات وسکنات دونوں کو کام میں لاکر اپنے دلی جذبات اور طبعی میلان دکھاتے ہیں، جوں جوں قوت تمیز ترقی کرتی ہے، احساسات بھی تیز ہوتے جاتے ہیں، گویا قوتِ تمیز میں نفاست اور تکلّف بڑھتا جاتا ہے، فن تنقید و تبصرہ انہی احساساتِ ممیزہ کی سریع الاثری کا مرہون منّت ہے کہ انسان اپنی فراست اور ذکاوت کی مدد سے ادبی کارناموں کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث کرکے اپنے حالات اور واقعات کو فلسفۂ کائنات اور انسانی حالات سے منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ارتقائے تنقید | اگر ہم ادبیات کی ابتدائی کتب کا مطالعہ کریں تو فن تنقید ابتدائی مراحل میں نظر آئیگا، کسی اچھّے شعر کو سن کر یا عمدہ نثر کو دیکھ کر کسی سنجیدہ اور معقول آدمی کا واہ وا کہدینا یا بکیف ہوکر

گردن ہلا دینا اس پر بہت بڑی تنقید سمجھی جائیگی، لیکن ترقی کے منازل طے کرنے کے بعد باریک بیں اور دُور رس نظریں محض سطحی نکتہ چینی اور اشارتی حرکات پر اکتفا نہیں کرتیں، بلکہ وہ نقد و نظر کے بے پایاں اور ناپیدا کنار سمندر کی تہ میں سے موتی نکالتی ہیں اور ہر بات میں ایسی ایسی موشگافیاں کرتی ہیں کہ دیکھنے والے ان ادبی کاوشوں کی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے فن تنقید کو ارسطو اور افلاطون نے رُوشناس کرایا، اُنہوں نے ادبی تنقید کے متعدد اصول مرتب کئے پھر یورپ کے علماء نے ان مختصر مگر جامع اصولوں پر بڑی بڑی سنگین اور عالیشان عمارتیں کھڑی کرلیں، لیکن مشرق کے باشندے اپنی قدامت پرستی اور ناواقفیت کی بدولت محض ارسطو کے قائم کردہ اصولوں پر ہی قائم رہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھے، گزشتہ سو سال میں جب مغرب کی علمی روشنی سے مشرق میں چراغ جلائے گئے اور علم و ادب کے دریا کی رَو نے اِدھر کا رُخ کیا، تو چمنِ اُردو کے باغبانوں کا دل انگریزی ادب کے سرسبز اور لہلہاتے باغ دیکھ کر لہرایا، ان کو اپنی پیاری زبان کی ناداری پر ترس آیا، ممالکِ مغرب کے ادیب میدان ادب میں بہت آگے بڑھ چکے تھے، اُردو زبان کی عمر اور وسعت ہی کتنی تھی، لیکن اس کی ہمہ گیری اور علم دوستی علم کے ہر شعبے کو اپنے دامن میں پناہ دینے کو تیار تھی،

انگریزی ادب نے اُردو پر اثر ڈالا، اور تعلیم یافتہ طبقہ مغربی طرز پر تنقید کرنے کی طرف متوجّہ ہوا، بیشک اُردو ادبیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ فن تنقید نے بھی ترقی ضرور کی، لیکن ابھی ضرورت ہے کہ ادیب اس طرف پوری توجّہ صرف کریں، ہمارے مُلک میں فن تنقید بہت ہی آسان خیال کیا جاتا ہے حالانکہ یہ فن وُہ فن ہے جو مشکل تریں فنون میں شمار ہونا چاہیئے، اگرچہ اُردو ادبیات کا دامن کم و بیش پانچ صدیوں پر پھیلا ہوا ہے لیکن اس میں ایسی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں جن میں نئے اصولوں پر کسی ادبی کارنامہ پر بحث و تحیص کی گئی ہو، ہمارے ہاں فن تنقید شروع سے لے کر اب تک تنگ نظری، تعصّب، شخص پرستی اور نا منصفانہ جانبداری کا شکار رہا ہے اور اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے تنقید نگاری کے فرائض انجام دیئے ہیں، عام طور علم تنقید نگاری کے اساسی اور ترقی یافتہ اصولوں سے پوری طرح واقف نہیں۔

سنہ ۱۸۵۷ء کی گیرودار سے پہلے جس قدر ادبی تذکرے مرتب ہوئے، بد قسمتی سے ان کی تنقیدیں عموماً قدیمی روایتوں اور حکایتوں کے اثر سے یک طرفہ تھیں، اگر اس وقت کے ماحول کا تجزیہ کیا جائے، تو معلوم ہو گا کہ ان ایّام میں لکیر کے فقیر ہونے ہی سے صحتِ مذاق اور علوئے خیال کی سندیں ملتی تھیں، یہی وجہ ہے

کہ قدیم زمانے کی تنقیدیں نقّادوں کی تنگ نظری کی غمّازی کرتی ہیں، چنانچہ غالب کا اپنے ہمعصروں میں نمایاں ہو کر نہ چمکنا اس دعوے کی روشن دلیل ہے۔

بزرگوں سے سُنا ہے اور بعض تذکروں میں بھی مذکور ہے، کہ "اُردو اخبار" میں جو ۱۸۳۶ء میں مولانا آزاد مرحوم کے والد نے دہلی سے جاری کیا تھا، شہیدی کی شاعری پر مدّتوں تنقیدی بحث جاری رہی، افسوس کہ وہ اخبار اب ناپید ہے اس لئے اس کے متعلق کسی قسم کی قیاس آرائی مناسب نہیں، لیکن اس بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین اور موافقین دونوں نے اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے شہیدی مرحوم کے کلام پر مختلف ادبی پہلوؤں سے بحث کی ہوگی، اس بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ہمارے ادیبوں میں تنقید کا شوق ترقی کر رہا تھا اور فنِ تنقید روایتی قیود سے آگے بڑھنا چاہتا تھا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے ساتھ جب زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب آیا، تو نقدو نظر کا نقطۂ نظر بھی تبدیل ہوا، تنقیدی انقلاب نے سب سے پہلے تذکرۂ آبِ حیات میں ظہور کیا، یہ تذکرہ اپنی تنقیدوں میں انقلابی خصوصیتیں رکھتا تھا، اس لئے اس کے چھپتے ہی ادبی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، مولانا آزاد کے شاگردِ رشید حضرت ناصر نذیر فراقؔ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ لکھنؤ کے

ایک صاحب نے اس کا جواب لکھا، لیکن ملک نے اس کو قبول نہ کیا اِس لئے اب اُس کا نام بھی کوئی نہیں جانتا، بہرحال یہ نامعلوم تذکرہ مرزا دبیرؔ کے خاندان میں سے کسی شخص نے لکھا تھا، بنائے مخاصمت صرف یہ تھی کہ آزاد مرحوم نے مرزا دبیرؔ پر میر انیسؔ کو ترجیح دی تھی، اور مرزا صاحب کے والد کو کاغذ فروش بتایا تھا، ان بزرگ پر اس تحقیق نے ناقابلِ برداشت تازیانہ لگایا اور انھوں نے پورے تذکرۂ آبِ حیات کا جواب لکھ مارا، ظاہر ہے کہ وہ گم شدہ تذکرہ گو معاندانہ سہی لیکن ادبی دلچسپیوں اور موشگافیوں سے خالی نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ آبِ حیات کی اشاعت کا اثر سب سے زیادہ غالبؔ کے ہوا خواہوں پر ہوا، ان کا خیال تھا کہ آزاد مرحوم نے غالبؔ کے مقابلے میں ذوقؔ کو چمکایا ہے اور غالبؔ کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے، چنانچہ حالیؔ مرحوم نے جو غالبؔ کے چہیتے شاگرد تھے یادگارِ غالبؔ کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھ کر اپنے اُستاد کے کلام کے محاسن کو اُجالا تاکہ آبِ حیات کی جادو بیانی اور اس کی ہمہ گیر مقبولیت غالبؔ کو گوشۂ گمنامی میں نہ ڈال دے۔

۱۸۷۰ء میں سر سیّد احمد خاں مرحوم نے تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور اس کے ذریعے ہندستان

کے قدیمی علوم و فنون کو زندہ رکھنے کی کوششیں صرف کیں، اس رسالے کے مقاصد بہت وسیع اور جامع تھے، تنقید نگاری کے میدان میں بھی یہ رسالہ آزاد خیالی کا علمبردار تھا، بلکہ ہر شعبے میں اپنے بانیوں کی وُسعت نظر اور روشن خیالی کو ثابت کرتا تھا، مولانا حالی کی زندگی پر اس رسالے کے بانی سر سیّد کے خیالات کا سب سے گہرا اثر پڑا، وہ خوبیاں جو فطرت نے ان کے دل و دماغ میں ودیعت رکھی تھیں سر سیّد مرحوم کی آبیاریوں اور ہمّت افزائیوں سے بار آور ہوئیں، اور انہوں نے تنقیدی نقطہ نظر سے متعدد تصانیف کا ادبِ اردو میں اضافہ کیا۔

حالی کی تنقید نگاری نے یادگار غالب سے جنم لیا اور وہ شعر و شاعری، حیاتِ سعدی اور حیات جاوید وغیرہ پر ختم ہوئی، اسی دور میں شبلی نعمانی افقِ ادب پر ظاہر ہوئے، انکی ذات میں مذہبی تقدّس اور شوق ادبیات دونوں مجتمع تھے، اگر ان مصنّفوں کے تنقیدی کارنامے سامنے رکھے جائیں تو اردو میں فن تنقید ایک مستقل فن کی حیثیت سے نظر آئے گا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو ادبیات میں ابھی تک فنِ تنقید کو وہ اہمیّت حاصل نہیں جو مغربی ممالک میں ہے، اِس لئے ضرورت ہے کہ ادیب اس طرف متوجّہ ہوں اور اپنی زبان

کے علمی خزانوں میں مغربی ادب سے تنقیدی علم کی دولت منتقل کریں۔

فن تنقید کیا ہے

ہمارے ادیب متقدمین اور متاخرین کی طرح اب تک فنِ تنقید کو فنِ تنقیص سمجھے ہوئے ہیں، گزشتہ صدی کے ادیب تنقید کو تقریظ کہتے، اور اس سے ادیب کی محض تحسین و تعریف مراد لیتے تھے، ان دونوں تعریفوں کے تضاد سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہی ہیں، جب تک ہم لوگ تنقید کے صحیح مفہوم سے واقف نہ ہوں گے ان کا امکان ہمیشہ باقی رہے گا۔

وہ لوگ جو تنقید کا مقصد کسی ادیب کے ادبی کارنامے کی بُرائیاں اور سُقم ظاہر کرنا سمجھے ہیں ہمارے ادب کے گلے پر کُند چھُری چلا رہے ہیں، نیز وہ تنقید نگار جن کا مقصد صرف زیرِ تنقید تصنیف کی تعریفوں کے پُل باندھنا ہے ادیبوں کو گمراہ کرنے کے ذمہ دار ہیں، افسوس کا مقام ہے کہ غلط تنقید کی بدولت اکثر صاحبِ کمال ادیب جن کی ہمّت افزائی لازم تھی ادبیات سے متنفر اور سخن ناشناس احباب کی تعریفوں سے بہت سے نام نہاد ادیب مدارج کمال تک پہنچ گئے۔

تنقید کے اصلی معنے یہ ہیں کہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کی جائے، محاسن اور معائب کو ساتھ ساتھ اس طرح دکھایا جائے کہ دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی ہو جائے، اگر کہیں سرزنش کی

ضرورت ہو تو اس خوبصورتی اور عمدگی سے اس ناگوار فرض کو ادا کیا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، گویا نقاد کا فرض ہے کہ وہ تنقید سے تخلیقی اور تعمیری کام لے، نہ کہ تخریبی اور تعزیری، بعض نقاد تو یہاں تک کہتے ہیں کہ نقاد کو معائب کی طرف جانا ہی نہیں چاہیئے، لیکن ہم ایسی تنقید کو صحیح تنقید کہنے کے لئے تیار نہیں، جس میں کسی ادبی کارنامے کے حُسن و قبح کو عمدگی سے نہ دکھایا جائے، بعض غلط فہمیوں کی بنا پر ہمارے اکثر تنقید نگار تنقید کرتے ہوئے ذات پات کی بحث میں پڑ جاتے ہیں، یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسی تنقید جس میں ذاتی قضیوں کی بحث ہو صحیح تنقید نہیں کہلائی جا سکتی، کیونکہ تنگ نظری اور تعصّب سے آلودہ ہو کر ادب سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔

مغربی نقادوں کے آرا

ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہمارے مُلک میں فن تنقید ابھی تک ابتدائی حالت میں ہے، برخلاف اس کے مغرب میں یہ فن بہت ترقی کر چکا ہے اور ان کے ہاں اس فن کی تربیت اور تحصیل کے لئے مستقل تصانیف موجود ہیں، ہم چند ایک مغربی ادیبوں کی بیش قیمت آرا کا ترجمہ پیش کرتے ہیں، جن کے مطالعہ سے بخوبی سمجھ میں آجائے گا کہ وہ تنقید سے کیا مُراد لیتے ہیں :-

۱- رابرٹسن ۔ ۔ ۔ ۔ تنقید انسانی معلومات کے تمام شعبوں کے متعلق صرف مقابلہ کرنے یا خیالات کے ٹکرانے کو کہتے ہیں۔
۲- کاڈکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کسی کام کے کرنے کے دو طریقوں کے درمیان موازنہ کرنا اصلی تنقید ہے۔
۳- ولیم ہنری ہڈسن ۔ ۔ ۔ ۔ تنقید وہ ادب ہے جو ادب کے متعلق لکھا گیا ہو، خواہ اس میں مصنّف کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی گئی ہو، خواہ تعریف و توصیف کی یا تجزیہ و تشریح کی۔
۴- اناطول فرانس ۔ ۔ ۔ ۔ بہترین تنقید وہ ہے جس میں نقاد ان کیفیّات کو بیان کرتا ہے جن کو اس کی روح کسی ادبی کارنامے سے حاصل کرتی ہے۔
۵- چارلس سونبرن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب سے مشکل اور اہم کام جو نقاد کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی تصنیف کے ادبی محاسن کو پہچانے اور پھر یہ معلوم کرے کہ مصنّف کی صنّاعی سے وہ کیونکر محاسن بن گئے۔
۶- میتھیو آرنلڈ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی معلومات کے ذریعہ شگفتہ اور صحیح خیالات پیدا کرنا تنقید ہے۔
۷- سر والٹر ریلے ۔ ۔ ۔ ۔ مردہ مصنّفوں اور ان کے ادبی کارناموں کو زندہ کرنا تنقید ہے۔

تنقید کے دو طریقے | ان خیالات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تنقید کا صحیح

مفہوم کیا ہے، حقیقتاً فن تنقید اس قدر وسیع ہے کہ اس کی کوئی جامع اور مانع تعریف نہیں ہو سکتی، بہر حال آج کل تنقید کرنے کے دو طریقے رائج ہیں (۱)، تنقید نگار کسی ادبی کارنامے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور آخر کار کسی خاص دلخوش کن یا یاس انگیز نتیجے پر پہنچ جاتا ہے یا (۲) کسی تصنیف کو شروع سے آخر تک بغور دیکھنے کے بعد متفرق واقعات کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے پہلی قسم کی تنقید ہر ادیب کا کام نہیں، اس کے لئے وسعتِ نظر، منظم تخیّل اور حُسن بیان کی ضرورت ہے۔ لیکن دوسری قسم کی تنقید پر آسانی سے خامہ فرسائی کی جا سکتی ہے۔ ممالک مغرب میں یہی دو طریقے عام طور پر رائج ہیں، اور ہمارے نقاد اکثر انہی کی پیروی کرتے ہیں۔

تنقید کے مقاصد اصلی تنقید کا بہترین مقصد یہ ہے کہ نقاد زیر بحث ادبی کارنامہ کی صداقت کی تحقیق کرے اور ان معلومات اور حقائق کا مقابلہ جو یہ ادبی کارنامہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، عام انسانی حالات سے کر کے دیکھے کہ فلسفۂ حیات سے ان کا کیا تعلق ہے، نیز معلوم کرے کہ زیر تنقید ادبی کارنامہ ادب کے معیار پر پورا بھی اُترتا ہے یا نہیں، گویا اس میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو ایک ادبی کارنامے میں ہونی ضروری ہیں۔

تنقید کا مادّہ چونکہ ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، اس لئے ہر شخص ہر چیز کے متعلق کچھ نہ کچھ رائے ضرور رکھتا ہے، لیکن یاد رہے ادبی تنقید محض رائے کے اظہار سے بالاتر ہے، اس کے لئے مبلغ علم، وسعت نظر اور حقائق شناسی کی ضرورت ہے، اور اس کے ساتھ حُسنِ بیان بھی لازم ہے تاکہ اپنی رائے کو نہایت موزوں اور مناسب الفاظ میں ظاہر کیا جاسکے، اس اصول کے ماتحت ایک عالم اور عامی کی تنقید میں جو فرق ہو سکتا ہے اس پر بحث کرنی بیکار ہے، اسی وجہ سے مختلف علمیّتوں اور مزاجوں کے انشا پردازوں اور ادیبوں نے تنقید کے مختلف مقاصد پیش کئے ہیں، جن کو یکجا کرنا نقیضین کو جمع کرنے کے مرادف ہے، ہاں وہ اصول اور قواعد جن پر سب متفق ہیں ضرور مفید ہو سکتے ہیں۔

انشا پردازوں اور ناقدوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ادب سے مادی فائدے کی امید رکھنا اس کی روحانی اور جمالیاتی خصوصیات کو خاک میں ملا دیتا ہے، ادب کا حقیقی منشا یہ ہے کہ اس سے رُوح کو انبساط ہو، جب کوئی ادبی کارنامہ سامنے آئے تو انسان مادی دُنیا کے تفکّرات اور کشاکش حیات کے بکھیڑوں کو بھول جائے، اور جتنی دیر اس کے مطالعہ میں مستغرق رہے اپنے آپ کو بھولا رہے، بجنسہٖ یہی مقصد ادبی تنقید کا ہے، جب کوئی نقاد

کسی ادبی کارنامہ پر تنقید کرنے کو بیٹھے تو اس کا تعلّق عالمِ مادیات سے منقطع ہو جائے، اور وہ عالمِ محسوسات میں ایک آزاد اور خوشنوا طائر کی طرح اُڑتا پھرے، ظاہر ہے اس قسم کی پرواز میں جو مسرّت اور انبساط حاصل ہوگی وہ نقاد کا دل ہی محسوس کر سکتا ہے، ہر شخص اس کا لطف نہیں اُٹھا سکتا، تنقید بذاتِ خود ادب ہے، اس کے مقاصد وہی ہو سکتے ہیں جو ادب کے ہیں یعنی طرح طرح کی کیفیتوں کا طاری ہونا، مصنّف کے خیالات کی رَو میں بے بس ہو کر بہہ جانا وغیرہ وغیرہ، فنِ تنقید تخلیقِ ادب سے مشکل فن ہے۔ ہر پڑھا لکھا شخص ادیب بن سکتا ہے، نقّاد نہیں بن سکتا، ہمارے ہاں بھی یہ مثل مشہور ہے کہ شعر کہنا آسان، شعر سمجھنا مشکل ہے، اس بیان میں تنقید ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

کسی مُصنّف کے کلام کو ادبی معیار سے جانچنا اور اس میں ان خوبیوں اور خصوصیتوں کو دکھانا جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہیں تنقید نگار ہی کا کارنامہ ہے، اگر نقاد ادیبوں کے جوہر نہ دکھائیں تو بہت سے مُصنّف گمنام رہ جائیں، مثال کے طور پر ہم غالبؔ کا نامِ نامی پیش کر سکتے ہیں، اگر تنقید نگار غالب کے کلام کی طرف توجہ نہ کرتے تو غالبؔ کو موجودہ شہرت اور عظمت ہرگز نصیب نہ ہوتی، ان کے ملفوظات کی گہرائیوں تک پہنچنا اور ان کے مخصوص فلسفے کو فلسفۂ زندگی سے منطبق کرنا، ناقدوں ہی کا کارنامہ ہے، قابل نقاد اکثر

اوقات ان حقائق تک پہنچ جاتے ہیں جو اصل مصنّف کے دل و دماغ میں بھی نہیں گزرتے، تنقید نگار مصنّف کے کلام کا باقاعدہ تجزیہ کرکے اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ مصنّف کس پائے کا ہے، اس نے اپنے موضوع کے کونسے حصّے کو نمایاں کرکے دکھایا ہے اور کونسا باب ناقدوں کے لئے دھندلکے میں چھوڑ دیا ہے، اس کے ظاہرا الفاظ سے کیا مُراد ہے اور اندرونی طور پر وہ کس مسئلۂ حیات کو حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تصنیف میں ظاہرا اور پوشیدہ خوبیاں اور خرابیاں کیا کیا ہیں، نقاد کا فرض یہیں ختم نہیں ہو جاتا، اس کا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرے، جو کسی ادبی کارنامے کے متعلق کسی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں۔

تنقید کا بہترین فائدہ یہ ہے کہ جن ادیبوں کی ادبی عظمت سے ہم واقف ہونا چاہتے ہیں صرف نقادوں کی تنقیدیں پڑھ کر یعنی بغیر ذاتی محنت اور تحقیق کے ہم ان سے پوری واقفیت حاصل کر لیتے ہیں برخلاف اس کے اگر ہمیں بذات خود ہر مصنّف کے متعلق چھان بین کرنی پڑے تو تھوڑی سی زندگی میں ہم بہت کم ادیبوں کی ادبی عظمت سے واقف ہو سکیں۔

تنقید جہاں ادیبوں کو صحیح ادبی راستے پر گامزن رکھتی ہے اور بھٹکنے سے بچاتی ہے وہاں ایسے لوگوں کو ادیب بننے سے روکتی ہے

جوخواہ مخواہ ادیبوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں، اس کے علاوہ صحیح تنقید ان تحقیقی ادیبوں کی طبیعتوں کو اکساتی ہے جن کے دل و دماغ میں ادبی جوہر پوشیدہ ہوتے ہیں، لیکن غلط مذاق ادب ان کو چمکنے کا موقع نہیں دیتا۔

صحیح تنقید کے ذریعے صحیح ادبی مذاق پیدا ہوتا ہے، تمام ادیب اس بات پر متفق ہیں کہ ہر قوم کا ادب ان کی اصلی زندگی کا آئینہ ہے، اگر ادب بگڑتا ہے تو قوم بھی بگڑتی ہے، اور اگر قوم تنزل پذیر ہوتی ہے تو اس کا ادب بھی اس کا ساتھ دیتا ہے، ایسے نازک موقع پر تنقید نگار ہی آڑے آتے ہیں اور قوم کے مذاق کو درست کر کے اسے پستی کی طرف جانے سے روک لیتے ہیں۔

تنقید کے ذریعے ایسے انشا پردازوں کی روک تھام کی جا سکتی ہے، جو بے راہ روی اور خود غرضی سے غلط معتقدات اور باطل خیالات کی اشاعت اپنا شعار بنا لیتے ہیں یا ذاتی عناد اور تفرقہ پردازی کے ماتحت قومی ادب کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

تنقید نگار کے فرائض تنقید کے مقاصد سمجھ لینے کے بعد تنقید نگار کے فرائض بھی کسی نہ کسی حد تک ضرور واضح ہو جاتے ہیں لیکن ہم مغربی نقادوں کی بیش قیمت آرا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو الگ ترتیب دیتے ہیں :-

۱- جیسے ایک کامیاب طبیب کی کامیابی کا راز اس کی ذہانت

فراست اور فنّی قابلیّت میں مضمر ہے اسی طرح نقاد کی کامیابی اس کی خداداد تنقیدی قابلیّت پر منحصر ہے۔

۲- نقاد کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ ادیب کی عظمت کو تلاش کرے، اس کے پوشیدہ جوہروں کو چمکائے اور اس کے مخصوص نقطۂ نظر سے اس کے خیالات کی ترجمانی کرے۔

۳- نقاد کو چاہیئے کہ وہ ایک کامیاب مقرر کی طرح عوام کو مخاطب کرے اور ادیب سے مخاطب نہ ہو، اس طریقِ کار سے ذاتیات کی بحث چھڑ جانے کا اندیشہ پیدا نہیں ہوتا۔

۴- نقاد بننے کے لئے وسیع مطالعہ، صائب رائے، صحیح ادبی مذاق، منطقی مزاج اور دقیقہ رس طبیعت کی ضرورت ہے۔

۵- نقاد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ کھوٹے کھرے ہی کو جانچتا رہے یا ادیب کو جھٹلائے اور کہیں اُس کی گوشمالی کرے، اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اس کے ادبی کارنامے کی وضاحت کر کے خود خوش ہو، اور دوسروں کو اپنی خوشی میں شریک کرے، زیرِ تنقید ادبی کارنامے کو اجاگر کر کے ہمارے دل و دماغ پر پہلے سے زیادہ گہرے اور نمایاں نقوش پیدا کر دے۔

۶- چونکہ تنقیدی اصول نقادوں کی چھان بین اور تحقیقات سے مرتب ہوتے ہیں اس لیئے تنقید نگار کا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ پوری پوری تحقیق اور تفتیش کے بعد فیصلے صادر کرے، اپنی

رائے کو ظاہر کرنے سے پہلے مصنّف کی قلبی کیفیّتوں اور تخیّلی گہرائیوں کا اچھی طرح تجزیہ کرلے، نیز اس کے خیالات اور حالات سے بھی پوری آگاہی ہونی چاہیئے تاکہ اس کے مخصوص نقطۂ نظر سے موضوع کے ہر پہلو پر نظر ڈال سکے۔

۷۔ تنقید نگار کو لازم ہے کہ پرانے تنقید نگاروں کے خیالات اور تحقیقات سے استفادہ کرے۔ مثل مشہور ہے چراغ سے چراغ جلتا ہے، اگر مختلف قسم کی آرا سامنے ہوں تو نقاد بہت جلد اور آسانی سے کسی خاص نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔

۸۔ نقاد کو ادب کے ہر شعبے سے واقف ہونا چاہیئے۔ جملہ اصناف سخن کی واقفیّت تنقید نگاری کا اصل اصول ہے۔

۹۔ تاریخ ادب سے پورا پورا آگاہ ہونے سے زمانۂ ماضی کے ادوار کی ادبی نشوونما اور عروج و زوال کے اسباب پیش نظر رہتے ہیں۔

۱۰۔ جس فن کی تصنیف پر تنقید کی جائے اس فن سے کما حقّہ، واقفیّت ہونی چاہیئے، کوئی ایسی بات قلم سے نہیں نکلنی چاہیئے جو صدا بصحرا ثابت ہو اور تنقید کی اہمیّت اور ناقد کی شخصیّت کو نقصان پہنچائے،

۱۱۔ تنقیدی رائے ہمیشہ تعصّب اور تکلّف سے پاک ہونی چاہیئے، گویا نقاد کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ غیر جانبدار رہے اور

تنقید کرنے سے پہلے اپنے شخصی تعلقات کو بھول جائے زیر بحث کارنامے کے عیب و ثواب دونوں سامنے رہیں اور کسی مسئلے کی تہ تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

۱۲۔ نقاد کا لہجہ اور زبان نہایت نرم اور ملائم ہونی چاہیئے تخریبی تنقیدی لہجہ اختیار کرنے سے اکثر اوقات عوام مصنّف سے بدظن اور ناقدردانی سے بعض حساس ادیب تخلیقِ ادب سے متنفّر ہو جاتے ہیں، تنقید کا بہترین اصول یہ ہے کہ مصنّف کو اس کی کمزوریوں سے ایک ہمدرد دوست کی طرح آگاہ کیا جائے۔

۱۳۔ تنقید نگار کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے، کہ اس کی تنقید کو بھی، پرکھنے اور جانچنے والے موجود ہیں، تنقید سے نقاد کی قابلیّت اور علمیّت اور اس کے خیال کی بلندی اور پستی ظاہر ہوتی ہے، اس لئے تنقید نگار کا ہر فیصلہ باون تولے پاؤ رتی ہونا چاہیئے۔

اصولِ تنقید | چونکہ عام طور پر تنقید مختلف جذبات اور احساسات کے ماتحت کی جاتی ہے، اور نقادوں کا نظریۂ تنقید اور نقد علم ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اس لئے اصولِ تنقید کا مقرر کرنا نہایت دشوار ہے، بعض ناقدوں نے اس امر کی کوشش بھی کی ہے، لیکن ان کو حسب دلخواہ کامیابی حاصل نہیں۔

ہوئی، پھر بھی بسطورِ ذیل ہیں ہم کچھ نہ کچھ اساسی تنقیدی اصول مقرر کرنے کی کوشش کرتے ہیں :-

۱- سب سے پہلے زیرِ تنقید ادبی کارنامے کی ظاہری شکل و صورت کا اچھی طرح جائزہ لے کر یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ مصنّف اپنے ادبی کارنامے کے ظاہری خد و خال کی نگہداشت باحسن وجوہ کر سکا ہے یا نہیں، مثلاً اگر کسی نے کوئی افسانہ یا ڈرامہ لکھا ہے تو اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جن کی بدولت ایک افسانہ افسانہ اور ایک ڈرامہ ڈرامہ کہلانے کا مستحق ہے، یا اگر کسی شاعر نے کوئی نظم لکھی ہے، تو اس میں اس مخصوص قسم کی نظم کے لوازمات کی بھی نگہداری کی ہے یا نہیں ؟

۲- نقاد کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ متقدمین کے ادبی کارناموں کو زمانۂ حال کے ادبیات سے منطبق کرنا بڑی بھاری غلطی ہے، ہر ادبی تصنیف اپنے زمانے کے خیالات اور حالات کا آئینہ ہوتی ہے، اور ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے نقاد کا کام فقط اتنا ہے کہ وہ ادبی کارناموں کی ان خوبیوں کو تلاش کرے، جو ادبی تشنگی کو دور کر کے احساساتِ لطیفہ میں ہیجان پیدا کرتی ہیں۔

۳- نیز موضوع کے لحاظ سے زبان اور اسلوبِ بیان میں کیا

تعلق ہے، ہر موضوع اور مبحث کے لئے ایک خاص انداز بیان اور مخصوص زبان کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اگر موضوع اور زبان کے تعلق کی نگہداشت نہ کی جائے تو مضمون بے لطف اور بے رنگ ہو کر رہ جاتا ہے، سوداؔ کی غزلوں کو میر تقی کی غزلیں سامنے رکھ کر دیکھو، غزل کے لئے جس نرم و نازک اور جذبات انگیز زبان کی ضرورت ہے، وہ صرف میر صاحب کی غزلوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

۴۔ مصنّف کے ذاتی حالات، ماحول، اور اس کے ماخذوں پر پورا پورا عبور ہونا بھی ضروری ہے کہ مصنّف کی دیانتداری اور اس کی علمی ادبی قابلیّت کا اندازہ ہو سکے، اگر نقاد زیر تنقید کارنامے کے ماخذوں سے ناواقف ہو گا تو کھوٹے کھرے میں تمیز نہیں کر سکیگا بلکہ وہ مُصنّف کے زور بیان کی رَو میں بہتا چلا جائیگا، ہر قدم پر اس کے ساتھ غوطے کھائیگا اور اپنی منزل پر ایک طوفان زدہ اور شکستہ جہاز کی طرح پہنچے گا۔

۵۔ تنقید نگاری کا آخری اصول یہ ہے کہ تصنیف کی ادبی تکمیل پر نظر رکھی جائے، نقاد کی کامیابی کا دارومدار اسی مخصوص اصول پر ہے نقاد کا فرض ہے کہ وہ فطرت کے ان پہلوؤں کا جائزہ لے جو اپنی صداقت اور حُسن سے دماغ کو متاثر کر سکتے ہیں، نیز یہ بھی دیکھے کہ اظہار حُسن میں صداقت کا پہلو ملیا میٹ تو نہیں ہو گیا، معنوی اور ظاہری حُسن

کی نگہداشت کس حد تک کی گئی ہے، جہاں تفصیل کی ضرورت ہے وہاں تشریح و توضیح سے کام لیا گیا ہے یا نہیں، کہیں بیجا تفصیل باعث خبر تو نہیں ہو گئی، مصنّف ذہنی مرقعے پیدا کر کے خلا کو پورا کرنے کی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے، زیر تنقید کتاب میں تناقض بیان تو نہیں، متضاد بیانات سے مصنّف کی ذاتی کمزوریاں ظاہر ہوتی ہیں، اور ان کے اثرات سے قارئین ششش و پنج میں پڑ جاتے ہیں۔

افسوس ہے کہ اُردو زبان میں فنِ تنقید نے ابھی تک مستقل فن کی حیثیت اختیار نہیں کی، اِس مفید موضوع پر گزشتہ صدی کی صرف چند تصنیفات ہیں جو ابھی تک مستقل حیثیت رکھتی ہیں، باقی اللہ اللہ خیر صلّاح، درحقیقت یہ کام اُن لوگوں کا ہے جو مشرقی اور مغربی علوم پر کامل عبُور اور پوری دستگاہ رکھتے ہیں، انہی معدودے چند حضرات کی کوششوں سے ہمارے فنِ تنقید کے نظریوں میں کچھ انقلاب پیدا ہوا ہے ورنہ ہمارے عام تنقید نگار تو تنقید کا مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔

اُردو زبان کے پاسبانوں اور باغبانوں کو بہت جلد فنِ تنقید کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے، ہر زبان اور قوم کی ترقی اس کے ادب کے عروج پر منحصر ہے، اور ادب کے عروج و زوال میں فنِ تنقید کو بہت بڑا دخل ہے، تنقید جہاں مُردہ ادبی کارناموں کو زندہ کرتی

ہے وہاں قوموں کے خوابیدہ احساسات کو بھی بیدار کر دیتی ہے، غلط اور باطل خیالات کی بیخ کنی سے ذہنی ارتقا کی منزلیں طے ہوتی ہیں، اور مُردہ قومیں زندہ قوموں میں شمار ہونے لگتی ہیں، تنقید کے ذریعے ادیبوں اور ادب پسند طبیعتوں میں صحیح ادبی مذاق پیدا ہوتا ہے، جس کا اثر براہ راست ملکی تہذیب و تمدّن پر پڑتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ ہر قوم کا ادب اس قوم کی زندگی کی تفسیر ہے اور قومی عروج و زوال ادبی کارناموں میں مضمر ہے تو فنِ تنقید سے پوری طرح واقف ہونا ہر ادیب کا فرض ہے۔

۱؎ اس مضمون کے لکھنے میں "رُوحِ تنقید" مُصنّفہ ڈاکٹر محی الدین قادری سے مدد لی گئی ہے۔

ادب

ابتدائے تحقیقات | علوم و فنون کی تحقیقات اور مبادیات میں جو شرف یونان اور اہل یونان کو حاصل ہے وہ کسی اور مُلک کو نہیں، ایک زمانہ تھا کہ ہر نئے علم اور فن کی ابتدا یونان سے ہوتی تھی، باقی ممالک اس سے استفادہ کرتے اور یونانیوں کے قدم بقدم چلنے پر فخر کرتے تھے، گویا یونان ہی تہذیب و تمدّن اور علوم و فنون کا منبع خیال کیا جاتا تھا، یونانیوں نے اس دَور میں زندگی کے ہر شعبے میں تحقیق کے قدم بڑھائے اور کامیابیاں حاصل کیں، اسی دوران میں ادب کی تحقیقاتی تحریک کا بھی آغاز ہوا، اور اس تحریک و تحقیق نے یہاں تک ترقی کی کہ تمام متمدّن اقوام عالم اس کی طرف متوجہ ہو گئیں، اب بھی جب کبھی ادبیات پر خامہ فرسائی کی جاتی ہے تو تحقیقات کا سلسلہ ہمیشہ یونانی ادیبوں کے پیش کردہ نظریوں سے ملایا جاتا ہے، کس قدر تعجب کی بات ہے کہ وہ اصول ادب جو ارسطو اور افلاطون نے آج سے سینکڑوں سال پیشتر قائم کئے تھے اب تک انتہائی وقعت اور اہمیّت رکھتے ہیں، بلکہ یہ کہنا بیجا نہیں کہ اُس وقت سے آج تک جس قدر ادبی عمارات تعمیر کی گئی ہیں ان کی بنیاد انہی فلسفیوں کے فراہم کردہ

مسالوں سے پختہ نظر آتی ہیں۔

عبد اللہ المامون کے عہد بابرکت میں جب عربوں نے اور علوم و فنون کے ساتھ ساتھ یونانیوں کی کتابوں سے ادبیات کے اصول اور قوانین نقد و نظر وغیرہ تراجم کے ذریعے حاصل کئے تو ان کی توجہ ادبیات کی طرف اور زیادہ بڑھ گئی، چنانچہ انہوں نے اپنے ڈھنگ پر ادب کی مختلف قسمیں قرار دے کر ادب کی نئی نئی تعریفیں کیں لیکن درحقیقت ادبیات سے متعلق ان کے بنیادی اصول وہی یونان کے تھے، جن پر انہوں نے عربی مذاق کی سر بفلک عمارتیں بلند کی تھیں۔

ادب کی تعریف

جب یونان کے علوم و فنون کو یورپ کے ممالک میں ترقی ہوئی تو علمائے یورپ کی نظریں بھی سب سے پہلے ادب ہی پر پڑیں، حقیقت امر یہ ہے کہ ادب علوم کا ایک ایسا شعبہ ہے جس کے دلدادگان اور علوم کی نسبت بہت زیادہ ہیں، یورپ کے ادیبوں نے ادب کی ترقی میں بہت سرگرمی سے حصہ لیا، اور بڑی بڑی موشگافیاں کیں، اس غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بہ آسانی ہو سکتا ہے کہ گزشتہ سو سال میں ان ادب پسند لوگوں نے ادبیات کے متعلق اس قدر کتابیں تصنیف کر دیں کہ انسان آسانی سے ان پر حاوی نہیں ہو سکتا، اگر یورپ کے تمام ادیبوں کی تصنیفات میں سے صرف ادب کی تعریفوں کے اقتباس جمع کئے جائیں تو ایک معقول کتاب مرتب ہو سکتی ہے، ان ممالک کے ہر ادیب نے ادب کو ایک نئے نقطۂ نظر سے

دیکھا، افسوس ہے کہ ہماری زبان میں ادبی تحقیقات کی محض چند کتابیں ہیں اور وہ بھی دورِ حاضر میں لکھی گئی ہیں، ان کتابوں کی تحقیقات زیادہ تر یورپین مصنّفین کی مرہونِ منّت ہے، اس سے پہلے جس قدر کتابیں ادبیات پر لکھی گئی ہیں وہ عربی کتب سے ماخوذ ہیں۔

عرب کے ماہرینِ ادبیات نے ادب کو شاخ در شاخ تقسیم کر کے اس کے متعلق بہت کچھ اظہار خیالات کیا ہے، تقسیم ادب کے متعلق ان کا خاص نظریہ یہ ہے کہ ادب دو قسم کا ہوتا ہے، اوّل طبعی اور دوسرے کسبی، طبعی ادب ان صفات کا نتیجہ ہے جن کو قدرت انسان کی طبیعت میں ودیعت رکھتی ہے، کسبی ادب درس و تدریس اور حافظہ کی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے، اور وہ علوم جو اس کی تحصیل میں مدد دیتے ہیں انکو علم ادب کہتے ہیں۔

یورپین علمائے ادبیات کی رائیں ان آراء سے بہت مختلف ہیں، ان کی محققانہ آراء گذشتہ اور موجودہ صدی کی نئی تحقیقات اور ایجادات سے اثر پذیر نظر آتی ہیں، اور ہمارے سامنے ادب کی ایسی ایسی شاہراہیں کھولتی ہیں جن سے تصوّرات کی دنیا میں ایک قسم کا انقلاب پیدا ہو جاتا ہے، اگر ہم ان پر زیادہ غور و فکر کریں تو بہت کچھ تضاد دکھائی دیتا ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک ادب کی صحیح تعریف ضرور کرتی ہیں۔ مثلاً :-

جان مورلے :-

ادب میں وہ کتابیں شامل ہیں جن میں خُلق، صداقت اور انسانی جذبات پر وُسعت قلب، سنجیدگیٔ دماغ اور دلچسپ طرزِ بیان کے ساتھ ساتھ بحث کی گئی ہو۔

ہڈسن :-

ادب صرف ان کتابوں پر مشتمل ہے جو سب سے پہلے اپنے موضوع اور طرزِ بیان کے اعتبار سے عام انسانی مذاق کے مطابق ہوں، دوسرے ان میں ادیب نے زبان اور بیان کی لطافتوں کو اصل اصول قرار دیا ہو۔

پاسنٹ :-

ادب نظم و نثر کے ان کارناموں کو کہتے ہیں جو تخیّل کی پیداوار ہوں، اور زیادہ سے زیادہ افراد کو بہ نسبت کوئی عملی اثر ڈالنے یا ترتیب دینے کے خوش رکھتے ہوں، نیز خاص خاص معلومات بہم پہنچانے کی نسبت وہ معلومات عامہ کی بہم رسانی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں۔

بروک :-

ادب لائق عورتوں اور مردوں کے لکھے ہوئے وہ احساسات اور خیالات ہیں جن کو پڑھ کر مسرت حاصل ہوتی ہے۔

ان تعریفوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے اور شعبوں کی نسبت ادب کا دائرہ بہت وسیع ہے، دوسرے ادب انسانی تخیّل

کی پیداوار ہے ۔ اس کا تعلق موضوع کی نسبت طرزِ بیان اور زبان سے زیادہ ہے اور وہ عام طور پر ان حقائق سے بحث کرتا ہے جن کا ظاہری تعلق مادیات سے نہیں ہوتا، گویا وہ ہماری جمالیاتی تشنگی کو دور کرتا ہے، اور اس کا مطالعہ ہمیں ایک قسم کی روحانی تسکین اور مسرت بخشتا ہے۔ اگرچہ عملی دنیا میں اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا، لیکن حقیقتاً وہ ایسے حقائق کو بے نقاب کرتا ہے جن سے ہمارے دماغ کے مختلف شعبے تہذیب و تربیت حاصل کرتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ گویا الجرجانی کی تعریف کے مطابق اگر ادب ہمیں غلطیاں کرنے سے روکتا نہیں تو کم از کم ہماری غلطیوں کی تلافی ضرور کرتا ہے۔

ادب اور فنون لطیفہ | خداوند کریم نے دنیا میں مختلف قسم کے انسان پیدا کئے ہیں، ہر انسان اپنی مخصوص صفات اور قابلیتوں سے دوسرے انسانوں کی ضروریات زندگی مہیا کرنے میں مدد دیتا ہے، جن افراد کو خداوند تعالیٰ نے کسی فن لطیف سے متصف کیا ہے، وہ ہمارے روحانیات اور جمالیات کے اشواق [illegible] رکھنے کے لئے مواد مہیا کرتے ہیں ۔ گویا فنون لطیفہ کا تعلق ہمارے ذوقِ جمالیات اور ذہنیات سے ہے، اور دیگر فنون کا واسطہ ہماری مادی ضروریات زندگی سے ہے۔

تمام علمائے ادب اس بات پر متفق ہیں کہ ادب کا دائرہ دوسرے فنون کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع ہے، کیونکہ کسی نہ کسی طرح انسانی

زندگی کا ہر عمل دائرۂ ادب سے تھوڑا بہت تعلّق ضرور رکھتا ہے۔ چنانچہ ادب فنونِ لطیفہ میں داخل ہے، اور وہ نہ صرف فنِ لطیف ہے، بلکہ سائینس بھی ہے اور علم بھی، اس وجہ سے ادب پسند لوگوں کی تعداد اور علوم و فنون کے دلدادگان کی نسبت بہت زیادہ ہے، چونکہ دیگر فنونِ لطیفہ کی نسبت ادب کا ذوق بہت آسانی سے پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے عوام اس سے بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں، اور یہی ادب کی بڑی خُوبی ہے کہ وہ اور فنون کی نسبت زیادہ سہل الحصول ہے۔

بعض علما کا خیال ہے کہ ادب کا ہر شعبہ فنونِ لطیفہ میں شامل نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ سب کے سب فنِ لطیف کی خصوصیات کے مظہر نہیں، ان کے نزدیک اصناف ادب میں محض شاعری اور چند مخصوص اصناف کو فنِ لطیف کہا جا سکتا ہے۔

فنونِ لطیفہ میں عام طور پر معماری، سنگ تراشی، مُصوّری، موسیقی اور شاعری کا شمار کیا جاتا ہے، یہ بحث بھی مُدّتوں جاری رہی ہے کہ ان فنون میں کس فن کو دوسرے فن پر برتری حاصل ہے، اِس علمی مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لئے مصنّفوں نے دو طریقے اختیار کئے ہیں۔

(۱) وہ سب سے پہلے اس مادے کو دیکھتے ہیں جس کے ذریعے کسی فن کی تکمیل یا ترتیب ہوتی ہے، اور پھر اس مادہ کی کیفیّت

کو دیکھتے ہوئے فیصلہ صادر کرتے ہیں، مثلاً فن تعمیرات میں مسالہ
مادی ہوتا ہے، اور مادے کا درجہ سب سے گرا ہوا ہے، اس لئے
فنون لطیفہ میں تعمیرات کا درجہ سب سے پست ہے، اس سے برتر
سنگتراشی کا درجہ ہے، اس سے اوپر مصوری کا، پھر موسیقی اور سب
سے آخر اور افضل شاعری کا کیونکہ اس کی ترتیب اور تشکیل میں مادیت
کو بالکل دخل نہیں۔

(۲) مقابلے اور موازنے کا دوسرا طریقہ مذکورہ بالا طریقے سے
کچھ زیادہ مختلف نہیں، اس میں بھی وہی عرض اور جوہر کو فیصلے کا معیار
قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں جو چیزیں سنائی دیتی ہیں انہیں قدرتاً ان
چیزوں پر تفوق حاصل ہے جو دکھائی دیتی ہے، موسیقی اور شاعری
کا دیکھنے کی نسبت سننے سے زیادہ تعلق ہے، اس لئے ان کو دیگر
فنون لطیفہ پر فضیلت حاصل ہے۔

فن لطیف کی شناخت | علمائے ادب کے نزدیک ادب کا معیار صداقت
ہے اور اظہار صداقت دو طریقوں سے ہو سکتا ہے یا تو کسی خاص
چیز یا واقعے سے متعلق تمام حالات اور معاملات نہایت ایمانداری
اور دیانتداری کے ساتھ من و عن لکھ دیئے جائیں، گویا اپنے
خیالات اور احساسات کو بالکل شامل نہ کیا جائے یا اس کے
متعلق ایک ایسا جذبات آمیز بیان دیا جائے جو پہلے بیان کی
طرح محض خشک واقعات کا تسلسل نہ ہو، بلکہ اس کو پڑھ کر اصلی

واقع کی زندہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور معلومات عامہ کے ساتھ ساتھ دل و دماغ پر ایک مخصوص وجدانی کیفیت طاری ہو، اسی آخری صنف کو جس میں اصل حالات بیان کرنے کی بجائے جذبات اور احساسات کو تحریک دی گئی ہے ہم ادب لطیف کہیں گے اور پہلی تحریر کو فنون لطیفہ سے خارج سمجھیں گے، اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ فنون لطیفہ انسان کے دماغی رُوحانی اور وجدانی ذوق و شوق کے لئے ایک قسم کی لطیف غذا مہیا کرتے ہیں اصل بات یہ ہے فن لطیف کا ماہر محض سطحی واقعات کو نہیں دیکھتا، وہ واقعات کی تہ میں ایک نئی روح تلاش کرتا ہے اور جب وہ اپنے فن کی آزمائش کے لئے بیٹھتا ہے تو مشاہدات کی رَو میں اپنے ان لطیف اور پاکیزہ جذبات و احساسات کو قلم و کاغذ کے سپرد کر دیتا ہے، جو مشاہدات سے اس کے حساس دل میں موجزن ہوتے ہیں، اس کیفیت کے عالم میں وہ بعض ایسی عجیب و غریب باتیں لکھ جاتا ہے کہ پڑھنے اور سُننے والے کا دل و دماغ اس سے لطف حاصل کرتا ہے۔

برخلاف اس کے ایک واقعہ نگار اپنی تحریر میں یہ خوبیاں پیدا نہیں کر سکتا، وہ ادیب کی طرح اپنی تحقیقات میں احساسات کو نہیں آنے دیتا، اس کی تحریر کا تعلق جذبات اور احساسات کی بجائے اصل موضوع کے مادی پہلو سے ہوتا ہے، اس لئے اس کی واقعہ نگاری کو کوئی جذباتی یا رُوحانی دلکشی پیدا نہیں کر سکتی، فن لطیف کا ماہر اپنی

تصنیف اور تخلیق میں جذبات اور احساسات کی برقی کیفیتیں پیدا کرتا ہے اور اس کی شخصیت اس میں جا بجا اپنے مخصوص قلبی کیفیات کا مظاہرہ کرتی ہے۔

ادب کی تخلیق ادب کی تخلیق کے بارے میں یونان کے عدیم المثال فلسفی ارسطو نے بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے وہ کہتا ہے کہ تمام فنون لطیفہ فطرت کی محاکات ہیں، اور اس کی تخلیق کا باعث انسان کا فطری تقلیدی مادّہ ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں قدرت نے تقلید اور نقل کا مادہ ودیعت کیا ہے، اس مادہ کی بدولت اس کو نقل اور تقلید میں بہت لطف آتا ہے، جب کسی چیز سے اس کا دل متاثر ہوتا ہے تو وہ اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور قدرتی طور پر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ جس چیز کو وہ خود پسند کرتا ہے دوسرے بھی اسے پسند کریں، کہتے ہیں اسی تقلید و نقالی پر انسان کی ترقی کا انحصار ہے، اگر انسان میں یہ تقلیدی صفت نہ ہو تو اس میں اور حیوانات و جمادات میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

جب انسان کا دل و دماغ فطرت کے نقوش اور کاروبار کائنات سے اثر پذیر ہوتا ہے، تو مختلف قسم کے اثرات اس کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، وہ ان دلی تاثرات اور قلبی کیفیات سے دوسروں کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی کوشش سے ادبیات کا آغاز ہوتا ہے، یاد رہے انسان کے ان تاثرات کا نتیجہ ان امور کی

ہو بہو نقالی نہیں ہوتی، جن سے اس کا قلب و دماغ کوئی گہرا اثر لیتا ہے، بلکہ اس کی طبیعت کی شوخی، دماغ کی صنّاعی، طرزِ بیان کی خوبی، خیالات کی بلندی اور قلب کی مخصوص حالتیں اس کے اظہار میں اپنی کیفیتیں دکھاتی ہیں، انہی تاثرات کی نمائش کا نام ادب ہے اور یہی تخلیق ادب کا موجب ہیں۔

مسئلہ تخلیق ادب کے متعلق گوسائیں لکھتا ہے کہ "صرف فطرت کے محاسن کی تقلید اور خوبصورت مناظر دیکھنے کی مسرّت فنون لطیفہ کی اصلی مہیجات نہیں ہیں بلکہ ہمارا دماغ ان کا مطالعہ کرتا ہے پھر انکی ترجمانی کرنے کی خواہش سے ادبیات کی ابتدا ہوتی ہے۔" یعنی کسی چیز کو دیکھنے کے بعد اس کے متعلق جو خیالات ہمارے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، ان کو بہترین الفاظ میں قلمبند کر لینا ہی ادب پیدا کرنا ہے۔

اسی عالم ادب کا خیال ہے کہ فطری اور جسمانی حسن میں ایک قسم کی کمی ہوتی ہے، اسے معلوم کرنے کے بعد اس کو دور کرنے کی کوشش کرنا ادبیات کی ابتدا ہے، اس کے نزدیک فطری اور جسمانی حسن کی کمی یہ ہے کہ حسن صورت اور حسن سیرت میں ایک خلیج واقع ہے؟ انسانی روح اسے پُر کرنے کی کوشش کرتی ہے تاکہ حسن سیرت، حسن صورت کا مظہر بن جائے۔

ایک اور انشاپرداز تخلیق ادب کے متعلق کہتا ہے کہ انسانی

روح کو دنیاوی حسن سے تشفی نہیں ہوتی، وہ اپنی تسلّی کے لئے کائنات کی خوبصورتی میں کچھ اضافہ کرنے کی کوشش کرتی ہے، بس انہی کوششوں کے نتیجے کا نام ادب ہے۔

نیومین کہتے ہیں۔ "جو کچھ کہا جاتا ہے کہنے والے کی آواز سے زیادہ دُور تک نہیں پہنچ سکتا، گویا وہ آواز کے ساتھ ہی فنا ہو جاتا ہے۔ جب الفاظ کسی طویل سلسلۂ خیالات کو ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور ان کو اقصائے عالم تک پہنچانا پڑتا ہے یا جب انکو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے تو ان کو لکھ لیتے ہیں، یہی تحریریں بعد میں ادب کہلاتی ہیں۔"

ایک ہندستانی ادیب نے ادب کی تخلیق کو انسان کے پیٹ کے ہلکے پن کا نتیجہ قرار دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ انسان فطرتاً پیٹ کا ہلکا ہے گویا اس کے پیٹ میں کوئی بات پچ نہیں سکتی۔ جونہی اس کے دل میں کوئی نئی بات آکر الفاظ کا جامہ پہنتی ہے اس کا پیٹ نفخ ہو جاتا ہے، نفخ کی تکلیف بڑھ کر درد شکم کی صورت اختیار کر لیتی ہے، ایسی صورت میں پیٹ کی گرانی کو ہلکا کرنے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس بات کو جس کی وجہ سے نفخ اور درد شکم پیدا ہوا ہے تحریر یا تقریر کے ذریعے دوسروں تک پہنچا دے۔ تاکہ پیٹ کی گرانی دُور ہو کر طبیعت ہلکی ہو جائے۔

بعض ادیبوں کا خیال ہے کہ انسان کی طبیعت میں نمائش کی خواہش

ودیعت ہے اور اسی خواہش کی تکمیل کے ضمن میں ادب کی تخلیق عمل میں آتی ہے۔

چاہے ادب کو ارسطو کے خیال کے مطابق تقلیدی مادہ کا کرشمہ کہا جائے یا کاروبار کائنات سے قلب انسانی کے متاثر ہونے کا نتیجہ، خواہ اسے فطری اور جسمانی حسن کے بیچ کی کڑی سمجھا جائے یا کائنات کی تسلی بخش آرائش کا بناؤ سنگار، اور چاہے انسان کے پیٹ کے ہلکے پن یا خواہش نمائش کو اس کی تخلیق کا باعث قرار دیا جائے۔ لیکن یہ بات ماننی پڑے گی کہ ادب کی تخلیق میں قوت متخیلہ اور ہمارے جمالیاتی شوق کو بہت زیادہ دخل ہے، اور ہمارا ادب اسی شوق کی کارنمائی ہے۔"

ادب کی قسمیں: عام طور پر ادب کو نظم و نثر میں تقسیم کیا جاتا ہے، لیکن اکثر علمائے ادب نے اس مسئلے کو بہت پیچیدہ بنا دیا ہے، ہم اس طویل اور غیر دلچسپ بحث میں پڑنا نہیں چاہتے اور ادب کی قسموں کے متعلق محض اس قدر عرض کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، کہ تمام ادب کو پہلے نظم و نثر میں تقسیم کرنا چاہیے، پھر نثر کی تین قسمیں قرار دینی چاہئیں، اوّل وہ نثر جس کے مطالب و معانی اور اسلوب بیان استدلالی ہوں، دوسرے وہ جس کے مطالب و معانی اور اسلوب بیان جمالیاتی ہوں اور تیسرے وہ جس میں یہ سب خوبیاں ہوں اور اس کے ساتھ اس میں شعریت ہو لیکن وزن نہ ہو۔

نظم کے متعلق محض اسی قدر کافی ہے کہ اس کے مطالب و معانی اور اسلوب بیان جمالیاتی ہوتے ہیں اور ان خصوصیات کے ساتھ اس میں وزن کا بھی التزام رکھا جاتا ہے۔

ادب کا مقصد | یونان کے مشہور فلسفی افلاطون نے ادبیات کا حقیقی مقصد اخلاقیات اور صداقت کو قرار دیا ہے، چنانچہ اس نے ان ادبیات کو بیکار محض سمجھتے ہوتے انصاب تعلیم سے نکال دیا جن کی تشکیل اور ترتیب تخیلات پر مبنی تھی، اس کا خیال تھا کہ ہر ادبی کارنامے میں اخلاقیات اور صداقت ضرور ہونی چاہیئے ورنہ وہ صنف ادب میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

افلاطون کے اس نظریہ پر اکثر ادیبوں نے سخت نکتہ چینی کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر افلاطون کے معیار صداقت سے ادب کو جانچا جائے تو اس کا ذخیرہ اور دائرہ بہت ہی محدود رہ جاتا ہے، نیز اس کا شمار فنون لطیفہ میں بھی نہیں ہو سکتا، وہ یہ بات تو تسلیم کرتے ہیں کہ ادب میں صداقت اور اخلاق کا پہلو واقعی جزو لازم ہے، لیکن جس صداقت کا دعویدار افلاطون ہے، اس کا ادب سے دور کا تعلق بتاتے ہیں، کیونکہ ادب خارجی صداقت کی ترجمانی نہیں کرتا، وہ داخلی صداقت کو بے نقاب کر کے اشیاء کی اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے جس کو عوام دیکھ سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں، ان کے نزدیک یہ کام سائنس کا ہے کہ وہ اشیاء کی ظاہری صداقت سے بحث کرے۔

ایک ادیب عام حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے معمولی معمولی چیزوں سے متاثر ہو کر دنیا کے سامنے بالکل اچھوتے اور نرالے تاثرات پیش کرتا ہے، اس کی اس نئی قسم کی تحقیقات سے ایک طرف ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کے تخئیلی انکشافات سے ہماری رُوح اور قلب کو ایک قسم کی سرمدی مسرّت حاصل ہوتی ہے، یہ درست ہے کہ عام نقطۂ خیال سے اسکی تحقیقات ظاہری حقیقت اور صداقت سے بے نیاز معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہ اسی صداقت کی تفسیر ہے جسے ظاہر بیں آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں، بالفاظ دیگر ادبی حقائق کا اگرچہ مادی اشیاء سے کوئی ظاہری تعلق نہیں ہوتا، لیکن ہمارا دل و دماغ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ ان کا تعلق ہمارے روزانہ کے حالات اور مشاہدات سے بدرجہ اتم موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ ادبی کیرکٹروں کے ساتھ ہم اِس بے تکلّفی سے گھُل مل جاتے ہیں جیسے ہم ہیں اور ان میں کوئی فرق ہی نہیں، ہم ان کی خوشی میں خوش اور غم میں غمگین ہوتے ہیں، گویا ہماری ان سے ایسی دوستی قائم ہو جاتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو ان سے علیحدہ خیال نہیں کرتے، اگر سچ پوچھئے تو یہی ادب کا حقیقی مقصد ہے، جتنی دیر ہم ادب کے مطالعہ میں محو رہتے ہیں، اُتنی دیر کے لئے اس کاروباری اور دُکھوں بھری دُنیا سے ہمارا تعلق منقطع ہو جاتا ہے ادب کی رنگینیاں اور دلچسپیاں ہمیں اپنے آپ میں اس قدر جذب کر لیتی

ہیں کہ ہم تمام تفکرّات دُنیا ہی سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔

ادب زندگی کی تصویر ہے | میتھیو آرنلڈ کا مقولہ تھا کہ ادب انسانی زندگی کی تفسیر ہے، بعض ادیب اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہیں، وُہ کہتے ہیں کہ ہر عہد کا ادب اس عہد کی انسانی زندگی کی حقیقی تفسیر ہے۔ یہ بات ہر شخص تسلیم کرے گا کہ ہر عہد کے لوگوں کے مذاق، رُجحان اور پسندیدگی کا اثر ان کے ادب پر ضرور پڑتا ہے، اور ہر دَور میں وُہی ادب مقبولیّت کی سند پاتا ہے جو عوام کے مذاق کی ترجمانی کرتا ہے، اس لئے ہم ہر عہد کے مطبوع اور مرغوب ادب سے اس دَور کے لوگوں کے مذاق کا بالکل صحیح صحیح اندازہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ادب میں ایک بڑی خُوبی یہ ہے کہ وہ محض واقعات کا اظہار نہیں کرتا، بلکہ واقعات کی تفسیر میں وہ تخیّلی اور ذہنی کیفیات کا خاکہ ایسی تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے جس کو دیانتدار واقعہ نگار کا قلم اور سینما فلم بھی منکشف نہیں کر سکتے، ادب کی اس خصوصیّت کو دیکھتے ہوئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے ادب کی طرف سے ہمیشہ خبردار اور ہوشیار رہیں تاکہ آنے والی نسلیں ہمارے عہد کے انحطاط پذیر ادبی کارنامے دیکھ کر ہم پر زہرخند نہ کریں۔

ادب پر مذاق کا اثر | ہر دور میں ایک خاص ادبی رنگ کو مقبولیّت حاصل ہوتی ہے، جو ادیب اس خاص رنگ اور مذاق کے مطابق ادب کی تخلیق میں حصہ لیتا ہے، اس کے ادبی کارناموں کو پسند کیا جاتا ہے

اور باقی ادیب گمنامی اور کس مپرسی کے عالم میں فنا ہو جاتے ہیں۔
ایک ادیب شہیر نے ہر عہد کے مخصوص ادبی مذاق کی تشریح ایک نہایت دلچسپ اور پُر لطف تمثیل سے کی ہے، وہ کہتا ہے ہر عہد کا مخصوص ذوق ادب بعینہٖ ایسا اثر کرتا ہے جس طرح کوئی رنگین شیشہ روشنی پر، مخصوص قسم کی شعاعیں اس میں سے گزر جاتی ہیں اور باقی اس میں جذب ہو کر رہ جاتی ہیں۔
کس قدر لطف کی بات ہے کہ یہی ذوق ادب جس کے پردے میں بہت سے ادیب گمنام رہ کر فنا ہو جاتے ہیں، بعض ادیبوں کی ذہانت اور خاص طرز سے تبدیل بھی ہو جاتا ہے، اس اجمال کی تفصیل اس طرح پر ہے کہ ایک ہوشیار کاریگر محض وہی چیزیں نہیں بناتا جن کی عوام کو ضرورت ہوتی ہے، بلکہ وہ عوام میں اپنی تیار کردہ نئی چیزوں کی مانگ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، بالکل اسی طرح ایک ذہین اور ہوشیار ادیب جس کا مذاق اپنے عہد کے مذاق سے مختلف ہوتا ہے، وہ اپنی نئی طرز اور کوششوں سے عوام کا مذاق تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اور اپنی غیر معمولی ادبی قوت سے اس قاعدۂ کلیہ کو توڑ ڈالتا ہے، جس کے ماتحت غیر مطبوع ادیب مقبولیت حاصل نہیں کر سکتے، ایسے زوردار ادیب کی جدو جہد یقیناً بڑی دلچسپ ہوتی ہے جبکہ اس کے عہد کا مذاق اسے راستہ دینے کو تیار نہ ہو۔

افادی اور غیر افادی نقطۂ نظر ادبیات کے افادی اور غیر افادی نظریہ پر

بھی علمائے ادب کی مدّتوں بحثیں ہوئی ہیں، ان میں سے ایک گروہ اس خیال کا ہے کہ ادبیات سے کچھ نہ کچھ مادی فائدہ ضرور ہونا چاہیئے، دوسری جماعت کہتی ہے کہ مادی فوائد سائنس سے متعلق ہیں' ادبیات کا تعلق محض باطنی صداقت اور روحانی کیفیّت سے ہے' گویا ادب کا حقیقی منشا یہ ہے کہ اس سے رُوح کو مسرت حاصل ہو، اور وہ عام اور ظاہری صداقت کی ترجمانی نہ کرے کہ یہ سائنس کا کام ہے، بلکہ وہ اس صداقت کو بے نقاب کرے جو سائنسدانوں کی نظروں سے پوشیدہ اور ان کی دسترس سے بالاتر ہے، ممکن ہے کہ ایک ظاہر پرست شخص اس شاعرانہ حقیقت کو بے معنی اور لغو قرار دے لیکن حقیقتاً اسکی تہ میں وہی حقائق مضمر ہوتے ہیں جن کی تلاش میں بڑے بڑے سائنسدان اور نام نہاد حقائق شناس اپنی عمر کا بہترین حصّہ صرف کر دیتے ہیں۔

جو لوگ ادبیات کو مادی استفادہ سے بالاتر سمجھتے ہیں وہ ایسے ادب کو جس میں ظاہری صداقت سے بحث کی جائے ادب لطیف کے زمرے میں شامل نہیں کرتے، لیکن وہ حضرات جو ادب سے ظاہری فوائد اور حقائق کے طلبگار ہیں، اس قسم کے ادب کو غیر مفید سمجھتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ ادب جو ذہنی ارتقا کا باعث نہیں ہوتا ہرگز ادب لطیف نہیں کہلایا جا سکتا، گویا حقیقی اور اصلی ادب مادی افادے سے بالاتر ہے، اور اس کی اصلی خوبی یہی ہے کہ وہ محض ذہنی مسرّت بہم پہنچاتا ہے۔

ادب کے فوائد | ادب ہماری زندگی کا ایک اہم ترین شعبہ ہے، اس کا
مطالعہ ہماری دماغی وسعت کا باعث ہے، فنون لطیفہ میں ادب کو
دیگر فنون پر برتری حاصل ہے،۔ اس لئے وہ بہترین فن لطیف ہے،
ادب زندگی کے حقائق کی تفسیر ہے، ادبیات کے مطالعہ سے ہر عہد
کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں، اور اس کے ذریعے
سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جنھیں کوئی واقعہ نگار یا
تاریخدان باوجود انتہائی کوششوں کے قلمبند نہیں کر سکتا، ادبیات
کے توسل سے ہم پرانے زمانے کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی
شخصیتوں کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتے ہیں جیسے ہم میں اور ان
میں کوئی فاصلہ اور پردہ باقی نہیں رہا، اس کے علاوہ جو ادیب یہ
خدمات انجام دیتا ہے ہم اس کے بھی رازدار بن جاتے ہیں، اور
اس رازداری کی بدولت ہمارے اور اس کے درمیان ایسے دوستانہ
تعلقات قائم ہو جاتے ہیں، جن کے احساس سے ہمارا دل حد درجہ
مسرور ہوتا ہے، جب تک یہ دوستی اور رازداری کا سلسلہ جاری
رہتا ہے، ہم اپنے دنیاوی تفکرات اور پریشانیوں کو بھول جاتے
ہیں، ہم اس کے ساتھ ہنستے ہیں، کھیلتے ہیں، غمگین ہوتے ہیں،
بُروں سے نفرت اور اچھوں سے محبّت کرتے
ہیں، کبھی عوام سے ملتے ہیں، کبھی اُمرا اور روٴسا، کی صحبتیں دیکھتے ہیں
بادشاہوں کی رازداری کا شرف حاصل کرتے ہیں، غرض زندگی کے

ہر شعبے سے واقفیت بہم پہنچاتے اور ان حقیقتوں کو سمجھتے ہیں، جن کو فلسفی اور سائنسدان حل کرنے سے قاصر ہیں، وہ قلبی سرور اور سرمدی کیفیت جو ادب پیدا کرتا ہے کبھی زوال پذیر نہیں ہوتی، لوگ بڑھے ہو جاتے ہیں، حادثات اور انقلابات ایّام دُنیاوی مسرتوں سے محروم کر دیتے ہیں لیکن ادبی مسرتوں کو زوال نہیں آتا، جن لوگوں کو ادب کا چسکا ہے، ادب کے لطف کچھ وہی سمجھ سکتے ہیں، بعض ادب پسند لوگ کہا کرتے ہیں کہ ادیب اور ادبیات کے دھنی ہمیشہ جوان رہتے ہیں۔

ادب کا بہترین مقصد اور اصلی فائدہ محض رُوحانی مسرّت ہے، رُوحانی مسرّت بہم پہنچانا بہت مشکل کام ہے، لیکن ادب یہ خدمت بہت آسانی سے انجام دیتا ہے، اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ رنجدہ اور الم انگیز موضوع ادبیات کے تحت میں نہیں آتے، یا کسی ایسے موضوع پر ادبیات کا رنگ نہیں چڑھ سکتا جس میں ظاہری دلچسپی نہیں ہوتی، یاد رہے ادیب کی صنّاعی اور اس کا زورِ بیان المناک حادثوں اور غیر دلچسپ واقعوں میں بھی غیر معمولی ادبی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے، موضوع کے اعتبار سے ان کو پڑھ کر ہمارے جذبات کو ضرور ٹھیس لگتی ہے، لیکن اس رُوحانی تکلیف میں بھی ایک قسم کی روحانی مسرّت ہوتی ہے، ادبی رنج بھی ایک قسم کی مسرّت ہوتی ہے، جب ہمارے دل کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہم خوب جی کھول کر رو لیتے ہیں، رو لینے سے ہمارے دل کا بوجھ ہلکا ہو کر

طبیعت خود بخود شگفتہ ہو جاتی ہے، اور ہم اپنے روزانہ کے کاروبار اور اشغال میں نہایت خوشی کے ساتھ مصروف ہو جاتے ہیں۔

بعض علمائے ادب کا خیال ہے کہ بہ نسبت الم انگیز ادب کے مسرت انگیز ادب زیادہ وقیع ہے، کیونکہ مسرّت خیز ادب کا انسانی زندگی کے کاروبار پر نہایت خوشگوار اثر پڑتا ہے، اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہماری زندگی پہلے ہی مشکلات اور المیات کا مرقع ہے، ہر روز کے فرائض منصبی، دنیاداری کے بکھیڑے، اور آئندہ کے تفکرات جسم و جان کو ہمیشہ مضمحل رکھتے ہیں، ایسے حالات میں اگر ہمارے ادیب ایسا ادب پیدا کرنے کی کوشش کریں جو زندگی کے مسرّت انگیز حقائق اور موضوع پر روشنی ڈال کر ہماری دکھوں بھری زندگی کو پُر لطف بنا دے اور ہمارے دلوں میں مسرّت کی ایک برقی لہر پیدا کر دے تو سمجھنا چاہیئے کہ انہوں نے نہ صرف ادبیات کی بلکہ تمام بنی نوع انسان کی بہت گرانمایہ خدمت انجام دی۔

فنِ تقریر

فن تقریر | فنّ تقریر فطری عطیہ ہے ہر عالم و عامی میں یہ قوّت نہیں کہ فنون لطیفہ کی اس شاخ سے قلم لگائے اور گل و گلزار کھلائے بعض انسانوں میں فنِ تقریر کا مادہ قدرتی طور پر عام لوگوں سے کسی قدر زیادہ ہوتا ہے، لیکن یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ فن تقریر خواص کی ملک ہے، ہمّت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ خداوند کریم نے ہر شخص کو قوّت گویائی عطا فرمائی ہے اور اس کو ترقی اور تربیت دینا ہمارے اختیار پر چھوڑا ہے، جن لوگوں کو جس قسم کا ماحول اور سوسائٹی ملتی ہے اُن کی اُٹھان بھی اسی طرز پر ہوتی ہے، سیاسی بیداری نے ہمارے مُلک میں اَن گنت مقرر پیدا کر دیئے ہیں جو اپنی چرب زبانی اور شیریں بیانی سے ہزاروں سامعین کے دل مُٹھی میں لے لیتے ہیں، اسی طرح اکثر تحریکوں کی بدولت بڑے بڑے مقرر پیدا ہو جاتے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ قوّت تقریر یا حول کے اثر سے پیدا ہوتی اور مقرر کی کوششوں سے پروان چڑھتی ہے، اگر ہم یہ کہیں کہ فن تقریر ہر انسان کا فطری حق ہے، نہ کسی قسم کی غلطی سرزد ہونے کا امکان نہیں، یہ دوسری بات ہے

کہ کوئی شخص خاموش یا گونگا بن جانا عین انسانیت خیال کرے۔

فن تقریر کی اہمیت کامیاب اور بامراد زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح انسان اپنی دوسری قوتوں میں استعداد پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح فنِ تقریر میں بھی مشق بہم پہنچائے کیونکہ دُنیا کا کوئی کام بغیر تقریر کے نہیں چلتا، جو لوگ اچھے سلیقے اور عمدگی سے گفتگو کر سکتے ہیں سوسائٹی کی زینت کہلاتے ہیں، برخلاف اس کے وہ لوگ جو اپنے مفہوم کو حُسن و خوبی کے ساتھ دوسروں کے ذہن نشین نہیں کرا سکتے وہ ہمیشہ پھسڈی رہتے ہیں، معلوم ہونا چاہئے فن تقریر اور گفتگو میں محض تدریجی فرق ہے، گفتگو میں تخاطب چند آدمیوں سے کیا جاتا ہے اور تقریر میں بے اندازہ آدمی مخاطب ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ ضروری نہیں کہ جو شخص گفتگو میں شائستہ اور باسلیقہ ہو وہ اچھی طرح تقریر بھی کر سکے۔

فن تقریر کو موجودہ زمانے میں جو اہمیت اور وقعت حاصل ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، ہماری حکومتوں کے قوانین عوام کی رائے کے مطابق بنتے ہیں، اور عوام کی رائے کو مقررین اپنی جادو بیانی سے ہموار کرتے ہیں، سرکاری غیر سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں جن کے کاروبار کثرت آراء سے چلتے ہیں، عام طور پر یہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو فن تقریر میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، آج کل کے زمانے میں کوئی شخص اپنے پیشہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک وہ

فن تقریر میں ماہر نہ ہو، ہر شخص اپنے فن کی خوبیاں اسی وقت سمجھا سکتا ہے جب کہ وہ دوسروں کو قائل کرنا جانتا ہے، دن رات کے تجربے اور آئے دن کے واقعات شاہد ہیں کہ اکثر اوقات اپنے فنون میں مہارت اور اپنے دعووں میں صداقت رکھنے والے محض اس وجہ سے ناکامیاب رہے ہیں کہ وہ اپنے خیالات کو صحیح طریقے سے دوسروں کے سامنے پیش نہیں کر سکے، ان کے مقابلے میں وہ لوگ سو فی صدی کامیاب ہیں جن کے پاس مقابلتاً نہ سچائی اور قابلیت ہے اور نہ اُن کی باتوں میں کسی قسم کی گہرائی مگر ان میں تقریر کی قابلیت ہے وہ اپنے لاطائل دعووں کو نہایت عمدگی سے بیان کر کے دوسروں کو قائل کرنا جانتے ہیں۔

مقرر کی شخصیت مقرر کی شخصیت کا سامعین پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے، اس لئے ان لوگوں کو جنہیں پبلک سے واسطہ پڑے، لازم ہے کہ اپنی شہرت پر کسی قسم کا دھبہ نہ آنے دیں، اکثر دیکھا گیا ہے کہ مقرر کی شخصیت سے مرعوب ہو کر سامعین بہت جلد اپنے خیالات بدل دیتے ہیں، بر خلاف اس کے وہ مقرر جو اپنا وقار کھو بیٹھتے ہیں یا جن کی عوام میں کوئی عزت نہیں ہوتی ہمیشہ زک اٹھاتے اور اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔

مقرر کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جو مجمع اس کے سامنے ہے وہ خود بھی ان میں سے ایک ہے، اگر وہ اپنے آپ کو اُن سے علیحدہ

سمجھے گا تو اسے کبھی کامیابی نصیب نہ ہو گی، اس کے بعد مقرر کو اپنے موضوع کا جائزہ لینا چاہیئے اگر وہ اپنے موضوع پر قادر نہیں تو اسکے مُنہ سے جو فقرہ نکلے گا وہ سُننے والوں کے دلوں میں تسلّی کی بجائے بےچینی پیدا کرے گا۔ بار بار غلط فہمیاں پیدا ہونگی اور مقرر کی شخصیّت کو سخت نقصان پہنچائیں گی، یہاں تک کہ اس سے مجمع بدظن ہو جائیگا۔ مقرر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زبان پر قادر ہو تا کہ کوئی بے ربط اور غیر ذمّہ دارانہ بات اس کی زبان سے نہ نکلے، اکثر مقرر جوش میں آ کر نہ کہنے کی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں، جن سے نہایت تکلیف دہ نتائج برآمد ہوتے ہیں، مقرر کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ وہ سامعین کو نہ بھولے، ان کی نبض پر ہر وقت اس کا ہاتھ رہے اور جس نشے سے وہ ان کو مدہوش کر رہا ہے اس کی مقدار کو ایک ہوشیار ڈاکٹر کی طرح نہایت احتیاط سے صرف کرتا رہے تاکہ مجمع اس کے قبضے سے باہر نہ نکلنے پائے، اس کے ساتھ ہی جوش و خروش کے مواقع پر اپنے حواس پر بھی قادر رہے، وہ مقرر جو خود جوش میں آ کر اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں سامعین کی نبض ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے، نہ ان کو یہ پتہ رہتا ہے کہ وہ خود کدھر جا رہے ہے اور نہ یہ خیال رہتا ہے کہ سامعین کا کیا حال ہے، ہوشیار مقرر خود کبھی جوش میں نہیں آتا، وہ اپنے جوش کو سامعین کے اُکسانے میں صرف کرتا، اور ان پر پُوری طرح حاوی رہتا ہے۔

مقرر کو اپنی زبان اور بیان پر اس لئے حاوی ہونا اور بھی ضروری ہے

کہ وہ ان تقریروں کا مقابلہ کر سکے جو باقاعدہ محنت سے تیار کی جاتی ہیں، نیز ہر ضروری موقع پر اپنے خیالات کو ایسی برجستگی سے بلا تاخیر بیان کرے کہ وہ لوگ منہ دیکھتے رہ جائیں جو اپنے خیالات کو ابھی ترتیب ہی دے رہے تھے اور اس فکر میں تھے کہ کونسا پیرایۂ کلام اور طرزِ بیان اختیار کریں، دیکھا گیا ہے کہ ایسے مقرر جو برموقع اور برمحل مؤثر اور عمدہ الفاظ میں اپنے خیالات کو پیش کر سکتے ہیں اکثر ان لوگوں کے مقابلے میں میدان مار لیتے ہیں جن کے پاس خیالات اور الفاظ کے لشکر کے لشکر موجود تھے، گویا بارود اور سامانِ جنگ اس کثرت سے تھا کہ کامیابی یا انداز معلوم ہوتی تھی، لیکن عین وقت پر اپنی چھوٹی سی مسلح فوج لے کر بیخبری کے عالم میں مخالف آن ٹوٹا اور تیار ہونے کا بھی موقع نہ دیا۔

برجستگی کے ساتھ ساتھ مقرر کے پاس کچھ نہ کچھ سامانِ جنگ ہونا بھی ضروری ہے، گویا تقریر سے پہلے اسے اپنے موضوع پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیے تاکہ دورانِ تقریر میں جو کچھ زبان سے نکلے وہ اس کی گہری نظر اور بلند خیالات کی ترجمانی کرے، اور یہ اعتراض عائد نہ ہو کہ مقرر اصل موضوع سے ناآشنا ہے اور اس نے ادھر اُدھر کی باتیں ملا کر بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے، اس کے علاوہ کسی موضوعِ تقریر کا مقرر کے چہرے پر اس وقت تک صحیح اثر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس کو اچھی طرح نہ سمجھتا ہو، اس لیے موضوع کی واقفیت جہاں

مقرر کی اصلی قابلیت اور حقیقی دلچسپی کی شہادت دیتی ہے وہاں اس کے شخصی وقار کو بھی بلند کرتی ہے۔

ہماری نظر سے اکثر مقرر گزرے ہیں جو الف کے نام بے بھی نہیں جانتے لیکن جب کبھی تقریر کا موقع آیا ہے تو وہ اکثر بڑے بڑے [illegible]وں اور فاضلوں کے جلسے میں اس جوش و خروش سے بولے ہیں کہ سننے والے بیٹھے منہ دیکھتے تھے اور حیران تھے کہ یہ چھپا رستم کہاں سے نکل آیا، ایسے لوگوں نے اکثر میدان بھی مارے ہیں، اس کی وجہ کیا تھی، یہی کہ وہ تقریر کے فن سے واقف تھے، حاضرین کو پرچانا جانتے تھے اور اس کے ساتھ اپنے مطالب کو نہایت برجستگی اور عمدگی سے ادا کر سکتے تھے، ایسے لوگوں کی ذات باصفات سے بالکل خشک اور فرسودہ موضوع نہایت دلچسپ اور رنگین بن جاتے ہیں، ایک لمبی چوڑی تقریر میں ان کا ایک آدھ چبھتا ہوا فقرہ، کوئی دلخوش پھبتی تمام کوفت کو دور کر کے غیر دلچسپ موضوع کو دلچسپ بنا دیتی ہے۔

تقریر کے متعلق یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اکثر تقریریں جنہوں نے حاضرین پر جادو کا اثر کیا اور ایک دنیا ان کو بہترین تقریر کا لقب دیتی ہے، اگر وہ پڑھی جائیں تو ان میں کوئی ایک خوبی بھی نظر نہیں آتی، بات یہ ہے کہ مقرر کا طرزِ تقریر، سامعین کی نبض شناسی، اس کی آنکھوں کی چمک، چہرے پر مختلف کیفیتوں کا طاری ہونا، حرکات و سکنات، لباس، وضع قطع، ذاتی اقتدار،

اور ماحول کا اثر وغیرہ تمام مل کر ایک خاص قسم کی فضا پیدا کر دیتے ہیں جس کا لطف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو اس وقت موجود ہوں'' ایسے کامیاب مقرروں کی تقریریں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تقریر اور تحریر میں کیا فرق ہے، اس بحث سے ہم اس نتیجے پر بھی پہنچتے ہیں کہ تقریر اور مقرر کو جانچنے کی صحیح کسوٹی حاضرین ہی ہو سکتے ہیں۔

آواز کی اہمیت آواز کی دلکشی کی ساری دُنیا قائل ہے، چنانچہ تقریر کی کامیابی اور ناکامی میں بھی آواز کو بہت زیادہ دخل ہے، لیکن افسوس کہ ہمارے اکثر مقررین آواز کی طرف خیال ہی نہیں کرتے، یاد رہے اچھی آواز سے سامعین کے دل و دماغ پر نہایت ہی اچھا اثر پڑتا ہے، بُری آواز میں اچھی بات بھی سُننے کو جی نہیں چاہتا، طبیعت خود بخود نفرت کھاتی ہے، وہ آوازیں جو کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہیں موضوع کی دلچسپی میں اضافہ کرتی اور اس کو زیادہ دلپذیر بناتی ہیں، شیخ سعدیؒ نے کسی شخص کو قرآن شریف بُری آواز سے پڑھتے ہوئے سُن کر کہا تھا ؎

تو کہ قرآں بدیں نمط خوانی
ببری رونقِ مسلمانی

جب بُری آواز میں آسمانی کتابوں کو پڑھنے سے نقصان پہنچ سکتا ہے تو کریہہ آواز سے تقریر بدمزہ ہو جانے میں کیا کلام ہے

اگر بچپن کے زمانے میں آواز کو درست کرنے کی طرف توجہ دی جائے تو اس میں دلکشی پیدا ہو جانی کوئی بڑی بات نہیں۔

بعض مقرر تقریر کرتے وقت کبھی اپنی آواز اس قدر بلند کر دیتے ہیں، کہ سامعین کے کانوں کے پردے پھٹنے لگتے ہیں اور کبھی اس قدر آہستہ بولتے ہیں کہ قریب والوں کو بھی مشکل سے سنائی دیتا ہے، اکثر سٹیج پر بار بار گردش کرتے ہیں، اگر سُوء اتفاق سے مقرر بیڈول جسم کا ہو تو اُس کی یہ گردش عجب مضحکہ خیز صورت پیدا کرتی ہے، آہستہ بولنے اور اپنے محور کے گرد گھومنے والے مقرر جس طرف اپنا رُخ پھیرتے ہیں اُدھر کے لوگ تو انہیں سُن سکتے ہیں، لیکن باقی سامعین ان کے کلام بلاغت نظام سے محروم رہ جاتے ہیں ایسا کرنے سے نہ صرف تقریر کی دلچسپی میں کمی آتی ہے بلکہ حاضرینِ مجلس میں ایک قسم کی بے چینی سی پیدا ہو جاتی ہے، اگر مقرر اپنی غلطی کو بر وقت محسوس نہ کرے تو یہ بے چینی مجمع میں کھلبلی پیدا کر دیتی ہے۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ آواز کو بلند اور آہستہ کرنے سے جذبات کا صحیح طور پر اظہار ہوتا ہے، اور تقریر کی طرف عوام کی توجہ زیادہ بڑھتی ہے، اس نظریئے میں کوئی کلام نہیں لیکن آواز کو اتنا ہلکا کر دینا کہ بہت کم لوگ سُن سکیں، کسی طرح قابلِ تعریف نہیں؛ واقعی آواز میں مدوجزر ضرور ہونا چاہیئے، لیکن یہ بات بھی ہمیشہ ملحوظ

رکھنی لازم ہے کہ سامعین ہر لفظ کو پوری طرح سُن سکیں، جب تقریر کے تمام الفاظ سامعین کے کانوں تک نہیں پہنچتے آپ یقین رکھیں نہ تو وہ تقریر کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ سامعین میں دلچسپی پیدا کر سکتی ہے۔

لاؤڈ سپیکر کے استعمال سے ہلکی آوازیں بلند ہو سکتی ہیں، اس آلہ کے رواج سے ان لوگوں کو ضرور فائدہ ہے جو بلند آواز سے تقریر نہیں کر سکتے، لیکن ان آلات کے استعمال سے اکثر مقررین کو نقصان بھی پہنچتا ہے، جب اس برقی آلہ کو مقرر کے سامنے رکھا جاتا ہے تو اس کو اپنی تمام تر توجہ سامعین کی طرف منعطف کرنے کی بجائے اس آلہ پر صرف کرنی پڑتی ہے، مقرر اپنے مُنہ کو اِدھر اُدھر پھیر نہیں سکتا اور مقررہ فاصلے پر وہ ایک مجسّمہ کی طرح اس آلہ کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کئے جاتا ہے، اگر وہ ذرا بھی اپنی جگہ سے ہلے تو آلہ آواز کو قبول نہیں کرتا اور اگر قبول بھی کر لے تو فاصلے میں کمی بیشی ہونے سے آواز میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے، لاؤڈ سپیکر کے استعمال میں سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ اس کی موجودگی میں مقرر کی حرکات و سکنات اور طرز تقریر میں فرق آ جاتا ہے، ان لوازماتِ تقریر کے فقدان سے عموماً سامعین بے لطف ہو جاتے ہیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ زیادہ سے زیادہ سامعین مقرر کو آسانی سے سُن سکتے ہیں، اگر سوءِ اتّفاق سے یہ آلہ کام نہ کرے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، تو مقرر کی بُری طرح بھد اڑتی ہے اور جلسے میں کھنڈت پڑ جاتی ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض مقررین اس آلے کی موجودگی میں اپنی آواز پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس کو استعمال نہیں کرتے، مقرر کو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کسی جلسے میں اس آلے کا استعمال کیا جا رہا ہو تو اپنی آواز پر بھروسہ کرنا اور یہ سمجھنا کہ ہماری تقریر ہر شخص بخوبی سن سکتا ہے، بڑی سخت غلطی ہے، اس آلے کے ہوتے ہوئے اس کو استعمال نہ کرنے سے اچھے اچھے مقرروں کی تقریریں بے لطف ہو جاتی ہیں، چونکہ سامعین کو بلند آواز کا مزہ پڑ جاتا ہے اس لئے وہ ایسی آواز کو سننا پسند نہیں کرتے جسے زیادہ توجہ صرف کر کے سنا جا سکے، مسز سروجنی نائیڈو جو بلبل ہندوستان کہلاتی ہیں اور تقریر کرنے میں مہارت تامہ رکھتی ہیں ایک دفعہ میں نے ان کی تقریر کو ناکامیاب ہوتے ہوئے بچشم خود دیکھا محض اس لئے کہ ان سے پہلے مقررین برابر لاؤڈ اسپیکر استعمال کر رہے تھے، لیکن انہوں نے اپنی آواز پر بھروسہ کیا اور اس آلے کو اپنے سامنے سے ہٹا دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی تقریر جو ہمیشہ دل کے کانوں سے سُنی جاتی ہے اور سامعین پر ایک سکتے کا عالم طاری کر دیتی ہے کچھ اثر پیدا نہ کر سکی، سامعین بے چین ہو گئے مگر ان کی شہرت اور شخصی وقار کے رعب سے بندھے بیٹھے رہے، جو لوگ ان کی تقریر کو آسانی سے سُن سکتے تھے وہ سُنتے رہے، باقی سرگوشیاں کرنے لگے اور ہر طرف سے خاموش خاموش کی آوازیں آنے لگیں، اگر اس جلسے میں یہ آلہ نہ ہوتا تو بھی تقریر ہر شخص پوری توجہ

سے سُنتا اور باوجود غیر معمولی ہجوم کے ایسی خاموشی طاری ہوجاتی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سُنائی دیتی۔

اداکاری بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فن تقریر اداکاری کے مرادف ہے، اس لئے مقرر کو تقریر کرتے وقت اداکاری کے فرائض بھی ادا کرنے چاہئیں، اس اصول کے پیش نظر ہمارے بعض مقرر آئینہ سامنے رکھ کر تقریر کی مشق کرتے ہیں، ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ اُن کی زبان سے نکلے جسمانی حرکات بھی اس کا ساتھ دیں، میرا خیال ہے اداکاری کے لئے اس قسم کی مشق واقعی ضروری ہے، لیکن تقریر کو اس سے بہت کم تعلق ہے، تقریر اور گفتگو میں محض آواز کی بلندی کا فرق ہے، جب عام طور پر باتیں کرتے ہوئے اداکاری کے فن کو کام میں نہیں لایا جاتا تو پھر تقریر میں اس کی کیا خاص ضرورت ہے، ہاں اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ جو بات کہے وہ دل سے نکلے، اس طرح سے مقرر کے چہرے پر خود بخود صحیح جذبات ظاہر ہو جاتے ہیں، مسلسل مشق اور مہارت کے بعد جب سامعین کا رعب مقرر کے دل سے دُور ہو جاتا ہے تو اس میں آپ ہی آپ ایسی حرکات کرنے کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے جو گفتگو کرتے ہوئے فطری طور پر چہرے اور اعضا سے ظہور میں آتی ہیں، باقاعدہ ہر لفظ کی تصویر بن جانا مقرر کا کام نہیں، ممکن ہے شاعروں کو یہ فن کچھ زیب دے، ورنہ اداکار شاعروں کی بھی اکثر کرکری ہوتے دیکھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے،

کہ سامعین کا خیال مقرر کے الفاظ اور خیالات کی طرف سے ہٹ کر اس کی حرکات اور اداکاری کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، ہاں اگر بعض اوقات اور بہت ہی احتیاط سے اداکاری صرف کی جائے تو ممکن ہے سامعین کو کسلمندی دور کرنے کا موقع مل جائے۔

تقریر کا آغاز اور انجام تقریر سے پہلے مقرر کو ہمیشہ سوچ لینا چاہیے کہ وہ تقریر کس طرح شروع کرے گا اور کن الفاظ پر ختم کریگا، انگریزی میں ایک مثل مشہور ہے۔ "جو کام عمدگی سے شروع ہوتا ہے، وُہ آدھا ختم ہو جاتا ہے۔" یہ مثل تقریر پر بھی صادق آتی ہے جو شخص اپنی تقریر نہایت عمدگی سے شروع کرتا ہے حاضرین اسکے متعلق فوراً فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ اچھی تقریر کرنے والا ہے، نتیجے کے طور پر مقرر سے ہمدردی اور اس کی تقریر سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، اگر سوءِ اتفاق سے کوئی اچھا مقرر اپنی تقریر کو غلط طریقے یا پھُس پھُسے انداز سے اُٹھائے تو عوام کی رائے اس کے متعلق خراب ہو جاتی اور اس کی قائم شدہ شہرت بھی بگڑ جاتی ہے۔

تقریر کے آغاز کی طرح اس کا اختتام بھی شاندار ہونا نہایت ضروری ہے، اگر کوئی کامیاب مقرر اپنی عمدہ تقریر کو نہایت زوردار الفاظ میں ختم نہیں کرتا تو اس کی نہایت شاندار تقریر کا ستیاناس اُڑ جاتا ہے، اس کامیابی کے حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ

جب مقرر اپنی تقریر کے اختتام کے قریب پہنچے تو سامعین کی نبض ٹٹولتا رہے، جس وقت دیکھے کہ سامعین اس کے ہم خیال بن چکے ہیں، اپنی تقریر کو نہایت زوردار الفاظ میں ختم کر دے، اگر کوئی مقرر اپنی تقریر کو صحیح وقت پر ختم نہیں کرتا تو اس کے چند آخری مگر غیر ضروری فقرے اس کی تقریر کو خراب کر دیتے ہیں اور وہ اثر جو اس نے نہایت محنت اور جانکاہی سے پیدا کیا تھا محض ایک آدھ منٹ کی بے ہنگام تقریر سے زائل ہو جاتا ہے۔

تقریر کرنے کے چار طریقے | تقریر کرنے کے عام طور پر چار طریقے ہو سکتے ہیں، اوّل یہ کہ مقرر اپنی تقریر لکھ کر کسی محفل یا مجلس میں پڑھ دے، دوسرے لکھ کر زبانی یاد کر لے اور پھر سامعین کے سامنے دُہرا دے، تیسرے جو کہنا چاہتا ہو اُسے دل میں اچھی طرح سوچ لے اور پھر اس کو باحسن وجوہ عوام کے سامنے پیش کر دے یا اپنے موضوع کے متعلق کچھ مختصر سے نوٹ لکھ لے اور ان کو پیش نظر رکھ کر حاضرین کے سامنے اپنے خیالات بیان کر دے۔

۱۔ تقریر لکھ کر پڑھنا سامعین کے لئے کسی طرح بھی لُطف دہ نہیں ہوتا، اس قسم کی تقریروں سے اکثر لوگ گھبرا جاتے ہیں، اور آپس میں باتیں کرنے لگتے ہیں، اگر خوش قسمتی سے کسی شخصیّت کا دبدبہ سامعین پر چھا جائے تو وہ زبردستی بندھے بیٹھے رہتے ہیں، اور دل ہی دل میں کہتے ہیں، کہ یا اللہ کب یہ سلسلہ تقریر ختم ہو گا،

اور کوئی دوسرا مقرر آئے گا، جو طبیعتوں کو گرمائے گا، اگر صبر اور ضبط کا پیمانہ چھلک جائے تو کھانسی اُٹھنے لگتی ہے، فقرے بازیاں شروع ہوجاتی ہیں، پے در پے تالیاں بجاکر مقرر کا ناک میں دم کردیا جاتا ہے، آخر مقرر کو اپنا سلسلہ بیان کوتاہ کرنا پڑتا ہے، ہم نے بڑے بڑے مجمعوں میں اچھے اچھے مقررین کا یہ حشر ہوتے دیکھا ہے، ان کی تقریر جانکاہ تحقیقات اور بلند تخیلات کا نتیجہ ہونے کے باوجود انہیں سخت ناکامیابی ہوئی ہے، یہ باتیں کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے یہ سمے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، لکھی ہوئی تقریریں عام طور پر اُس مجمع میں کامیاب ہوتی ہیں جہاں خاص طبیعتوں کے لوگ جمع ہوں، اور ان پر عوام کا لفظ صادق نہ آتا ہو، کامیاب مقررین لکھی ہوئی تقریروں کو بھی اپنی صناعی اور ہوشیاری سے دلچسپ بنا دیتے ہیں، وہ جہاں مناسب سمجھتے ہیں لکھی ہوئی تحریر سے ہٹ کر کوئی ایک، آدھ بات سامعین کو مخاطب کرکے ایسی کہہ جاتے ہیں جس سے مسلسل تقریر کی گرانی دُور ہوجاتی ہے، لکھی ہوئی تقریر میں سب سے زیادہ خرابی یہ ہوتی ہے کہ مقرر کی آنکھیں کاغذ پر جمی رہتی ہیں اور وہ اِدھر اُدھر نہیں دیکھ سکتا، اس کوتاہی سے وہ جوش اور ولولے جو مقرر سے آنکھیں چار ہونے کے بعد سامعین کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کی طبیعتوں کو نہیں گرماتے، لہٰذا سامعین کی طبیعت خود بخود

اُکتانے لگتی ہے۔ لکھی ہوئی تقریر کو پڑھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے اپنے سامنے رکھ لیا جائے اور وہ اتنی یاد ہو کہ ایک فقرے پر نظر پڑنے کے بعد کئی کئی فقرے زبان پر بے ساختہ آجائیں، گویا مقرر کی نظریں کاغذ پر نہ جمی رہیں بلکہ وہ برابر سامعین سے مخاطب رہے۔ سامعین محض آواز سے متاثر نہیں ہوتے۔ مقرر کا طرزِ بیان اس کی آواز اور توجّہ اور شخصیّت سب مل جُل کر دل میں اثر پیدا کرتی ہیں، اس لئے تقریر کرنے کا اگر یہ طریقہ اختیار کرنا پڑے تو تحریر میں فنِ تقریر کے اصولوں سے جان ڈالنی چاہیئے، ورنہ لکھی ہوئی تقریر کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی اور خاص طور پر ایسے مجمع میں جس میں مختلف طبیعتوں اور علمیّتوں کے سامعین ہوں۔

۲۔ تقریر کا لکھ کر زبانی یاد کرنا بہترین طریقہ خیال کیا جاتا ہے، اس طریقۂ تقریر میں سب سے بڑا فایدہ یہ ہے کہ سامعین کی موجودگی کا مقرر پر بہت کم اثر پڑتا ہے، ورنہ آپس میں بیٹھ کر چند آدمیوں کے سامنے کسی موضوع پر مسلسل گفتگو کر لینا دوسری بات ہے اور کسی مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر مسلسل تقریر کرنا کچھ اور معنی رکھتا ہے، اگر آپ کو تقریر کرنے کی مہارت نہیں اور آپ کو ایک چھوٹے سے مجمع کے سامنے تقریر کرنے کے لئے کھڑا کر دیا جائے تو جو کیفیتیں آپ پر گزریں گی، ان کا انداز[illegible] ہی کر سکتے ہیں یا وہ لوگ جنہیں کبھی اس قسم کے دلچسپ وا[illegible] سے سابقہ

پڑا ہے، سب سے پہلے دل میں بے چینی پیدا ہو جائیگی، اور آپ کے
چہرے سے اس کا اظہار ہونے لگے گا، کبھی معلوم ہوگا پیاس لگ
رہی ہے یا پیشاب آرہا ہے، ممکن ہے دل بھی بیٹھنے لگے اور آخر کار
آپ کو تقریر کرنے کا ارادہ ہی ترک کرنا پڑے، یہ تو معمولی سی بات
ہے، جس وقت آپ سٹیج پر تقریر کرنے کے لئے لڑکھڑاتے ہوئے
پہنچیں تو اپنے آپ کو بالکل خالی الذہن پائیں، آخر اپنی جیب سے
لکھی ہوئی تقریر نکالتے ہی بنے، سامعین پر نظر پڑے تو ایک ایک
کے دو دو نظر آئیں، اگر کسی کی ٹوپی دکھائی دے تو سارے ہال میں
میں ٹوپی والوں کا ہجوم نظر آئے، اور اگر اتفاق سے کسی پگڑی والے
کو آنکھیں دیکھ پائیں تو تمام ہال پگڑپوش دکھائی دینے لگے، یہ حالت
تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کی نظر سٹیج پر کھڑے ہو کر کچھ کام کرتی ہے
ورنہ تجربہ یہ ہے کہ ابتدائی تقریر میں نظریں ہی کام کرنے سے انکار
کر دیتی ہیں، اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو اتنا کہ بہت زیادہ ہجوم
ہے اور کسی کا سر ہی نہیں ہے، غالباً اسی لئے بعض لوگ کہا
کرتے ہیں کہ جب تقریر کرنے لگو تو بھول جاؤ کہ تمہارے سامنے
کوئی بیٹھا ہوا ہے، جو کچھ کہنا ہو بے دھڑک کہے جاؤ اور کسی شخص
کی پروا نہ کرو یا یہ سمجھو کہ تمہارے سامنے بہت سے بیوقوف جمع
ہیں، ممکن ہے یہ طریقہ مبتدی کے لئے کارآمد ہو، لیکن سامعین
کو بھول جانا اور جو کچھ منہ میں آتا کہے چلے جانا فن تقریر کے منافی

ہے، جب تک تقریر کرنے والا سامعین کی ذہنیت اور ان کے خیالات کی رَو کا ساتھ نہ دے اس کی تقریر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی، بہترین مقرر ہمیشہ سامعین کے ساتھ چلتا ہے اور اپنی سبک رفتاری اور حُدی خوانی سے ان کو ایسا محو کر لیتا ہے کہ خود رہنما اور رہبر بن جاتا ہے، سامعین بے اختیار ہو کر اس کے پیچھے پیچھے چلے آتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے دلپذیر حُسنِ بیان سے ان کو جس طرف چاہتا ہے، لے جاتا ہے، ظاہر ہے رٹی ہوئی تقریر میں مقرر کو رہنما بننے کا پُورا موقع ہرگز نہیں مل سکتا، بہت ممکن ہے کہ عوام کے خیالات اور ذہنیت کا کسی قدر پہلے سے اندازہ کر لیا جائے اور اس کے بعد تقریر لکھ لی جائے، لیکن یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ سے پہلے مقررین کیا کہنے والے ہیں، زبانی یاد کی ہوئی تقریر میں سب سے بڑی قباحت یہی ہوتی ہے کہ مقرر پیشرو مقررین کی تردید یا تائید کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے، اس کے علاوہ اگر مقرر کوئی لفظ یا فقرہ بھُول جائے تو انہی الفاظ کو دُہرانے کی کوشش کرتا ہے اور سامعین کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ تقریر رٹی ہوئی ہے، اگر ہر فقرہ مقرر کی آنکھوں اور اُس کے چہرے پر اصلی جذبات پیدا نہیں کرتا تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ گراموفون کا ریکارڈ بج رہا ہے، گویا یہ کسی اور شخص کی آواز ہے جو مُردہ جسم میں سے نکل رہی ہے۔

۳۔ تقریر کرنے کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ کہنا ہو مقرر پہلے اس پر اچھی طرح غور کر لے اور پھر اس کو سامعین کے سامنے پیش کر دے، یہ طریقہ تقریر سب سے زیادہ مشکل ہے، کم سے کم مبتدی اس پر کاربند نہیں ہو سکتا، اکثر تجربہ کار مقررین بھی یہ طریقہ اختیار نہیں کرتے، اس کے لئے مقرر میں دو خوبیوں کی ضرورت ہے سب سے پہلے وہ صحیح اور صاف فقرے بنا سکتا ہو۔

دوسرے اپنے خیالات کو نہایت عمدگی سے بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو، جب انسان کسی مجمع کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس پر عجیب عجیب کیفیتیں گزرتی ہیں، ایک طرف سامعین کا خیال ہوتا ہے دوسری جانب نفس مضمون کا، ایک طرف سامعین کو اپنا ہم خیال بنانے کا دھیان ہوتا ہے اور دوسری جانب اپنے خیالات کو صحیح طریقے سے پیش کرنے کی سعی، مقرر ایک مخمصے میں پھنس جاتا ہے، ایک طرف سے دامن سمیٹتا ہے وہ دوسری طرف الجھ جاتا ہے، اِدھر سے بچتا ہے اُدھر پھنس جاتا ہے، غرض تقریر وبال جان ہو جاتی ہے، اور مقرر کی ناکامیابی کے امکانات بڑھتے چلے جاتے ہیں، جو لوگ فنِ تقریر میں مہارت تامہ رکھتے ہیں اگر وہ یہ طریقہ اختیار کریں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن مبتدی کے لئے یہ طریقہ کار ہرگز بارآور نہیں ہو سکتا۔

۴۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ مقرر اپنے موضوع کے متعلق کچھ نوٹ لکھے اور اطمینان سے بیٹھ کر ان پر اچھی طرح غور و خوض کرلے، جب تقریر کا موقع آئے تو ان کو سامنے رکھے اور ہر نوٹ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتا چلا جائے، اس طریقے میں بھی حُسن بیان کی ضرورت ہے، اگر مقرر اپنی زبان پر قادر نہیں اور فی البدیہہ صحیح فقرے نہیں بنا سکتا تو یہ طریقہ بھی کامیاب نہیں ہو سکتا، آج کل عام طور پر یہی طریقہ رائج ہے، اس میں وہی خامیاں اور خرابیاں ہیں جو تقریر کو زبانی یاد کرنے میں ہیں۔

بہترین تقریر بعض ماہر مقررین کا خیال ہے کہ بہترین تقریر وہ ہوتی ہے جو مقرر کو زبانی یاد ہو اور اُسے نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کیا گیا ہو، ایسی تقریریں جو فی البدیہہ کی جاتی ہیں عام طور پر صفائی بیان، حسنِ کلام اور ترتیب کی خوبی سے معرّا ہوتی ہیں، یہ خوبیاں وسیع مطالعہ اور محنت شاقہ سے ہی پیدا ہو سکتی ہیں، اس لئے فی البدیہہ تقریروں میں یہ خوبیاں نہیں ہو سکتیں۔

عام طور پر تقریریں ان لوگوں کی کامیاب ہوتی ہیں جن کی تقریر کچھ فی البدیہہ اور کچھ زبانی یاد ہوتی ہے مگر سامعین کو یہ پتہ نہیں لگتا کہ تقریر کا کونسا حصّہ فی البدیہہ تیار ہوا ہے اور کونسا حصّہ مقرر کو زبانی یاد ہے، جن لوگوں کو عام طور پر تقریریں کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ سامعین کے لئے کس قسم کی لفظی خوراک کی ضرورت

ہوتی ہے، ان کو بہت سی چیزیں زبانی یاد رہتی ہیں، جہاں کہیں وہ
مناسب موقع پاتے ہیں، اپنے زبانی یاد کیئے ہوئے مواد کو اس خوبصورتی
سے دُہرا دیتے ہیں کہ حاضرین محو ہو جاتے ہیں، اس طرح سے مقرر
سامعین پر حاوی ہو کر اپنے خیالات کی رَو میں ان کو بہالے جاتا ہے،
ایک کامیاب مقرر ہمیشہ یاد رکھتا ہے کہ تقریر کا مقصد محض اپنے خیالات
کا اظہار نہیں ہے، تقریر کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا ضروری ہے
کہ کیا حاضرین ہماری تقریر اطمینان سے سُنیں گے، ہمارے موضوع
سے ان کو دلچسپی اور ہمدردی ہو سکے گی اور کیا وہ ہمارے ہم خیال
بن جائیں گے، سامعین کو اپنا ہم خیال بنانا مقرر کا اوّلین اور آخری
مقصد ہے، اگر کوئی مقرر سامعین کو اپنا ہم خیال نہیں بنا سکا تو باوجود
ہزار خوبیوں کے اس کی تقریر ناکامیاب ہے، تقریر کرتے وقت
سامعین کی ذہنیت اور ان کے خیالات کو ہمیشہ سامنے رکھنا اور
اپنے آپ کو بالکل بھول جانا چاہیئے، مقرر کی شخصیت کو اس وقت
نمودار ہونا چاہیئے، جب وہ عوام کے ساتھ چلتے چلتے ان سے
آگے نکل جاتا ہے، گویا وہ اس کی قیادت کو تسلیم کر لیتے ہیں، مقرر کے
لئے یہی بہترین موقع ہے وہ جس طرف چاہے ان کو لے جائے اور
جو چاہے ان سے کام لے، جس وقت کسی خاص جذبے کے ماتحت
بہت سے لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں، چاہے وہ کسی طبقے سے
تعلّق رکھتے ہوں، ان کی ذہنیت بالکل بچّوں کی سی ہو جاتی ہے، اگر

مقرران کے دل کی بات کہے تو مارے خوشی کے اُچھل پڑتے ہیں، اور اگر کوئی بات ان کی طبیعت کے خلاف کہہ دے تو جھنجلاتے ہیں اور لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ قابل اور کامیاب مقرران کی نبض دیکھتا ہے، پہلے ان کے دل کی باتیں سُنا کران کو خوش کرتا ہے، من و تو کے فرق کو مٹا دیتا ہے، جب مجمع اس کے ڈھب پر آجاتا ہے، تو نہایت خوبصورتی سے وہ اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس گریز میں وہ ان کے جذبات کو اپنے خیالات کے ساتھ متفق کر کے انہیں اپنا ہم خیال بنا لیتا ہے۔

تعلیم نسواں

تعلیم نسواں کی اہمیت

کوئی قوم یا ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا، جب تک اس کے افراد اعلیٰ قابلیت کے مالک نہ ہوں، چونکہ انسانی گروہ مرد اور عورت سے مرکب ہے اور خدا تعالےٰ نے اس مرکب کے اجزا کو لازم و ملزوم ٹھہرایا ہے، اس لئے تہذیب و تمدن کی ترقی مرد اور عورت کی تعلیم کے بغیر ناممکن ہے، کسی کا خیال ہے مرد اور عورت تصویر انسانی کے دو رُخ ہیں، کوئی کہتا ہے زندگی کی گاڑی کے دو پہیئے ہیں اور بعض کے نزدیک گھر ایک سلطنت ہے، مرد جس کا حاکم ہے اور عورت اس کی وزیر، اگر مرد اور عورت تصویر انسانی کے دو رخ ہیں، تو دونوں رُخوں کو ایک جیسا خوبصورت ہونا چاہیئے، اگر وہ ایک گاڑی کے دو پہیئے ہیں تو یہ کیا کہ ایک تو ربڑ ٹائر ہے اور دوسرے پر لوہے کا ہال بھی نہیں، اگر مرد ہوم گورنمنٹ کا حاکم اور عورت وزیر ہے تو کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ حاکم بنیں تو ہر ممکن قابلیت کا ہونا لازمی قرار دیا جائے مگر عورت جو امور داخلی کو عملی جامہ پہنانے والی ہے، اس کے قوائے عقلی تعلیمی جلا سے مجلّا نہ ہوتے پائیں۔

عورت ناقص العقل کیوں ہے اکثر لوگ کہتے ہیں کہ عورتیں ناقص العقل ہیں اور ان کی عقل گدی میں ہوتی ہے اس لئے بڑے بڑے امور اور مہمات میں وہ دخل دینے کے ناقابل ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ اس کمزوری کے وجوہ کیا ہیں؟ آیئے ہم آپ کو بتائیں، جب سے دُنیا وجود میں آئی ہے عورت کو دیدہ و دانستہ تعلیم سے بے بہرہ رکھا اور پھر اس نرم و نازک ہستی کو ناقص العقل قرار دے دیا گیا، اگر اپنے جسم کے کسی عضو سے آپ کام نہ لیں تو تھوڑی مُدّت میں وہ بیکار ہو جاتا ہے بعینہٖ یہی حال عورت کا ہے، ان کے قوائے عقلیہ کو جلا۔ تعلیم سے چمکایا نہیں گیا اس لئے ان کی عقل سوائے ان کاموں کے جو انہیں دن رات پیش آتے ہیں، کام نہیں کرتی، جس سوسائٹی نے عورت سے سپاہیوں کا کام لینا فرض سمجھا ہے وہاں عورتوں نے نہایت بہادری اور جانفشانی سے سپاہیوں کے کام کئے ہیں اور مردوں کے برابر قربانیاں کی ہیں، بے شک عورتیں مردوں کے برابر کام نہیں کر سکتیں، فطرت نے سوسائٹی کا نظام قائم رکھنے کے لئے عورت کو خاص غرض و غایت کے لئے پیدا کیا ہے، اور ان کے فرائض مردوں کے کاموں سے ذرا مختلف مقرر کئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کے مخصوص کام ایسے ہیں جن کے لئے اعلیٰ تعلیم و تربیت کی اشد ضرورت ہے۔

ہم لوگ ہر وقت تو اس بات کی رٹ لگاتے رہتے ہیں کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا چاہیئے لیکن عورت جو ہماری زندگی کا جزو

لازم ہے اس کا غیر تعلیم یافتہ رہنا پسند کرتے ہیں، عورت مرد کی مشیر اور رازدار ہوتی ہے، اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ہماری شریک حیات و ممات بھی تعلیم کے فیضان سے بے بہرہ نہ ہو۔

تعطل ازدواج

وہ عورتیں جو علم کی روشنی سے محروم ہوتی ہیں جس گھر میں جاتی ہیں اس کو اپنی تاریکی سے تاریک بنا دیتی ہیں، پھوہڑ بد سلیقہ اور خدا جانے کیا کیا کہلاتی ہیں، دن رات ساس نندوں کے طعنے سنتی ہیں تعلیم یافتہ شوہروں کے دل سے اتر جاتی ہیں طرح طرح کے مصائب میں گرفتار رہتی ہیں اور اپنے متعلقین کی پریشانی کا باعث بنتی ہیں، وہ واقعات کی رو میں بہ جاتی ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اپنے ساتھ بہالیجاتی ہیں، چونکہ علم سے بے بہرہ ہوتی ہیں، اس لئے ہر قسم کا تدارک نہیں کرسکتیں، ناموافق حالات سے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں ننانوے فیصدی خاندان گھریلو زندگی کے لطف نہیں اٹھاتے۔ نتیجہ کے طور پر مرد اور عورتیں دونوں بیاہ شادی کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ رکھتے، اور راہبانہ زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہیں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ مرد تو اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ ہے، لیکن بیوی صاحبہ الف کے نام بے بھی نہیں جانتی، مرد جو کچھ چاہتا ہے عورت وہ مہیّا نہیں کر سکتی، شوہر اپنی بیوی کے خیالات بلند کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اپنے دماغ میں کسی نئے خیال کو جگہ دینا تو کجا اسے گزرنے

تک کا راستہ نہیں دیتی، مرد کی خواہش ہوتی ہے کہ گھر کی ہر چیز سلیقے اور قرینے سے رکھی ہو، جو مہم درپیش ہو اس میں عورت بھی برابر کی مدد کرے، لیکن عورت کی یہ حالت ہے کہ گھر میں چوہے قلابازیاں کھا رہے ہیں جس چیز کی ضرورت ہے پتہ نہیں چلتا کہاں پڑی ہے، اگر کسی بات میں مشورہ طلب کیا جاتے تو ہمیں کیا پتہ کا دلدوز فقرہ زبان پر ہے حفظان صحت کا کچھ پتہ نہیں، آئے دن کوئی نہ کوئی بیمار، اگر بچہ گود میں ہے تو اور بھی بُرا حال، نہ اپنی خبر نہ بچے کا ہوش، گھر کیا ہے کباڑیئے کی دُکان ہے، صفائی ستھرائی کی یہ حالت کہ گھوڑوں، گدھوں کے اصطبل بہتر ہوں گے۔ کہیں گُو موت پڑا ہے، کہیں کوڑے کے ڈھیر لگے ہیں، کوئی باہر کا آدمی آجائے تو دیکھ کر کیا کہے اور اپنے دل میں کیا خیال لے کر جائے، یہی وجہ ہے کہ بے پڑھی لکھی عورتیں تعلیم یافتہ مردوں کے دلوں میں گھر پیدا نہیں کر سکتیں، لاعلمی اور ناواقفیت سے نہ صرف ان کو اپنی زندگی وبال جان ہوتی ہے بلکہ مرد کی زندگی کا لطف اور ترقی کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے، گھر کی دلچسپیاں کم ہوتی جاتی ہیں، محض وضعداری کا پاس گھر کو سنبھالے رکھتا ہے۔ ایسے انمل جوڑوں میں اکثر اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور باہمی بدمزگی سے زندگی بے لطف ہو جاتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ شادی بیاہ سے پہلے عورت اور مرد کی تعلیم و تربیت کا مقابلہ اور موازنہ کر لیا جائے، تاکہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد کسی قسم کی

بے لطفی پیدا ہونے کا امکان نہ رہے۔

ہمارے ملک میں مردوں کی تعلیم کا تو عام چرچا ہے، لیکن عورتوں کی تعلیم کی طرف بہت کم لوگ متوجہ ہیں، ضرورت ہے کہ عورتوں کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ صرف کی جائے، تاکہ ہم خیال جوڑے پیدا ہوسکیں، اور کشمکشِ حیات کی جنگ میں وہ پہلو بہ پہلو کام کرسکیں، بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ عورتوں کی تعلیم کے لئے مردوں کی تعلیم کے ادارے قربان کر دینے چاہئیں، کیونکہ جب تک عورت تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ ہوگی اُس وقت تک بچوں کی تعلیم کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہیں ہوسکتا۔

تعلیم کیسی ہونی چاہیئے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورتوں کو کیسی تعلیم دینی چاہیئے، یہ تو مسلمہ امر ہے کہ عورتوں کی تعلیم مردوں کی تعلیم سے مختلف ہونی چاہیئے، فطرت نے عورت کو خاص مقاصد کے لئے پیدا کیا ہے، اس لئے ان کی تعلیم بھی ایسی ہی ہونی لازم ہے جو اُن کے اصلی جوہروں پر جلا کرے اور ان کی مخصوص صفات کو ضائع نہ ہونے دے، یاد رکھنا چاہیئے کہ عورت فطرتاً کمزور اور نازک ہے، وہ تن تنہا دُنیا کی سختیوں اور مصیبتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی، اس لئے عورت کی مخصوص کمزوریوں کو ملحوظ رکھ کر اسے ایسی تعلیم دینی چاہیئے جو عورت کے اس رشتہ تعاون کو خوشگوار اور مضبوط بنانے میں ممد ثابت ہو۔

عورتوں کی تعلیم کے نصاب کا تعین کرنے سے پہلے ہمیں دیکھ لینا چاہیئے کہ ہماری سوسائٹی میں عورتوں سے کیا کام لئے جاتے ہیں، جو تعلیم ان کاموں کو احسن طریقے سے انجام دینا سکھائیگی وہی تعلیم عورت کو مکمل اور کامیاب عورت بنا سکتی ہے، ہمارے ہاں عورتوں سے عام طور پر خانہ داری کا کام لیا جاتا ہے، اس لئے سب سے پہلے انہیں خانہ داری کے صحیح اصولوں سے واقفیت ہونی چاہیئے، حقیقتاً کوئی عورت خانہ داری کی قابلیت کے بغیر عورت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی، بچے پالنا، تیمارداری کرنا، کھانا پکانا، حفظان صحت کے ابتدائی اصولوں سے کما حقہٗ واقف ہونا ہر عورت کا فرض ہے، اس کے علاوہ اس کی تعلیم کم از کم اتنی ضرور ہونی چاہیئے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کی دیکھ بھال کر سکے، اور اپنے عزیزوں کو خط پتر لکھنے کے لئے دوسروں کی محتاج نہ رہے، حساب دانی کی بھی کم و بیش ضرورت ہے تاکہ گھر کی آمد اور خرچ کا باقاعدہ حساب رکھا جا سکے، جن عورتوں کی اخلاقی حالت خراب ہوتی ہے اس گھر کے بچوں کے اخلاق کبھی اچھے نہیں ہو سکتے، ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے جسقدر کسی قوم میں عورتیں باشعور اور سلیقہ مند ہونگی، وہ قوم اسی قدر متمدن اور شائستہ کہلائیگی، گویا عورتوں کو تعلیم دینا پوری قوم کو تعلیم دینا ہے۔ ابتداءً بچے اپنی ماؤں کی نگرانی میں پلتے ہیں، جو خصائص ماؤں میں ہوتے ہیں وُہی بچوں میں پیدا ہو جاتے ہیں، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ

اوّل تو مائیں خود اپنی اولاد کو دودھ پلائیں اگر کسی سبب سے ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ایسی انّا تلاش کی جائے جس میں کوئی اخلاقی عیب نہ ہو۔

ہمارے ملک میں اس وقت تک عورتوں اور مردوں کو تقریباً ایک ہی قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور یہ بہت بڑی غلطی ہے، موجودہ تعلیم عورتوں کی ضرورت کے مطابق نہیں، یہ مسلّمہ امر ہے کہ عورتیں وہ کام نہیں کرتیں جو مرد کرتے ہیں، پھر ایسی تعلیم جو مردوں کے لیئے مفید نہیں عورتوں کے لئے کیسے مفید ہو سکتی ہے، موجودہ تعلیم نسواں سے سوسائٹی کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، سب سے بڑا نقصان تو یہی ہے کہ شادی کے بعد عورتوں کی اعلیٰ تعلیم اکثر اکارت جاتی ہے۔ کیونکہ وہ مخصوص رسم ورواج کی وجہ سے مردوں کے دوش بدوش کام نہیں کر سکتیں۔

عورتوں کے لئے ہمیں ایسا نصاب مرتب کرنا چاہیئے کہ وہ نہایت کامیاب زندگی بسر کر سکیں، سب سے پہلے ان کے لیئے خانہ داری کی تعلیم ہونی چاہیئے جس میں خاص طور پر کھانا پکانے، سینے پرونے، حفظانِ صحت اور تیمارداری کی تعلیم دی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ کوئی ایسی گھریلو صنعت یا دستکاری بھی سکھائی جائے، جو وقت ضرورت گزر اوقات کا ذریعہ بن سکتی ہو۔

(ہم یہ نہیں کہتے کہ عورتوں کو اعلیٰ تعلیم نہیں دینی چاہیئے، ابتدائی

تعلیم جو عورت کی مخصوص صفات قائم رکھنے کے لئے لازم ہے، وہ
یہی خانہ داری کی تعلیم ہے) اب جو صاحب استطاعت ہیں وہ اگر
چاہیں تو اپنی لڑکیوں کو شوق سے اعلےٰ تعلیم دلوائیں، ڈاکٹری پڑھائیں،
نرسنگ سکھلائیں یا کوئی اور مناسب تعلیم دلوائیں۔

معلمی کی تعلیم | ماہرین تعلیم نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے، کہ ابتدائی تعلیم
عورتوں کے سپرد کرنی چاہیئے، مردوں کی نسبت عورتیں بچوں سے
زیادہ پیار رکھتی ہیں، اور ان کے عادات وخصائل سے کماحقہٗ
واقف ہوتی ہیں، نیز بچّے بھی مردوں سے زیادہ عورتوں سے مانوس
ہوتے ہیں، عورتوں کی تعلیم وتربیت کا اثر ان کے دل و دماغ پر
بہت اچھا پڑتا ہے، اس کے علاوہ عورتوں کے پاک اور عمدہ
کیرکٹر کا پرتو بچّوں کے کیرکٹر بنانے میں غیر معمولی مدد دے سکتا ہے،
کیرکٹر کی مضبوطی اور پاکبازی تہذیب وتمدّن کی ترقی کے لئے نہایت
ضروری ہے، اس معاملے میں یہ احتیاط بہت ضروری ہے کہ بچّوں
کو تنگ نظر اور توہم پرست ماؤں کی گود میں سے نکال کر ان کو اسی قسم
کی اُستانیوں کے سپرد نہ کیا جائے، تنگ نظر اُستانیوں کے زیر اثر
رہ کر وہ بھی تنگ نظر توہم پرست اور بُزدل بن جاتے ہیں۔

(ہمارے ملک میں ابھی لڑکیوں اور لڑکوں کی مخلوط ابتدائی تعلیم
کا خیال زیادہ مقبول نہیں ہوا، تعلیم کی مقبولیّت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا
ہے کہ چند سالوں میں مخلوط ابتدائی تعلیم مقبولیّت حاصل کرلے گی۔

اور وہ رسمی اور رواجی بندشیں جو اس طرز تعلیم کو اختیار کرنے میں حائل ہیں بہت جلد دُور ہو جائیں گی ۔

تعلیم نسواں کا زبان پر اثر | چونکہ عورت قدرت کی صنعت کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے ، اس لئے اس کی رفتار و گفتار اور افعال و اطوار بہت دلپذیر ہوتے ہیں ، عورت کی پاکیزگی اور نفاست ماحول میں بھی شستگی اور عمدگی پیدا کرتی ہے ، وہ اپنی قدرتی ساخت کے مطابق نرم و نازک زبان بولتی اور ویسی ہی چیزوں کو پسند کرتی ہے ، اس کی قدرتی نفاست سے زبان میں بھی نفاست اور نرمی پیدا ہو کر کرختگی دُور ہوتی ہے ، مغلیہ سلطنت کے آخری دَور میں قلعہ معلّےٰ کی زبان بڑی مستند اور شُستہ خیال کی جاتی تھی ، اس کی وجہ یہ تھی کہ قلعے کی مستورات زیورِ علم سے آراستہ تھیں ، ہر موضوع پر گفتگو کر سکتی تھیں ، ضرورت کے مطابق دلپذیر اور دلنشیں محاورے گھڑتی تھیں ۔ عربی ، فارسی ، ہندی ، سنسکرت وغیرہ کے الفاظ میں سے اچھّے اچھّے ، ہلکے ہلکے اور نازک نازک الفاظ اپنے استعمال کے لئے نکال لیتی تھیں ، اور ان کو بات بات میں نہایت خوبصورتی سے استعمال کرتی تھیں ، جو الفاظ اور محاورات ان کی زبان سے نکلتے تھے قبول کی سند پاتے اور فصیح کہلاتے تھے ۔

توہمات اور رسم و رواج | اِس بات کو ہر شخص تسلیم کریگا کہ غیر تعلیم یافتہ

عورتیں عام طور پر بہت زیادہ توہم پرست ہوتی ہیں ان کے توہمات کو دُور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انہیں تعلیم دی جائے تاکہ وہ بے معنی توہمات سے مُلک و قوم کی ترقی کے راستے میں رُکاوٹ پیدا نہ کریں۔ ہر خاندان میں مختلف قسم کی ریتیں رسمیں عورتوں کی وجہ سے وجود میں آتی اور ان کی شدّت سے پابندیاں کی جاتی ہیں، ورنہ مرد کسی ریت رسم کی پروا نہیں کرتے، بہت سے ترقی یافتہ اصول اسی وجہ سے عمومیّت اور مقبولیّت حاصل نہیں کر سکتے کہ ہماری بے پڑھی لکھی عورتیں محض اپنے توہمات کی بدولت ان کو خود قبول کرتی اور نہ مردوں کو قبول کرنے دیتی ہیں، تعلیم نسواں کی مقبولیّت میں بھی رسم و رواج نے بہت رُکاوٹیں پیدا کی ہیں، ورنہ تعلیم نسواں جیسی ضروری چیز سے اتنی بے پروائی نہ برتی جاتی۔

جن گھرانوں میں تعلیم کی روشنی پہنچ جاتی ہے، وہاں آپ ہی آپ بہت سے نقصان دہ اور مضحکہ خیز رسم و رواج ختم ہو جاتے ہیں، گویا تعلیم کا جن توہمات کے بھوتوں کو لاتیں مار مار کر نکال دیتا ہے، ہندوستان میں تعلیم نسواں سے بہترین فائدہ یہی پہنچا ہے کہ فضول رسموں کا دن بدن خاتمہ ہو رہا ہے، اور مفید قواعد و ضوابط اُنکی جگہ لے رہے ہیں، بیاہ شادیوں، تعویذ گنڈوں اور پیر پرستیوں وغیرہ میں جس قدر روپیہ بیکار ضائع کیا جاتا تھا، اب مفید کاموں میں صرف ہوتا ہے، پہلے بیاہ شادیوں کے موقع پر بڑی بڑی رقمیں

قرض لے کر رسوم عروسی ادا کی جاتی تھیں، اگر ان میں کسی قسم کی کمی رہ جاتی تو برادری میں ناک کٹ جاتی تھی، اور اکثر خاندان عمر بھر کے لئے طعن و تشنیع کا نشانہ بن جاتے تھے، پڑھے لکھے گھروں میں اب ان باتوں کی پروا بھی نہیں کی جاتی، جس قدر روپیہ فضول باتوں پر صرف ہوتا تھا وہ لڑکی کے نام بنک میں جمع کر دیا جاتا ہے، اس سے بہتر یہ رواج پیدا ہو رہا ہے کہ جو کچھ لڑکی کو دینا ہو وہ اس کی تعلیم پر خرچ کر دیا جاتا ہے، تاکہ میاں بیوی دونوں مل کر کمائیں اور آرام کی زندگی بسر کریں، یہ حالات اس بات کی دلیل ہیں کہ ہمارے ملک میں تعلیم نسواں کی مقبولیت سے ایک خوشگوار دور کا آغاز ہونے والا ہے۔

تعلیم نسواں کیونکر مقبول ہو سکتی ہے

تعلیم نسواں کی جس قدر ضرورت ہمارے ملک میں ہے اتنی ضرورت دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں، لیکن باوجود مسلسل کوششوں کے تعلیم نسواں ابھی تک عوام میں مقبولیت تام حاصل نہیں کر سکی، اس کی وجہ یہ ہے کہ پڑھی لکھی عورتیں ازدواجی زندگی میں پڑتے ہی مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتی ہیں اور اکثر برے نتائج بر آمد ہوتے ہیں، ان برے نتائج سے لوگ تعلیم نسواں سے بدظن ہو جاتے ہیں، اگر لڑکیوں کے لئے ابتدائی نصاب ایسا مقرر کر دیا جائے جو نسوانی زندگی کو چار چاند لگائے، خانہ داری سے دلچسپی پیدا کرے اور ان نسوانی صفات پر

جلا کر دے جو عورتوں کے لئے باعثِ فخر ہو سکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مردانہ تعلیم کی نسبت زنانہ تعلیم پر زیادہ توجہ صرف نہ کی جائے۔
تعلیم یافتہ عورتوں کے متعلق یہ عام شکایت ہے کہ وہ تعلیم حاصل کر کے فضول خرچ اور آزاد ہو جاتی ہیں اور چراغ خانہ سے شمع محفل بن جاتی ہیں، اگر یہ اعتراض کسی حد تک درست ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ نصاب تعلیم یافتہ عورتوں کے معیار زندگی کو عام عورتوں سے بہت زیادہ بلند کر کے اُنہیں بیرونی دُنیا کی طرف متوجہ کر دیتا ہے، ان کی خانگی زندگی عام عورتوں سے مختلف ہو جاتی ہے، اور عوام کی تنگ نظری ان کو ملامت کا نشانہ بنا لیتی ہے۔)
(امید ہے کہ ابتدائی جبری تعلیم سے تعلیم نسواں کو مزید ترقی اور مقبولیت حاصل ہو گی نیز حکومت اور قومی اداروں کی طرف سے اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آسانیاں بہم پہنچانا اور ہونہار لڑکیوں کو وظیفے دے کر غیر ممالک میں بھیجنا، پھر ان تعلیم یافتہ لڑکیوں کے لئے عمدہ روزگار مہیّا کرنا تعلیم نسواں کی توسیع میں ضرور مددگار ثابت ہو گا، پھر بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ تعلیم نسواں کی ترویج و توسیع میں مزید کوششیں صرف کی جائیں، کیونکہ کوئی ملک اس وقت تک ترقی کے مدارج آسانی سے طے نہیں کر سکتا، جب تک کہ اس کی عورتیں

تعلیم یافتہ نہ ہوں۔ آپ خود غور کرسکتے ہیں کہ ماؤں کی تربیت
کا اثر ان کی اولاد کی ترقی میں کس قدر ممد و معاون ہوتا ہے،
جس ملک کی غیر تعلیم یافتہ مائیں ملک کے لئے باعث فخر سپوت
پیدا کرسکتی ہیں، اگر وہ تعلیم کی دولت سے بھی مالا مال ہوں تو
کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایسی اولاد پیدا نہ کرسکیں جن کی قابلیت
اور لیاقت سے تمام دنیا فائدہ اٹھائے اور ان کی خوشبو
سے اطراف عالم مہک اٹھیں۔

کفایت شعاری

۹ | کفایت شعاری کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ فارغ البالی اور خوشحالی کے زمانے میں ہم پیش بینی سے کام لیں اور ہمیشہ اپنی آمدنی کی وسعت اور ذرائع کو مدنظر رکھ اپنے اخراجات کو آمدنی کے ساتھ ساتھ گھٹاتے بڑھاتے رہیں نیز اپنے سرمایہ کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر مفید کاموں میں صرف کریں، دُنیا کے انقلابات، دُکھ بیماری اور نامعلوم ضرورتوں کے خیال کو ہمیشہ سامنے رکھیں، اور ان لوگوں کی عبرتناک مثالوں سے درس عبرت حاصل کریں جو کبھی صدر نشین تھے، مگر اپنی فضول خرچی کی بدولت تمام دولت کھوکر خاک نشین ہوگئے، ان لوگوں کے حالات کو مدِّنظر رکھنا بھی مفید ہے جو کبھی اتنے فراخ دست تھے کہ فیاضی میں حاتم طائی کا مقابلہ کرتے تھے مگر زمانے کی گردش اور حزم و احتیاط کے فقدان نے ان کو تنگ دست اور دوسروں کا دست نگر بنا دیا، ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے ان کی امارت اور سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا اور ان سے کونسی ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں کہ آج وہ کسی مشکل کشا اور مددگار کی تلاش میں سرگرداں اور

پریشان ہیں۔

اگر نظرِ غائر سے ان حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں میں کفایت شعاری نہ تھی، وہ اپنے سرمایہ کو ایسے غیر مفید کاموں میں بے دریغ صرف کرتے تھے، جن میں ایک مرتبہ روپیہ صرف ہو کر دوبارہ ان کے ہاتھ میں واپس نہ آتا تھا، ان کے خزانے روپیہ اُگلتے تھے، نگلتے نہ تھے، اس لئے بہت کم مُدّت میں ان کے خزانوں کے پیٹ خالی ہو گئے، اور وہ لوگ ان کا ساتھ چھوڑ گئے جو رات دن ان کا مالش کھاتے اور آگے پیچھے پھرتے تھے ان کی فضول خرچی سے یہ لوگ آقا بن گئے، اور خزانوں والے غیر کفایت شعار لوگ لونڈی غلام کے درجے کو پہنچ گئے۔

کفایت شعاری بڑی دولت ہے

کسی نے خوب کہا ہے۔ "کفایت شعاری ہی دولتمندی ہے۔" بیشک وہی شخص دولتمند ہو سکتا ہے جو کفایت شعار ہوتا ہے، اور وہی قوم دولتمند کہلاتی ہے جس کے افراد کفایت شعار ہوتے ہیں، برخلاف اس کے جو لوگ فضول خرچ ہوتے ہیں وہ کبھی دولتمند اور مالدار نہیں ہو سکتے، ان کے اخراجات پورا کرنے کے لئے قارون کے خزانے بھی ناکافی ہوتے ہیں، باوجود دولت کی فراوانی اور روپے کی کثرت کے ان کی ضرورتیں کبھی پوری نہیں ہوتیں جو قومیں کفایت شعاری کے وصف سے متصف ہوں ان کا مستقبل درخشندہ ہوتا ہے، ترقی اور مرادمندی ان کے قدم لیتی ہے،

دولت کی تکثیر کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہوتا ہے، یہی وہ قومیں ہیں جو متمدن اور مہذب کہلاتی ہیں، ان کے کارنامے سنہری حروف میں لکھے جاتے ہیں، جن اقوام میں کفایت شعار لوگ نہیں ہوتے، وہ ترقی کی دوڑ میں ہمیشہ پیچھے رہتی ہیں، ان کا کوئی فرد رفاہ عام کے کاموں کی طرف توجہ نہیں کرتا بلکہ نادار طبقہ انحطاط پذیر ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ ترقی اور عروج کا مادہ ان اقوام میں سے ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتا ہے۔

کوئی حکومت رعایا کی امداد کے بغیر رفاہ عام کے کاموں پر کافی روپیہ صرف نہیں کر سکتی، کفایت شعاری کی عادات نہ ہونے کے باعث رعایا میں سے کسی کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ضروریات کو قربان کر کے اس طرف توجہ کرے، اس لئے رفاہ عام کے کام ہمیشہ پس پشت پڑے رہتے ہیں، جن ملکوں اور قوموں میں کفایت شعار لوگ ہوتے ہیں، وہ اپنی ضرورت سے زیادہ روپیہ پس انداز کرتے رہتے ہیں، پس اندازی کی بدولت وہ لاکھوں اور کروڑوں روپے کے مالک بن جاتے ہیں، پھر اس روپے کو تجارت و صنعت میں لگا کر لکھوکھا روپے کا فائدہ اٹھاتے ہیں، گویا ان کی کفایت شعاری کی بدولت خلق خدا کو بھی روزگار ملتا ہے، یہی لکھ پتی اور کروڑپتی نہایت دریا دلی سے لاکھوں اور کروڑوں روپیہ رفاہ عام کے کاموں پر صرف کرتے ہیں جن سے ان کا اپنا

نام روشن ہوتا ہے اور جس قوم سے وہ تعلق رکھتے ہیں اس کی شہرت ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کے مُلک اور شہر کے باشندے بھی ان کی فیاضی کی بدولت فخر حاصل کرتے ہیں۔

کفایت شعاری کے زرّین اصول

کفایت شعاری کا سب سے پہلا اور آخری زرّیں اصول یہ ہے کہ جتنی چادر دیکھو اتنے پاؤں پھیلاؤ، ہر عاقل و بالغ انسان کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی آمدنی اور خرچ کو ملحوظ رکھے اور کبھی اعتدال اور احتیاط کے اصول سے تجاوز نہ کرے، کسی بزرگ کا قول ہے، (۱) وہ شخص یقیناً عقلمند ہے جو اپنی آمدنی سے کم خرچ کرتا ہے، اور نامعلوم ضرورتوں کے لئے کچھ نہ کچھ پس انداز کرتا رہتا ہے، (۲) وہ شخص پرلے درجے کا بیوقوف ہے جو اپنی آمدنی سے زیادہ صرف کرتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ وہ کیا کر رہا ہے، (۳) اور وہ شخص عقلمند ہے نہ بیوقوف، جو نہ تو کچھ پس انداز کرتا ہے اور نہ اپنی آمدنی سے زیادہ صرف کرتا ہے، گویا جتنی چادر دیکھتا ہے اُتنے ہی پاؤں پھیلاتا ہے۔

کفایت شعار بننے کا ایک گُر یہ بھی ہے کہ اپنی آمد اور خرچ کا باقاعدہ حساب رکھا جائے، اس سے فائدہ یہ ہے کہ ضروری اور غیر ضروری اخراجات کا پتہ چلتا رہتا ہے، اور کسی نہ کسی وقت یہ خیال ضرور آجاتا ہے کہ فلاں چیز پر ہم نے بیکار روپیہ خرچ کیا اور فلاں چیز کو احتیاط سے استعمال نہ کرنے کے باعث اس پر دوبارہ روپیہ صرف

کرنا پڑا، بس یہی خیال آہستہ آہستہ انسان کو کفایت شعار بنا دیتا ہے اور فضول خرچی سے روکتا ہے، اس کے ساتھ اگر ہر مہینے کے شروع میں آمدنی کو ملحوظ رکھ کر اخراجات اور ضروریات کا ایک خاکہ تیار کر لیا جائے تو بہت سی غیر ضروری مدّوں کو روک کر ضروری مدّوں پر خرچ کرنے کے لئے پہلے سے بندوبست ہو سکتا ہے، ایسا کرنے سے انسان بہت سی پریشانیوں سے بچ جاتا ہے، سرکاری دفاتر میں مالی سال کے شروع میں اخراجات اور آمدنی کا خاکہ تیار کر لیا جاتا ہے، حکومت اس پر بحث و تمحیص سُننے کے بعد اس کی منظوری دیدیتی ہے، اگر اس قسم کے "بجٹ" ہر خاندان اور جماعت میں تیار ہوں تو ان سے خاطر خواہ فوائد مرتب ہو سکتے ہیں۔

کیا کفایت شعاری کنجوسی ہے

بعض لوگ کفایت شعاری کو کنجوسی سے تعبیر کرتے ہیں، بیشک اگر کفایت شعاری بخل اور کنجوسی کی حد سے جا ملے تو وہ مذموم ہے، ایک بخیل شخص ناگزیر اخراجات پر بھی پیسہ صرف نہیں کرتا وہ روپیہ جوڑنے کے لئے ہر وقت ننانوے کے پھیر میں پھنسا رہتا ہے، کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس کے پاس روپیہ تو موجود ہوتا ہے، لیکن وہ اپنی جائز ضرورت کو بھی پُورا نہیں کر سکتا، اس کی طبیعت میں لالچ اور طمع جیسی مذموم صفتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اس کا بس نہیں چلتا ورنہ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دُنیا زمانے کی دولت اپنے پاس جمع کر لے، اگر اس کے پاس کہیں سے

بے اندازہ دولت بھی آجائے تو اس کی نیت نہیں بھرتی، لالچ کی آگ ہر وقت اس کے دل و دماغ میں شعلہ زن رہتی ہے، لطف یہ ہے کہ دولت کی فراوانی سے ایسے لوگوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا، کیونکہ یہ آگ دولت میں اضافہ ہونے سے اور زیادہ بھڑک اٹھتی ہے، لالچ اور کنجوسی ان کے اخلاقی فضائل کو غیر محمود بنا دیتی ہے، سوسائٹی کو بھی ایسے لوگوں کے وجود سے بہت کافی نقصان پہنچتا ہے، جس قدر روپیہ ان کے قبضے میں جاتا ہے، پھر ان کے جیتے جی اس کو دُنیا کی ہوا نہیں لگتی، ایسا روپیہ جو کام نہ آئے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، کسی ملک یا قوم کی ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کی دولت مفید اور منفعت بخش کاموں میں لگتی اور نکلتی رہے، لیکن کنجوس کا روپیہ سوائے شخصی اطمینان کے اور کچھ فائدہ نہیں دیتا، اس لئے اس قسم کے لوگوں کا وجود ملک و قوم کی ترقی کے راستے میں زبردست رُکاوٹ بن جاتا ہے۔

کفایت شعاری قناعت سکھاتی ہے

کفایت شعاری سے انسان کو قناعت جیسی دولت حاصل ہوتی ہے، قناعت ضرورتوں کو آمدنی سے آگے بڑھنے نہیں دیتی اور آمدنی میں ناجائز طریقوں سے اضافہ کرنے سے روکتی ہے ذاتی ضرورتیں جب آمدنی کے حدود میں محدود ہو جائیں تو انسان کشاکش حیات کے تفکرات سے بے نیاز ہو کر مقصد تخلیق کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے، گویا کفایت شعار اور قناعت لوگ ہی

سوسائٹی اور ملک کے لئے برکت کا باعث، اور کاہل و سست افراد جو دوسروں کی دولت پر نظر رکھتے ہیں قومی زوال اور تہذیبی انحطاط کا موجب ہیں۔

کفایت شعاری قومی عروج کا زینہ ہے

کفایت شعاری سے قوموں کے عروج و زوال پر بھی اثر پڑتا ہے، جو قومیں اپنے روپے کو کفایت شعاری سے صرف کرتی ہیں اور بیجا روپیہ ضائع نہیں کرتیں ان کے پاس فوری ضرورتوں کو رفع کرنے کے لئے کافی روپیہ موجود رہتا ہے، جس حکومت کے پاس جتنی زیادہ دولت ہوتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ مضبوط اور مستحکم کہلاتی ہے، اگر کوئی بیرونی حملہ آور تکلیف کا باعث ہو تو روپے کی بدولت حفاظتی تدابیر نہایت آسانی سے اختیار کی جا سکتی ہیں، اندرونی فسادات کا انسداد اور انتظام بھی روپے ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے، جن ملکوں کے پاس روپیہ نہیں ہوتا ان کی اندرونی اور بیرونی حالت ہمیشہ ڈانواں ڈول رہتی ہے، اس کے علاوہ جن لوگوں کے پاس روپیہ ہوتا ہے اُن کی ہمّتیں بلند، قلب مطمئن اور ارادے مستحکم ہوتے ہیں، مالدار ملک میں تجارت، زراعت اور صنعت دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی ہے، رفاہ عام کے کاموں میں بھی خُوب روپیہ صرف ہوتا ہے، اور آخر کار مالدار ملک تہذیب و شائستگی کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔

جن قوموں میں کفایت شعاری کا وصف نہیں ہوتا، ان میں داغی

انحطاط کے ساتھ ساتھ قومی تنزّل بھی بڑھتا جاتا ہے، اگر اپنے گھرانے کا عروج، قوم کی ترقی، انفرادی فضیلت منظور ہے تو بچوں کو کفایت شعاری کی عادات بچپن ہی سے ڈالنی چاہئیں، جو عادات بچپن میں پڑ جاتی ہیں وہ جیتے جی قائم رہتی ہیں، چاہے کسی حیثیّت کا آدمی ہو، لیکن کفایت شعاری کی عادت ضرور ہونی چاہیئے، کیونکہ موت، زندگی، دُکھ، بیماری اور اچھّے بُرے وقت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا، اگر کچھ پاس جمع ہو تو وہی بُرے وقت میں کام آتا ہے، مثل مشہور ہے بُرے وقت میں بُرا بیٹا اور کھوٹا پیسہ بھی کچھ نہ کچھ کام دے ہی جاتا ہے۔

کفایت شعاری اور فارغ البالی میں تدریجی فرق ہے، جن لوگوں میں کفایت شعاری کا وصف نہیں ہوتا وہ کبھی فارغ البال نہیں ہو سکتے، کفایت شعاری سے جہاں انسان کو رُوحانی خوشی اور اطمینانِ دِلی حاصل ہوتا ہے، وہاں ہمتیں بھی بلند ہوتی ہیں، فضول خرچی کی عادات انسان کو کاہل بنا دیتی ہیں، اور زندگی کا لطف کھو دیتی ہیں، زندگی اجیرن اور بیکار معلوم ہوتی ہے، جو کچھ کمایا وہ اُڑایا، اگر کوئی غیر معمولی ضرورت آپڑی، تو اب بیٹھے بغلیں جھانک رہے ہیں کہ یا اللہ کیا کریں، کسی وجہ سے بیکار ہو گئے تو ایک وقت سے دوسرے وقت کھانے کو نہیں، اگر خوددار اور شریف ہیں تو پیٹ سے فاقے مگر طبیعت خوش، اپنی حالت کو چھپاتے ہُوئے ہیں، اگر یہ باتیں نہیں، تو پھر بھیک مانگتے پھرتے ہیں، ہر ایک کے آگے اپنی مصیبت کا

رونا روتے ہیں، در در مارے مارے پھرتے ہیں، گالیاں کھاتے ہیں، گھُڑکیاں سُنتے ہیں، جن لوگوں نے " کوڑی نہ رکھ کفن کو، جس نے دیا ہے تن کو، دیگا وہی کفن کو"، اپنا اصول زندگی بنا لیا ہے، ان کے لئے محنت کر کے کمانے اور نہ کمانے کا نتیجہ ایک ہی ہے، یعنی کچھ بھی نہیں عقلمندی اس میں ہے کہ غیر اختیاری اور نا معلوم ضرورتوں کے لئے کچھ نہ کچھ جمع کر لیا جائے اور موجودہ ضرورتوں کو آئندہ پر ٹالا جائے، کیونکہ کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ آئندہ زمانہ میں کونسی ضرورتیں پیش آجائیں گی، جو لوگ پس انداز نہیں کرتے، اُن کے گھروں میں اس وقت تک خوب عیش رہتا ہے، جب تک وہ کماتے رہتے ہیں، جب بیکار ہوئے، یا مر گئے تو اولاد بھیک مانگتی پھرتی ہے، گویا بنی بنائی خاندانی عزّت اور عظمت آنکھوں دیکھتے خاک میں مل جاتی ہے، کفایت شعاری کے نہ ہونے کی وجہ سے سینکڑوں گھر ہر روز بے چراغ اور برباد ہوتے رہتے ہیں، ان حالات کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ کفایت شعاری کی عادت ڈالی جائے۔

ضرورتوں کو روکنا کفایت شعاری ہے

کفایت شعار بننے کے لئے اپنی ضرورتوں کو روکنا نہایت ضروری ہے، ہاں ایسی ضروریات زندگی کو روکنا سخت غلطی ہے جنہیں پُورا کئے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا واضح رہے کہ انسان کی اصلی ضرورتیں بہت ہی کم ہیں! لیکن ان میں بڑھنے کی قوّت بہت زیادہ ہے، خدا نے دُنیا کی تمام چیزیں انسان کی

ضرورتیں پورا کرنے کے لئے بنائی ہیں، اور ہر چیز انسان کے کسی نہ کسی مصرف کی ہے، لیکن پھر بھی ہر ضرورت کو پورا کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہم اس کے بغیر گزارہ کر سکتے ہیں یا نہیں، اگر کسی ایسی ضرورت پر روپیہ صرف کیا جائے، جس کے بغیر اچھی طرح زندگی بسر ہو سکتی ہے، تو اس پر روپیہ صرف کرنا کفایت شعاری کے خلاف ہے، جس قدر انسان تکلفات میں پڑتا ہے اسی قدر اس کی ضروریات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سادگی کو مدّنظر رکھا جائے، ایک کفایت شعار کا قول ہے "کسی چیز کو دیکھ کر اس کی ضرورت پیدا نہ کرو، پہلے اپنی ضرورت کو دیکھو، پھر اس چیز پر نظر اُٹھاؤ۔" بعض لوگوں کا قاعدہ ہے، ہر مہینے کے شروع میں جب ان کی جیب میں پیسے آتے ہیں، تو بازار میں خرید و فروخت کرنے کے لئے نکل جاتے ہیں، ان کو اپنی چند ایک ضرورتوں کے سوا قطعی معلوم نہیں ہوتا کہ کیا خریدنا ہے، دُکان دُکان گھوم کر وہ ہر چیز کو دیکھتے ہیں، جو چیز پسند آتی ہے، وہ خرید لیتے ہیں، یہ طریقہ دیتی ضرورتیں بڑھانے کا بدترین طریقہ ہے، ایسی عادات کی بدولت ہمیشہ آمدنی سے خرچ زائد رہتا ہے، کیونکہ ہر مہینے میں چند ایک نئی چیزیں ضرور گھر میں آجاتی ہیں، پھر ان چیزوں کے ساتھ کئی اور چیزوں کا خریدنا بھی لازم ہو جاتا ہے، اس طرح سے

طرز معاشرت بلند ہونے لگتا ہے، مگر آمدنی کے وسائل اُتنے ہی رہتے ہیں، ایسے حالات میں قرض لے کر گذارہ کرنا پڑتا ہے قرض سے خودداری، آزادی اور دیانتداری کے جوہر زنگ آلود ہو کر گھر کی خوشی اور اطمینان قلب جیسی دولت برباد ہو جاتی ہے، شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے ؎

آنکہ شیراں راکند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

کفایت شعاری عورتوں کا زیور ہے

ہر خاندان کی ترقی اور تنزل میں کفایت شعاری کو بہت دخل ہے، جس گھر میں میاں بیوی دونوں فضول خرچ ہوتے ہیں، اُس پر ہر وقت تباہی منڈلاتی رہتی ہے، جن لوگوں کو خدا نے دولت فراوانی سے دی ہے، انکو بھی کفایت شعاری کا خیال رکھنا چاہیئے، قطرہ قطرہ دریا اور دانہ دانہ انبار بن جاتا ہے اور بے دریغ خرچ کرنے سے تو قارون کے خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں، فضول خرچی سے تباہی زیادہ جلدی اور تیز رفتاری سے آتی ہے، خاص طور پر ایسے حالات میں جب کہ خرچ ہی خرچ ہو اور آمدنی کے وسائل نہ ہوں یا نسبتاً کم ہوں، اسی لئے شادی سے پہلے، ہونے والی بیوی کے متعلق یہ ضرور معلوم کر لینا چاہیئے کہ وہ فضول خرچ ہے یا کفایت شعار، جس طریقے سے ہماری سوسائٹی میں شادیاں ہوتی ہیں، اندرونی حالات اور خصائل کا پتہ

چلنا ذرا مشکل کام ہے، لیکن تیز نظر اور عقلمند انسان کسی گھر کے رنگ ڈھنگ، کپڑے لتے اور کھانے پینے کے طور طریقوں سے گھر والوں کی ضروریات اور معیار زندگی کا کچھ نہ کچھ ضرور اندازہ لگا سکتا ہے، جن لوگوں کا میلان عمدہ کھانے، نمائشی لباس اور ظاہری بناؤ سنگار کی طرف زیادہ ہو، وہ لازماً فضول خرچ ہوتے ہیں۔

وُہ خاندان جن کی عورتیں کفایت شعار نہیں ہوتیں ہمیشہ مالی مشکلات میں مبتلا رہتے ہیں، گھر میں خوشی کبھی نام کو نہیں آتی، بلکہ پہلی تاریخ کیا آتی ہے، لڑائی کا پیغام لاتی ہے، بیوی پلنگ پر چادر اوڑھے پڑی ہیں، میاں الگ کمرے میں سر پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں، اگر میاں اپنے بل ادا نہ کریں تو آئندہ حساب کیسے چلے، بازار میں سے کیونکر گزریں، اور اگر بیوی اپنے قرضے نہ چکائیں تو قرضخواہ کب دم لینے دیں، غرض کسی کو آج سے کل پر ٹالتے ہیں، کسی کو تھوڑا بہت دے کر، بقایا جلد ادا کرنے کا وعدہ کرتے ہیں، کوئی قرضخواہ نالش داغ دیتا ہے تو کچہریوں میں مارے مارے پھرتے ہیں، ایسے گھروں کی ظاہرا ٹیپ ٹاپ دیکھو تو ہر چیز آسودہ حالی کی دلیل، لیکن ہر کسی کا دل اندر سے زخمی، رُواں رُواں قرضدار، بوٹی بوٹی قرضے میں بندھی ہوئی، پھر بھی پیٹ سے فاقے اور طبیعت خوش۔

کفایت شعاری سیکھو سب سے پہلے والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے

بچوّں میں بچپن سے کفایت شعاری کی عادات پیدا کریں، اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بچوّں کا روزانہ خرچ مقرر کر دیا جائے، اس میں سے ہر روز کچھ جمع کر دیں، کچھ کھانے پینے کو دیدیں، ہر تیسرے چوتھے دن انہیں بتلاتے رہیں کہ آج تمہارے اتنے پیسے جمع ہو گئے، اس کے ساتھ انہیں یہ بھی لالچ دیتے جائیں کہ جب تمہارے اتنے روپے جمع ہو جائینگے تو فلاں اچھی سی چیز لے کر دینگے، بچہ اس لالچ میں اگر پس انداز کرنا سیکھ جاتا ہے، عام طور پر بچوّں کو مختلف تہواروں پر کچھ نہ کچھ بڑوں کی طرف سے ملتا رہتا ہے، اس طرح روزانہ کے پیسے اور تہواروں کے انعامات مل کر اچھی خاصی رقم بن سکتی ہے، یہ طریقہ کفایت شعاری سکھلانے کا نہایت کامیاب اور تیر بہدف نسخہ ہے۔

اس کے علاوہ اگر گھروں میں مختلف افراد مل کر ماہوار یا ہفتہ وار ایک خاص مقررہ رقم کسی معتمد کے پاس جمع کرائیں، اور مقررہ میعاد کے بعد جب ایک معقول رقم جمع ہو جائے، تو تمام ممبر قرعہ اندازی کریں، جس کے نام قرعہ نکل آتے، وہ تمام رقم اس کو دیدی جائے، اس طرح سے ہر ایک ممبر کو چند روپے ماہوار دے کر ایک معقول رقم مل سکتی ہے، نیز کفایت شعاری اور پس اندازی کا یہ سلسلہ مدّتوں جاری رہ سکتا ہے۔

مَیں نے دیکھا ہے اکثر عقلمند عورتوں نے اس طریقے سے نہایت قیمتی زیور بنوا لئے، جائدادیں کھڑی کر لیں اور بعض نے اپنی اولاد کی نہایت دھوم دھام سے شادیاں کیں۔

جو لوگ پس انداز کرنا نہیں جانتے ان کے لئے اور بھی بہت سے نہایت عمدہ طریقے رائج ہیں، جن پر عمل کرنے سے ارذل عمر کے لئے ایک معتدبہ رقم جمع ہوتی رہتی ہے، اکثر لوگ اپنی زندگی یا بچوں کی شادی اور تعلیم وغیرہ کا بیمہ کرا لیتے ہیں، نوکری پیشہ اپنی تنخواہ میں سے پراویڈنٹ فنڈ کے نام سے کچھ روپیہ باقاعدہ کٹواتے رہتے ہیں، ضرورت کے وقت اس رقم میں سے کچھ قرض بھی مل جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اسی قسم کے اور بہت سے طریقے رائج ہیں، جن کی بدولت روپیہ نہایت خوش اسلوبی سے پس انداز کر سکتا ہے۔

ہر انسان کا فرض ہے کہ آئندہ کے لئے کچھ نہ کچھ بچاتے، کفایت شعاری بہت سے فضائل کا سرچشمہ ہے، اطمینانِ قلب اس سے حاصل ہوتا ہے، افلاس اور قرض کی مصیبتوں سے اس کے ذریعہ انسان محفوظ رہتا ہے، بُرے کاموں سے کفایت شعاری بچاتی ہے، عمر کا آخری حصّہ اس کی بدولت آرام سے گزرتا ہے، خودداری اور وقار اس سے قائم رہتا ہے، گویا انسان کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ کفایت شعاری کی عادت ڈالے۔

اُردو اخبارات

اُردو اخبار کی تاریخ | اُردو کا سب سے پہلا اخبار[1] ۱۸۳۶ء میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر مرحوم نے دہلی سے جاری کیا تھا، یہ اخبار غدر ۱۸۵۷ء تک برابر جاری رہا، جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اس اخبار کی حیثیت بالکل ایک ادبی رسالے کی سی تھی، اس میں اکثر بڑے بڑے شعرا کا کلام اور ادبی تنقیدیں چھپا کرتی تھیں، چند اوراق خبروں اور سیاسی مسائل کے لئے مخصوص تھے، واقعات حاضرہ پر بھی بحث و تمحیص کی جاتی تھی، لیکن پھر بھی ادبی رنگ ہمیشہ غالب رہتا تھا، غدر سے پہلے دہلی سے ایک اور اُردو اخبار[2] بھی جاری ہوا تھا اس کے ایڈیٹر سید محمد خاں سرسید احمد خاں مرحوم کے بڑے بھائی تھے۔

۱۸۵۰ء میں لاہور سے منشی ہرسکھ رائے نے کوہ نور اخبار نکالا، یہ اخبار ریاستوں میں بہت مقبول تھا، شروع میں ہفتہ وار تھا، پھر سہ روزہ ہوا اور آخر کار ہفتے میں تین بار شائع ہونے لگا، اس اخبار کے سٹاف میں منشی نولکشور بھی ملازم تھے، افسوس کہ اس اخبار کو

[1] اُردو اخبار۔ [2] سید الاخبار۔

انہی لوگوں کے ہاتھوں زوال آیا جنھوں نے اس کے دفتر میں رہ کر اخبار نویسی سیکھی تھی، ان لوگوں نے کوہ نور سے علیحدہ ہوکر اپنے اپنے اخبار نکال لیئے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کوہ نور کچھ مدت بعد بند ہوگیا۔

کوہ نور کے بعد شعلۂ طور اور مطلع نور کانپور سے، پنجابی اخبار اور انجم الاخبار لاہور سے، اشرف الاخبار دہلی سے، وکٹوریہ سیالکوٹ سے، قاسم الاخبار بنگلور سے، کشف الاخبار بمبئی سے، کارنامہ لکھنؤ سے اور جریدۂ روزگار مدراس سے جاری ہوا،

۱۸۵۸ء میں منشی نولکشور نے اودھ اخبار جاری کیا، اس اخبار کی کوئی خاص پالیسی نہ تھی، وہ محض سیاسی شورش کے خلاف اور انگریزی حکومت کا طرفدار تھا، اس لئے سرکاری حلقوں میں عام طور پر مقبول تھا، کم قیمت کو بھی اس کی شہرت اور مقبولیت میں غیر معمولی دخل تھا، ماننا پڑے گا کہ اس اخبار نے تعلیم یافتہ طبقے میں اخبار بینی کا کافی شوق پیدا کیا، اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بہ آسانی ہو سکتا ہے کہ پہلے ہفتہ وار تھا، ترقی کر کے سہ روزہ ہوا پھر دو روزہ ہوا اور مدتوں تک کامیابی سے چلتا رہا۔

۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے اودھ پنچ جاری ہوا، اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے، یہ پرچہ ظرافت نگاری میں اپنی وضع

کا پہلا اور آخری اخبار تھا، اگرچہ بہت سے اخباروں نے اس کی نقل کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے معیار پر نہ پہنچ سکے، اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مذہبی سیاسی اور اخلاقی موضوعوں پر نہایت ظریفانہ پیرائے میں بے دھڑک نکتہ چینی کرتا تھا اور نہ کہنے کی باتیں بھی مذاق مذاق میں اس طرح کہہ جاتا تھا کہ کسی کو ناگوار معلوم نہ ہوتی تھیں، منشی سجاد حسین کے انتقال کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہوگیا، ان کے ہمعصروں میں سے کوئی شخص بھی اس معیار کو قائم نہ رکھ سکا، حق یہ ہے کہ اودھ پنچ زعفران زار سے کم نہ تھا، اس مرحوم اخبار نے اخباری دنیا میں دلچسپی کا ایک نیا شعبہ ہمیشہ کے لئے کھول دیا۔

سنہ ۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے ہندوستانی اخبار جاری ہوا، یہ اخبار بھی اپنی طرز کا پہلا اخبار تھا، اس سے پہلے کسی اخبار کو یہ جرأت نہ تھی کہ سیاسی اور ملکی معاملات پر قلم اٹھا سکے، سیاسیات کا نام سنکر لوگوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے، اور غدر سنہ ۵۷ء کے جانگداز نظارے آنکھوں کے سامنے آجاتے تھے، اس اخبار نے سیاسی معاملات پر بڑے جوش و خروش سے قلم اٹھایا اور اہل ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی، اسی شان کا دوسرا پرچہ لاہور سے رفیق ہند کے نام سے جاری ہوا، وہ بھی سیاسیات پر بے باکانہ نکتہ چینی کرتا تھا۔

۱۸۸۷ء میں لاہور سے منشی محبوب عالم نے پیسہ اخبار جاری کیا، یہ اخبار کم قیمت ہونے کی وجہ سے مدتوں مقبول رہا، اس کی پالیسی عام معاملات میں معتدل اور سیاسیات میں حکومت ہند کے ساتھ تھی، غالباً یہی بات اس کی بقا اور مقبولیت کا باعث رہی۔

جرنلزم کی تعلیم

یہی اخبارات ہیں جنہوں نے ہمارے ملک کو اخبار نویسی کی تعلیم دی، ورنہ یورپ کی طرح ہندوستان میں جرنلزم سکھانے کے ادارے نہ تھے، ہاں اب ایک آدھ کالج اس مفید مقصد کے لئے جاری ہو گیا ہے، ممکن ہے ان کالجوں کے تعلیم یافتہ اخبار نویس آئندہ زمانہ میں کوئی بہتر مثال پیش کر سکیں، ورنہ حقیقت امر یہ ہے کہ اس وقت جس قدر اعلےٰ معیار کے ایڈیٹر ہیں، وہ کسی جرنلزم کے کالج کے تعلیم یافتہ نہیں، انہوں نے یہ فن ذاتی تجربے، مشق اور مطالعہ کی بدولت حاصل کیا ہے۔

ہندوستانی جرنلزم کی سب سے بڑی خصوصیّت یہ ہے کہ ہمارے جس قدر سیاسی لیڈر آسمان سیاسیات پر آفتاب اور مہتاب ہو کر چمکے ہیں، ان کا تعلق کسی نہ کسی اخبار سے ضرور رہا ہے، اس کے علاوہ ان عدیم المثال رہنماؤں کی شان میں یہ بات اور بھی چار چاند لگاتی ہے کہ اُنھوں نے اپنے اخبارات سے کبھی

مالی فائدہ نہیں اُٹھایا، بلکہ دن رات محنتیں کر کے اپنی صحتیں خراب کرلیں، لیکن اخبارات کی آمدنی ان کے ذاتی اخراجات کو بھی مشکل پورا کرسکی، ممکن ہے بعض لوگ اس قلیل آمدنی کو ہمّت شکن اور مایوس کن خیال کریں لیکن وطنیت کے جوش اور قوم کی محبّت نے ان کے ارادوں کو بلند اور ہمّتوں کو ہمیشہ مضبوط رکھا۔

بدنام کنندۂ نکونامے چند

دُنیا کا قاعدہ ہے کہ ہر شخص شہرت اور عزّت پہ جان دیتا ہے اور بہت کم محنت اور قابلیّت سے ان کو حاصل کرنا چاہتا ہے، جو شخص بھی دو حرف لکھ سکتا ہے، وہ اخبار یا رسالہ جاری کرنے کے خیال میں دیوانہ نظر آتا ہے، کیونکہ اخبار کی ادارت سے ایڈیٹر صاحب بہت آسانی کے ساتھ لیڈر بن سکتے ہیں، یہ اس نوتراشیدہ مذاق کا نتیجہ ہے کہ آئے دن نئے نئے اخبارات اور رسائل جاری ہوتے رہتے ہیں اور تھوڑی سی مدّت کے بعد ان کا کہیں پتہ بھی نہیں چلتا، اس طرح اخباری دُنیا کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے، سب سے بڑا نقصان تو یہی ہے کہ مدّتوں تک کسی اخبار کی بقا کا یقین ہی نہیں ہوتا، اس لئے لوگ بہت سمجھ سوچ کر چندہ دیتے ہیں کہ کہیں ان کا روپیہ اخبار بند ہو جانے سے ضائع ہی نہ ہو جائے۔

اس کے علاوہ ہمارے بعض اخبار نویسوں نے شخصی مخالفت اور انفرادی تذلیل کے ڈھنگ سیکھ لئے ہیں، اکثر اخبارات کسی

خاص شخصیت یا جماعت کی مخالفت اور تذلیل کرنے کے لئے جاری ہو جاتے ہیں، ان اخبارات کی زندگی عام طور پر اسی وقت تک کی ہوتی ہے، جب تک جذبۂ مخالفت کارفرما رہتا ہے، ایسے پرچے نہ صرف مُلکی ادب کو اپنی بدمذاقی اور کینہ توزی سے نقصان پہنچاتے ہیں، بلکہ عوام کے مذاق کو بھی پست اور رکیک بناتے ہیں، ان کو ہر صحیح مذاق شخص نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، یہ اخبارات دوسروں کا وقار کم کر کے اپنی عزت بڑھانی چاہتے ہیں، لیکن اس ذلیل کوشش میں وہ اپنا وقار بھی کھو بیٹھتے ہیں۔

ناتجربہ کار ایڈیٹروں کے میدان صحافت پر قبضہ کر لینے سے یہ شکایت بھی اُردو پریس کے متعلق عام طور پر پیدا ہو گئی ہے کہ ان کی کوئی خاص پالیسی نہیں ہوتی، وہ جس طرف اپنا فائدہ دیکھتے ہیں، اسی طرف بے دریغ جُھک جاتے ہیں، اکثر ایڈیٹر اختلافی امور پر صحیح رائے ظاہر کرنے سے کتراتے ہیں، اگر کچھ سپردِ قلم فرماتے ہیں تو اس طرح کہ اللّلذی نہ اُاللّلذی، گویا بات کو گول مول کر کے ٹال دیتے ہیں، اس قسم کے اخبار بھی بہت زیادہ خطرناک ہیں، کیونکہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو صحیح نتیجہ پر پہنچنے سے روکتے ہیں، اخبارات کو اپنی پالیسی بہت صریح اور صاف رکھنی چاہیئے۔ اور حق بات کہنے میں نقصان اور خطرات سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔

اصل میں جب تک ہمارے ملک میں اخبارات شخصی ملکیت ہیں اور مالی مشکلات ان کی گریباں گیر ہیں، ان سے بے لاگ تنقید اور نکتہ چینی کی توقع رکھنا بے سود ہے، ضرورت اس بات کی ہے، کہ اخبارات مشترکہ سرمایہ سے جاری کئے جائیں، تاکہ وہ اپنے مخصوص حلقے کے سیاسی اور ادبی مذاق کے آئینہ دار ہوں اور ان کے ایڈیٹر چند در چند انتظامی اور مالی مشکلات سے بے نیاز ہوکر اپنے فرائض انجام دیں۔

سیاسیات اور ہندوستانی اخبارات

"موجودہ[1] سیاسی کشمکش نے ہمارے اخباروں کی کایا پلٹ دی ہے، ورنہ اینگلو انڈین اخبارات محض اعلےٰ افسروں کے مشاغل سے بھرے ہوتے تھے، ان میں بڑے بڑے شہروں اور پہاڑوں کے رہنے والے افسروں کی دعوتوں، ناچ رنگ کی محفلوں اور کھیل تماشوں کے حالات خوب تفصیل سے لکھے جاتے تھے اور ہندوستانی سیاسیات کا ہندوستانی نقطۂ نظر سے کبھی ذکر بھی نہ آتا تھا، ہندوستانی سیاسی تحریک کے متعلق نہایت مختصر اور مبہم خبریں ناموزوں جگہوں پر درج کر دی جاتی تھیں، تاکہ انہیں کوئی اہمیت نہ دی جائے، ہاں اگر کوئی ہندوستانی سیاسی تحریک کی ہنسی اڑاتا تو اسے خوب بڑھا چڑھا کر لکھا جاتا تھا۔

---

[1] از پنڈت جواہر لال نہرو۔

ہمارے ہندوستانی اخبارات بھی اینگلو انڈین معاصرین کی نقل کرنے کے عادی تھے، مگر وہ قومی تحریک کو کچھ نہ کچھ وقعت ضرور دیتے تھے، ان کو بھی افسروں کے تغیر و تبدل اور ان کی الوداعی پارٹیوں سے اینگلو انڈین اخبارات کی طرح خاص دلچسپی تھی، ہندوستانی اخباروں کے مالک بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار تھے، اس لئے ان کی پالیسی بھی انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی، غرض ہمارے اخباروں کو عام طور پر عوام سے کوئی دلچسپی نہ تھی، مزے کی بات یہ ہے کہ انہی اخبارات کو قومی پریس کا لقب دیا جاتا تھا۔

گزشتہ بیس پچیس سال میں قومی تحریک کی بدولت بہت زبردست انقلاب رونما ہوا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اینگلو انڈین اخبارات بھی ہندوستانی سیاسیات کے لئے معقول جگہ نکالنے پر مجبور ہیں، اگر وہ ایسا نہ کریں تو اکثر ہندوستانی ان کو خریدنا بند کر دیں، پھر بھی وہ ہندوستانی سیاسی مسائل کو ہمیشہ اپنے رنگ میں پیش کر کے ان کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سیاسی بیداری نے ہندوستانی اخبارات کا زاویۂ نگاہ کافی وسیع کر دیا ہے، اب ان کی توجہ عوام کی طرف دن بدن بڑھتی جاتی ہے لیکن پھر بھی وہ اکثر سرمایہ داروں کے مفاد کی حمایت کرتے ہیں، کیونکہ آخرکار انہی کے سرمایہ سے چلتے ہیں کچھ اخبارات ایسے بھی

ہیں جو زیادہ آزاد خیال ہیں اور وسیع نظری سے کام لیتے ہیں، مگر انہیں مطابع کے سخت گیر قوانین اور سنسر کا خوف آگے بڑھنے سے روکتا ہے، ایسے اخبارات کی ضمانتیں اور پریس اکثر ضبط ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ پنپ نہیں سکتے۔"

اخبارات کے کارنامے گزشتہ پچاس سال میں ہمارے اخبارات نے جس قدر ترقی کی ہے، ہم اس پر فخر کر سکتے ہیں، بیشک ہمارا پریس ابھی یورپین ممالک کے پریس سے بہت پیچھے ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ان ممالک کو اخبارات کے متعلق کئی سو سال کا تجربہ حاصل ہے اور ہمارے ملک میں اخبار کی تاریخ محض سو سال سے شروع ہوتی ہے، اندریں حالات جس قدر ترقی اُردو پریس نے کی ہے وہ دوسرے ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہم ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ بہت تھوڑی مدّت میں ہمارے اخبارات اعلیٰ معیار پر پہنچ جائیں گے۔

ہمارے اخبارات کا سب سے بڑا کارنامہ اور خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں بہت زیادہ مدد دی ہے اور ان کا مقصد مالی منفعت سے ہمیشہ بالا رہا ہے۔ بلکہ اگر ہم یہ کہیں تو بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستانی اخبارات کی تاریخ آزادی کی تحریک کے دوش بدوش چل رہی ہے نیز قومی تحریک میں ہمارے اخبارات نے جس قدر مالی اور جانی قربانیاں کی ہیں، ان پر اخبار نویس

بجا طور پر ناز کر سکتا ہے،

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی سیاسیات کا نام سُن کر کانپتے تھے، لیکن آج ہمارے مُلک میں مختلف الخیال سیاسی جماعتیں موجود ہیں، جو ہر سیاسی موضوع پر اپنے اپنے زاویۂ نگاہ کے مطابق نہایت بے باکانہ انداز سے اظہار خیالات کرتی ہیں، اس کے علاوہ ہر شخص سیاسیات سے تھوڑی بہت دلچسپی لینے لگا ہے اور کچھ نہ کچھ اپنی رائے بھی رکھتا ہے یقیناً یہ ہمارے اخبارات ہی کی کوشش کا شاندار کرشمہ ہے۔

اخبار کی ترقی سے پہلے ہمیں اپنے شہر کی ضروری خبریں بھی مُدّتوں تک معلوم نہ ہوتی تھیں، اور صحیح خبریں ملنا تو ناممکنات سے تھا، افواہیں اور رنگ آمیزیاں حقیقت کو چھپا کر کچھ کا کچھ بنا دیتی تھیں، اب یہ حال ہے کہ ادھر کوئی اہم واقعہ ہوا، اُدھر اخبارات کے نامہ نگار موقعے پر پہنچ گئے اور صحیح واقعہ کی چھان بین شروع کر دی، کیا مجال کہ اس میں ذرا بھی تغیّر و تبدّل ہونے پائے، مُلکی خبروں کا تو ذکر ہی کیا ہے صبح ہوتے ہی تمام دنیا کی خبریں پڑھ لیجئے، اور دن بھر کے واقعات اور حادثات سے باخبر ہو جائیے۔

تجارت کی ترقی اور توسیع بھی بہت زیادہ اخبارات کی مرہون منّت ہے، اخبارات کے ذریعہ تجارت اور صنعت میں جس قدر اضافہ ہُوا ہے اس کا شکریہ ادا نہ کرنا حد درجہ کی ناانصافی ہے، آج سے

چند سال پہلے ہمارے اخبارات اشتہارات کی طرف متوجہ نہ تھے۔ لیکن اب غیر ملکی اخبارات کی دیکھا دیکھی انھوں نے اس طرف بھی توجہ کی ہے، اس طریق کار سے ایک طرف تجارت میں ترقی ہونے کی اُمیدیں قوی تر ہوگئی ہیں اور دوسری طرف گزشتہ مالی نقصانات کی تلافی ہو جانے کے امکانات بڑھ گئے ہیں، اُمید ہے اگر اخبارات اپنے بلند مقاصد کے ساتھ ساتھ تجارتی پہلو کو بھی ملحوظ رکھیں گے تو ان کی مالی حالت بہت جلد سُدھر جائے گی اور مالی حالت بہتر ہو جانے سے ہمارے پریس کا معیار اور زیادہ بلند ہو جائیگا۔

خبریں، اشتہارات اور پالیسی | عام طور پر ہر اخبار کسی نہ کسی خاص پالیسی کے ماتحت جاری کیا جاتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ آئندہ چل کر تجربات اس پالیسی کو متزلزل یا تبدیل کر دیں، ایسے اخبارات جن کی پالیسی ہر قدم پر بدلتی رہتی ہے، اپنے وقار کو خود ضائع کر دیتے ہیں اور اپنی غیر مستقبل پالیسی کی بدولت عوام کی نظروں میں ذلیل ہو جاتے ہیں، عام طور پر کسی اخبار کی مقبولیت کا انحصار اس کی پالیسی اور خبروں پر ہوتا ہے، جس اخبار کی پالیسی مضبوط اور خبریں صحیح ہوں، اس کو عوام بہت پسند کرتے ہیں، اگرچہ خبروں اور پالیسی میں بظاہر کوئی خاص تعلق نہیں، لیکن اتفاقات زمانہ سے یہ دونوں چیزیں یکجا ہوگئی ہیں اور ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہوئی ہیں کہ اب ان کو علیحدہ کرنا تقریباً ناممکن ہے، اس وضع کو نبھانے کے لئے ہر اخبار کا فرض ہوگیا

ہے کہ وہ پُر وثوق اور صحیح خبریں بڑی بڑی رقمیں ادا کر کے خبر رساں ایجنسیوں سے حاصل کرے اور ہر بڑے شہر میں اپنے نمایندے اور نامہ نگار رکھے۔

اخبارات اپنی مخصوص پالیسی پر کاربند رہ کر آہستہ آہستہ اپنی ایک ہمخیال جماعت پیدا کر لیتے ہیں، یہ جماعت اپنے اخبار سے توقع رکھتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی پالیسی پر قائم رہے، اگر سوء اتفاق سے کوئی اخبار اپنی پالیسی سے انحراف کرتا ہے تو اس کے پڑھنے والوں میں خفگی اور ناراضگی کی لہر دوڑ جاتی ہے، اور آخرکار یہ جماعت اس اخبار سے بدظن ہو کر کوئی دوسرا ایسا اخبار تلاش کرتی ہے، جو ان کے خیالات کی صحیح ترجمانی کرتا اور ان کے جذبات اور احساسات کا حقیقی معنوں میں آئینہ دار ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ محض خبریں ہی پڑھنے کے شوقین ہوتے ہیں وہ عام طور پر اُس اخبار کو پسند کرتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ خبریں درج کرتا ہے، بعض لوگ محض تجارتی اشتہارات دیکھنے کے لئے اخبار خریدتے ہیں، ایسے لوگوں پر اخبار کی پالیسی تبدیل ہونے کا کوئی اثر نہیں پڑتا، وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اخبار میں مفید مطلب خبریں اور اشتہارات موجود ہیں یا نہیں، ایسے اخبارات جن کو اس قسم کے خریدار مل جائیں، اُنہیں خاص طور پر خوش قسمت اخبار سمجھنا چاہیئے، وہ اپنی پالیسی پر چاہے سختی سے پابند رہیں یا آئے دن اس کو

تبدیل کرتے رہیں، ان کے خریداروں میں کوئی کمی نہیں آسکتی، ایسے خوش قسمت اخبار باوجود مخالفت کے بھی متزلزل نہیں ہو سکتے، بلکہ آہستہ آہستہ اپنی ہم خیال جماعت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، جس سے ان کی بنیادیں اور بھی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہیں۔

جب کسی اخبار کی پالیسی قائم ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ اس کا حلقۂ اثر کافی وسعت اختیار کر لیتا ہے تو پھر اس کو اشتہارات کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی، اب اگر اشتہار باز کسی بات پر اخبار سے ناراض ہو جائیں تو ان کی بے توجہی سے اخبار کو نقصان نہیں پہنچ سکتا، اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی اخبار کے خلاف ناراضگی کا جذبہ پھیل گیا اور اشتہار بازوں نے اس کا مقاطعہ کر کے، انہوں نے اپنے اشتہارات کسی دوسرے اخبار کو دینے شروع کر دیئے، لیکن تھوڑی مدت کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ اس مقاطعہ سے ان کی اپنی تجارت کو نقصان پہنچا اور وہ اخبار بدستور اپنی جگہ پر قائم رہا، کیونکہ وہ اپنے لئے ایک مخصوص حلقۂ اشاعت پیدا کر چکا تھا، اور اس قلیل عرصے میں دوسرے اخبار اس کے باقاعدہ خریداروں کو چھین کر اس کے معیار پر نہیں پہنچ سکتے تھے، آخرالامر یہ مخالف جماعت مجبور ہو گئی کہ اسی اخبار کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور اپنی تجارت کو مزید نقصان پہنچانے کے موجب نہ بنیں۔

فرض کیجئے عوام میں سٹہ بازی، گھڑ دوڑ اور شراب خواری وغیرہ کی

وبا پھیل جاتی ہے، تباہ کن اور عبرتناک انجام دیکھ کر مصلحین کو اصلاح کی سوجھتی ہے، اخبارات میں بھی ان بُری رسوم کی بیخکنی کے لئے بڑے بڑے پُرزور مقالے اور افتتاحیے سپردِ قلم کئے جاتے ہیں، عوام میں ناراضگی کی لہریں ٹھاٹھیں مارنے لگتی ہیں، اخبارات والے جانتے ہیں کہ ان شوقوں کے رسیا ان کا اخبار گھڑدوڑ یا سٹہ بازی کی خبروں کی وجہ سے خریدتے ہیں، اگرچہ وہ ان کے خلاف بہت شدومد سے لکھتے رہتے ہیں، لیکن یہ مخصوص خبریں چھاپنے سے بھی باز نہیں آتے، کچھ مدّت بعد یہ تحریک خودبخود دب جاتی ہے اور خبروں اور پالیسی کے تضاد کی بدولت یہ بُری رسمیں بدستور جاری رہتی ہیں، اسی طرح ہمارے ملک کا ہر فرد شراب نوشی کے خلاف ہے اور اکثر اخبار نویس بھی ہمیشہ اس بُری عادت کے خلاف لکھتے رہتے ہیں، لیکن اگر ہم ان کے اخبارات کی اوراق گردانی کریں تو شراب کا اشتہار کہیں نہ کہیں ضرور نظر آئیگا، ہم شراب کو بُرا سمجھتے ہیں اور اس کا ذکر تک بھی اپنے گھر میں نہیں آنے دیتے، لیکن اس بات کا ہمارے پاس کیا علاج ہے کہ اخباری دلچسپی کی بدولت ہر ہفتے یا روزانہ ہمارے گھر میں شراب کا اشتہار یا کاغذی بوتلیں ضرور آجاتی ہیں، مگر پھر بھی ہم پڑھتے ہیں وہی اخبار، چاہے شراب کی بوتل کی تصویر دیکھ کر لاحول ولاقوۃ ہی کیوں نہ کہنا پڑے۔

ہمارے بعض اخبارات کو سنسنی پیدا کرنے والے اور

خبریں درج کرنے میں کمال حاصل ہے ، بعض اوقات وہ ایسے دلکش عنوانات قائم کرتے ہیں کہ انسان مندرجہ سطور پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے ، ہم پیشتر عرض کر چکے ہیں کہ اخبار اور خبروں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ، اخبار کا اصلی مقصد اس کا افتتاحیہ اور وہ مضامین ظاہر کرتے ہیں جن کی اشاعت کے لئے اخبار جاری کیا جاتا ہے ، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خبروں کی طرف اخبارات کا رجحان زیادہ بڑھ رہا ہے اور یہ اینگلو انڈین اور انگریزی اخبارات کا اثر ہے ، یاد رہے اگر خبروں کو اخبارات میں زیادہ اہمیت دیگئی تو ہمارے اخبارات مستقبل قریب میں محض خبروں کا مجموعہ بنکر رہ جائیں گے اور آخر کار اُن کا مقصد اعلےٰ فوت ہو جائیگا۔

چونکہ اخبارات میں خبریں درج کرنے کا رواج شروع ہی سے چلا آتا ہے ، اس لئے اسے ترک کرنا ناممکن ہو گیا ہے ، بہرحال خبروں کے اندراج میں بھی بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیئے ، کسی مشہور اخبار نویس کا قول ہے۔ " خبر یہ نہیں ہے کہ فلاں شخص کو کُتّے نے کاٹ لیا ، اس میں تعجب کی بات کیا ہے ، کُتّا انسان کو کاٹا ہی کرتا ہے ، خبر تو یہ ہونی چاہیئے کہ فلاں انسان نے کُتّے کو کاٹ لیا " اگر ہم غیر ضروری خبریں اخبارات میں درج کرنے سے پرہیز کریں ، تو یہی جگہ کسی اور مقصد کے لئے صرف ہو سکتی ہے ، اصل میں اخبارات کو محض ان واقعات اور حادثات پر روشنی

ڈالنی چاہیے، جن کا عوام کی ضروریات زندگی سے فطری تعلق ہے، غیر فطری واقعات کا اعادہ تھوڑی دیر کے لئے دلچسپی ضرور پیدا کر سکتا ہے، لیکن نہ تو ان کو انسانی زندگی کا صحیح آئینہ دار کہا جا سکتا ہے، اور نہ ان کے بیان سے اخبار کا اصلی مقصد پورا ہوتا ہے۔

اخبارات کی طاقت اخباری طاقت کی تمام دنیا قائل ہے، نپولین اعظم کہا کرتا تھا کہ "جرنلسٹ مصلح قوم اور ناصح مشفق ہے، وہ قوم کا فاضل اُستاد اور سچا رہنما ہے، اس کو حکومت کا لائق اور با اعتماد مشیر ہونے کا فخر قدرتی طور پر حاصل ہے نیز ہزاروں مسلّح سپاہیوں سے جنگ کرنی آسان ہے لیکن چار ایڈیٹروں سے مقابلہ کرنا بہت زیادہ خطرناک اور مشکل ہے۔"

اخبار کی طاقت کا انحصار اس کی پالیسی پر ہے، اِس لئے اخبارات کو اپنی پالیسی پر بڑی سختی سے قائم رہنا چاہیئے، اگر پالیسی کو قائم رکھنے کے لئے بڑی سے بڑی مالی قربانیاں بھی پیش کرنی پڑیں تو دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ جو اخبارات اپنی طاقت کو بیکار باتوں میں ضائع کرتے ہیں نہ محض اپنی طاقت ہی کو نہیں بلکہ اس جماعت کی طاقت کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں جس کی نمائندگی کا ان کو فخر حاصل ہوتا ہے، افسوس ہے کہ ہمارے اکثر اخبارات بعض مخصوص کمزوریوں کی وجہ سے بے پیندے کے بدھنوں کی طرح حادثات اور واقعات کے جھکولوں سے لڑھکتے پھرتے ہیں، اور ذرا سے دباؤ

سے مرغ بادنما کی طرح اپنے محور کے گرد گھوم جاتے ہیں، حقیقتاً وہ اپنی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں کرتے اور اپنی غیر مستقل پالیسی کی بدولت جرنلزم کے شریف اور باعزت پیشے کو لعن طعن کا نشانہ بناتے ہیں۔

اخبارات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ بڑے بڑے حادثوں اور تصادموں میں بھی مغلوب نہ ہوں، حق بات کے لئے اگر جان و مال کی قربانی بھی دینی پڑے تو دریغ نہ کریں، ایڈیٹر ملک و قوم کا ایک بہادر سپاہی ہے، اس کا فرض ہے کہ بہادر سپاہی کی طرح خدمات انجام دینے کے لئے ہر وقت تیار رہے، یہی وہ عدیم المثال معیار ہے جس کو ہمارے پیشرو اخبار نویسوں نے قائم کیا ہے، افسوس ہے کہ ہمارا پریس روز بروز نااہل اور ناتجربہ کار اخبار نویسوں کے قبضے میں جارہا ہے جس سے پریس کی آزادی میں سخت رکاوٹیں پیدا ہورہی ہیں، اس کے علاوہ ذاتیات، تعصب، ناانصافی اور نااتفاقی پریس کی طاقت کو کمزور کررہی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ جرنلزم جیسے صبر اور جرأت آزما پیشے کو وہی لوگ اختیار کریں، جن میں اس کی قابلیت موجود ہے، اور وہ اس کے فرائض سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوسکتے ہیں۔

انصاف اگرچہ انفرادی تذلیل اور دل آزاری سے بدتر اور کوئی گناہ نہیں لیکن ہمارے اخبار نویسوں کو اس سے خاص دلچسپی ہوتی جاتی ہے،

یہ مسلمہ امر ہے کہ کوئی شخص کمزوریوں سے خالی نہیں، پھر بھی ہمارے اکثر نام نہاد ایڈیٹر شخصی کمزوریوں کو تشہیر کر کے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بھی ایک خاص فن ہے جو ہمارے ایڈیٹروں نے یورپین اخبارات سے سیکھا ہے، لیکن وہ لوگ بھی اسے معیوب سمجھتے ہیں، ایسے اخبارات کو اگر کوئی معقول اسامی نہیں ملتی تو انہیں اپنا اخبار بند کرنا پڑتا ہے، جب تازہ شکار نظر آتا ہے، وہ پھر برآمد ہو جاتے ہیں اور اپنے شکار کو قابو میں لانے کے لئے بے غل و غش گندگی اچھالتے ہیں، جب شکار پھنس جاتا ہے، تو اپنا لقمہ لے کر مگرمچھ کی طرح دریا میں غائب ہو جاتے ہیں، ایسے اخبارات اور اخبار نویسوں سے جرنلزم کا شریف پیشہ سخت بدنام ہے، جب تک عوام کے دلوں میں اس کی روک تھام کا کا خیال پیدا نہ ہو گا، ملک کی فضا اس قسم کی آلائشوں سے کبھی پاک نہیں ہو سکتی۔

جس جماعت سے کسی اخبار کا تعلق ہوتا ہے وہ اس کے کارناموں کو بحیثیت مجموعی مخالف جماعتوں کے تحصیلات اور کارناموں پر ضرور فوقیت دیتا ہے۔ یہ صورت بالکل نیچرل ہے، لیکن اس وقت ضرور قلق ہوتا ہے جب دوسری جماعت کے اچھے کاموں پر روز روشن میں خاک ڈالی جاتی ہے اور ہر اچھی بات کو برے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے، ترقی کے مدارج طے کرنے کے لئے

ضروری ہے کہ پریس کا مزاج منصفانہ اور اعتدال پسند ہو، نکتہ چینی کا حق یقیناً ہر اخبار کو حاصل ہے، مگر ناجائز اور زبردستی کے اعتراضات جن سے تعصّب کا تعفّن آئے کسی طرح مستحق تحسین نہیں ہو سکتے، ایسے ہی مواقع پر اخبارات کی اصلیّت ظاہر ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس درجہ منصف مزاج واقع ہوئے ہیں۔

ایڈیٹری | موجودہ زمانہ میں جس طرح اور فنون ہیں، اسی طرح ایڈیٹری یعنی اخبار نویسی بھی ایک معقول اور باعزّت فن خیال کیا جاتا ہے، مغربی ممالک میں اخبار نویس بہت عزّت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کو بڑی بڑی معقول تنخواہیں ملتی ہیں، ہمارے ملک میں اگرچہ اخبار نویسی کوئی منفعت بخش ذریعہ روزگار نہیں لیکن اسکی عزّت اور وقعت بہت ہے، بشرطیکہ کوئی اخبار نویس اپنے اعتبار کو خود خاک میں نہ ملائے، اخبارات کی بدولت ایک ایڈیٹر کو جس قدر مواقع عوام میں مقبولیّت اور اعتبار حاصل کرنے کے ملتے ہیں، وہ کسی دوسرے پیشے میں میسّر نہیں آتے، اگر اس میں قابلیّت اور لیاقت ہو تو وہ ان سے بیش از بیش فائدہ اُٹھا سکتا ہے، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر شخص کو خوش کرنا بہت مشکل کام ہے، لیکن اگر صداقت اور بے غرضی کے معیار کو ملحوظ رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اخبار نویس کو اپنے شریفانہ پیشے میں خاطر خواہ کامیابی اور وقار حاصل نہ ہو۔

بہر حال تعلیم یافتہ طبقے کے لئے فن صحافت میں ترقی کرنے کی

بہت گنجائش ہے، آج کل ہندوستان کے ہر بڑے شہر سے کوئی نہ کوئی اخبار ضرور شائع ہوتا ہے اور وہ بہت کافی شوق سے پڑھا جاتا ہے، جہاں تعلیم کا چرچا ہے وہاں بے پڑھے لکھے لوگ اخبارات دوسروں سے پڑھوا کر سنتے ہیں، ایسے حالات میں اگر ہر بڑے شہر سے مقامی اخبارات نکالے جائیں تو صحافت میں بہت جلد ترقی ہو سکتی ہے، ظاہر ہے یہ بات کچھ زیادہ مشکل نہیں کیونکہ ہر شہر میں بڑے بڑے اخبارات کے نمائندے اور رپورٹر موجود ہیں، وہ اس کام کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں، اس قسم کے مقامی اخبارات سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مقامی خبریں اور حالات عوام میں بیداری اور احساس زندگی پیدا کر دیں گے، دوسرے ان اخبارات کو بہت سا ضروری مواد مفت ہاتھ آجائیگا جو صوبائی یا آل انڈیا مقبولیت کے مالک ہیں، اس طریق کار سے اخبار نویسی کے فن میں بھی بہت زیادہ ترقی ہو سکتی ہے، کیونکہ چھوٹے چھوٹے مقامی اخبارات کے ایڈیٹر بہت کم مدت میں بڑے بڑے اخبارات کو چلانے کی قابلیت پیدا کر لیں گے۔

غیر ذمہ دار ایڈیٹر اکثر غیر ذمہ دار ایڈیٹر بہت سی خبریں بغیر تصدیق کئے اخبارات میں درج کر دیا کرتے ہیں، اردو پریس کو چاہئے کہ ایسی خبر ہرگز نہ چھاپے جس کی دوسرے دن تردید کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کرنا پڑے، ہمارے اکثر اخبارات کی عام طور پر حالت

یہ ہے کہ اگر کہیں تھوڑی سی جگہ خالی رہ جاتی ہے تو اُس کو کسی طرح پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور یہ خیال نہیں کرتے کہ تھوڑی سی جگہ خالی چھوڑ دینے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا، لیکن ایک غیر مصدقہ اور لچر بات درج کر دینے سے اخبار کو بہت زیادہ ضعف پہنچتا ہے، مثالاً ہمارے ہوشیار اخبار نویس ایسے موقع پر اپنا کمال اس طرح دکھاتے ہیں کہ فلاں جگہ بڑا خونریز فساد ہوا، بہت سے آدمی مجروح ہو گئے، کئی ایک کو پولیس نے گرفتار کر لیا، باقی بھاگ گئے، اس کے بعد لکھتے ہیں، تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ خبر بالکل بے بُنیاد ہے، لیجئے جگہ بھی پُر ہو گئی اور جھگڑا بھی جاتا رہا، دیکھنا یہ ہے کہ اس قسم کی حرکات سے اخبار کی شہرت پر کیا اثر پڑتا ہے۔

ایڈیٹروں کی ان غیر ذمہ داریوں کی وجہ سے کسی زمانے میں اُردو اخبارات بہت بدنام ہو گئے تھے، ان کی سچ بات کا بھی کوئی اعتبار نہ کرتا تھا۔ برخلاف اس کے اینگلو انڈین اخبارات بہت احتیاط سے کام لیتے تھے، چنانچہ ان کی جھُوٹ بات پر بھی سچ کا گمان گزرتا تھا، اسی حالت کو دیکھ کر اکبر مرحوم نے کہا ہے ؎

گھر سے آئی ہے خبر ان کا ہوا ہے چہلم
پائنیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

ایڈیٹروں کو چھوڑ کر جو واقعی بڑے دلچسپ انسان ہوتے ہیں ہمارے اخبارات کے نامہ نگار رپورٹر اور نمائندے بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہوتے

ان کی قابلیّت سے صرف نظر کرکے ذرا ان کے کارنامے ملاحظہ فرمایئے۔ فرض کیجیے کوئی اہم جلسہ ہو رہا ہے اخبارات کے نمائندے بھی پلیٹ فارم کے قریب کرسیوں پر جلوہ افروز ہیں، متانت اور وقار ان کے چہروں سے ٹپکتا ہے، بات بات پر ان کا قلم چل رہا ہے، مقررین کی نظریں سامعین سے زیادہ ان پر پڑ رہی ہیں کہ تقریر کی کامیابی اور ناکامیابی کی یہی لوگ کسوٹی ہیں، جلسہ تو بخیر و خوبی ختم ہوا، اب ہر مقرر ان کے ساتھ نہایت تپاک سے مل رہا ہے اور باتوں باتوں میں خوشامدیں ہو رہی ہیں کہ ان کی تقریر کے متعلق اچھی رپورٹ لکھی جائے، تاکہ غیر حاضر افراد کے دلوں پر ان کی قابلیّت کا ایک دفعہ سکّہ بیٹھ جائے۔

خیر اب دوسرے دن اخبارات میں دیکھتے کیا کیا گوہر افشانیاں ہوتی ہیں، کس کی قسمت پھوٹتی اور کس کی جاگتی ہے، اور ایڈیٹر صاحب کی جادو بیانی کیا رنگ لاتی ہے، لیجیے صاحب اخبار ملاحظہ فرمایئے، ارے بھئی خدا کے لیئے ذرا دیکھئے تو یہ کیا لکھا ہے، مَیں نے تو یہ ہرگز نہیں کہا تھا، یہ تو بڑے سخت الفاظ ہیں، خدا جانے اس کا انجام کیا ہوگا، چلیئے ایڈیٹر صاحب سے ملاقات کریں، شاید وہ بھلا مانس تردید کر دے، بصد مشکل ایڈیٹر صاحب کے درشن ہوئے، وہ بیٹھے سیاسیات پر خامہ فرسائی فرما رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے تمام دُنیا کے سیاسی معاملات ان کی انگلیوں میں کھیل رہے ہیں، ایک سطر لکھتے ہیں اور دس تیور بدلتے ہیں، بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی، مقالہ

ختم ہونے کے بعد بات ہوئی، وہ سکتے ہیں ہمارا رپورٹر غلط نہیں لکھ سکتا، آخر بڑی لمبی چوڑی بحث کے بعد کچھ فیصلہ ہوگیا، اگر اس پر عمل بھی ہوا تو چین کی نیند سوئے، ورنہ کئی کئی ہفتے رات کی نیند اور دن کا چین حرام ہوگیا، کیا عجب ہے کہ پبلک کے معاملات میں حصّہ لینے ہی سے توبہ کرلیں اور اگر ان اخبار والوں پر بہت ہی غُصّہ آئے تو اپنا اخبار نکال ایڈیٹر اور لیڈر بن بیٹھیں، پھر خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ، خود رند سبوکش۔

اس قسم کے دلچسپ واقعات کچھ اُردو اخبار نویسی ہی سے مُختص نہیں، ہر ملک میں ایسے معاملات اکثر پیش آتے ہیں، بعض اوقات یہ لوگ بڑی بڑی متضاد اور مضحکہ خیز باتیں اپنی رپورٹوں میں لکھ جاتے ہیں، پبلک کے عام جلسوں میں تو ان لوگوں کی بن آتی ہے جو چاہیں لکھ لیں اور جس ضروری بات کو چاہیں بغیر کھٹکے نظر انداز کردیں، یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ جن مقرروں کا ایڈیٹروں اور اخباری نمائندوں سے کچھ تعلق ہوتا ہے، ان کو لیڈر بننے اور شہرت حاصل کرنے میں کوئی تکلیف نہیں اُٹھانی پڑتی، اگر ایسے لوگوں کی تقریریں آپ کو اخبار میں پڑھنے کا اتفاق ہو تو آپ کو ان کی شان بہت ہی ارفع و اعلےٰ دکھائی دیگی، ان کی تقریر میں وہ تمام اچھی باتیں موجود ہونگی جو ان کی زبانِ مبارک سے نکلنا تو دُور ان کے دماغ سے چھُو کر بھی نہ گزری تھیں، اگر رپورٹر صاحب کسی قدر منصف مزاج ہیں تو اپنی طرف سے کچھ اضافہ

نہیں کریں گے، بلکہ تقریر کے اچھے حصوں کو چھاپ دیں گے، اور بے معنی اور لغو باتوں کو حذف کر دینگے،

ان حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رپورٹروں اور نمائندوں کے تقرر میں بھی بڑی حزم و احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے، ورنہ اُن کی بے اعتدالیوں سے ہمارے پریس کو وہی نقصانات پہنچنے کا اندیشہ ہے جو ایڈیٹروں کی غیر ذمہ داری سے ممکن ہو سکتا ہے۔

بہرحال صحافت کی طاقت مسلم ہے، ہم اس سے وہ وہ کام لے سکتے ہیں جو بڑے بڑے لشکر اور فوجیں بھی انجام نہیں دے سکتیں، اس لئے ہمیں اپنے اخبارات کا معیار بلند اور ان کو بدنام کن الزامات سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ وہ وقت جلد آجائے، جب ہمارے اخبارات دُنیائے صحافت میں غیر فانی شہرت اور لازوال طاقت کے مالک کہلانے لگیں۔

آبادی

ماہرین نے حساب لگایا ہے کہ محض ایک مرد اور ایک عورت کے ذریعہ سے ۱۷۵۰ سال میں اتنے ہی انسان پیدا ہو سکتے ہیں جتنے اس وقت صفحہ عالم پر موجود ہیں، اگر یہ حساب صحیح ہے، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آبادی میں بڑھنے کی کس قدر گنجائش ہے، اس کے علاوہ ایک اور ماہر معاشیات نے آبادی کے متعلق یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ آبادی دو سے تین، تین سے چھ، چھ سے بارہ، بارہ سے چوبیس اور اسی طرح ہر عدد پر دو گنی ہوتی چلی جاتی ہے، بعض لوگوں نے اس نظریے پر اعتراضات بھی کئے ہیں، لیکن ساتھ کے ساتھ اِس بات کو بھی تسلیم کیا ہے کہ آبادی واقعی بہت سُرعت سے بڑھتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ اندازے نہایت پریشان کن ہیں، اسی لئے مفکرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ چاہے دُنیا کی مالی حالت کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہو جائے لیکن وہ بڑھتی ہوئی آبادی کی کفالت نہیں کر سکتی اور یہی وجہ ہے کہ مسئلہ آبادی ہر ملک میں نمایاں حیثیت اختیار کرتا جاتا ہے، ممکن ہے مردم شماری کا رواج بھی اسی احساس کا نتیجہ ہو۔

اس مضمون میں ہم آبادی کے متعلق اعداد و شمار کا جائزہ لیتے ہوئے ہندوستان کی عمومی حالت پر روشنی ڈالیں گے اور دکھائیں گے کہ آبادی کے ارکان کون کونسے ہیں، آبادی کیونکر بڑھتی ہے، ملک کی آبادی کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اموات و پیدائش کی کمی بیشی کا اثر کیا پڑتا اور اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے، آبادی کی کثرت کا صحیح معیار کیا ہو سکتا ہے، اگر ہمارے ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے تو اس سے کیا نقصانات ہو رہے ہیں، آخر میں ہم ان تجاویز پر بھی بحث کرینگے جن پر عمل کرنے سے آبادی کو بڑھنے سے روک کر انسانی زندگی کے معاشی معیار کو بلند اور عوام کی خوشحالی کے اسباب کو ترقی دی جا سکتی ہے۔

ہندوستان کی آبادی سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں ہندوستان کی آبادی ۳۵ کروڑ ۲۹ لاکھ سے زائد افراد پر مشتمل تھی، جس رفتار سے آبادی بڑھ رہی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب ۳۶ کروڑ تک پہنچ چکی ہوگی، ورنہ عوام کا اندازہ تو یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی آبادی ۳۷ کروڑ کے لگ بھگ ہے، ہمارے ملک کی آبادی کا مسئلہ بھی روز بروز خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے، اس لئے تعلیم یافتہ طبقہ کچھ مدت سے اس کی طرف متوجہ اور جن گھرانوں میں بن بلائے مہمان نازل مسلسل ہو رہے ہیں وہ اس سے متاثر ہیں، لیکن عوام نے اب تک اس کے انسداد کی طرف توجہ نہیں کی، ضرورت ہے کہ مسئلہ

آبادی پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔

معاشی ذرائع | آبادی کم اور زیادہ ہونے کا انحصار زیادہ تر کسی مخصوص خطے کی آب وہوا، حفاظتِ جان ومال، معیارِ راحت و آرام، وسائل و ذرائع معاش اور اقتصادی ترقیات پر ہے، نیز جس مقام کا ماحول قدرتی عطیات سے مالامال ہوتا ہے وہاں آبادی کی کثرت ہوتی ہے، گویا جہاں کہیں معاشی ذرائع بکثرت ہوں گے، وہاں زیادہ آبادی کی گنجائش ہوگی، اور وہاں کے باشندے دوسرے محروم القسمت مقامات کی نسبت زیادہ خوشحال اور تعداد میں بکثرت ہوں گے، ہمارا ہندوستان چونکہ زراعت پیشہ ملک ہے، اس لئے ان ملکوں کی نسبت کم آباد ہے، جن میں صنعت وحرفت کو عروج حاصل ہے، چنانچہ تحقیقات کے مطابق اس وقت ہندوستان میں تقریباً دوسو افراد فی مربعہ میل آباد ہیں۔

حقیقتاً ہم کسی مُلک کی معاشی حالت کا اندازہ اس ملک کی فی مربعہ میل آبادی سے نہیں لگا سکتے۔ امریکہ اور مصر کی آبادی فی مربعہ میل کے حساب سے برابر ہے، لیکن ان کی معاشی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے، انگلستان اور امریکہ کی آبادی میں بہت زیادہ فرق ہے، لیکن معاشی اعتبار سے دونوں ملکوں کی حالت ایک جیسی ہے، اس لئے کسی ملک کی معاشی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے آبادی کا گنجان اور کم ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، زیرِ بحث ملک کی حالت کا اندازہ کرنے

کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی آبادی اور معاشی حیثیت کا بھی جائزہ لیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے جہاں بارشیں زیادہ ہوں وہاں آبادی زیادہ ہوتی ہے، بیشک بارش کا اثر زرعی علاقوں پر نہایت عمدہ ہوتا ہے، لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حد سے زیادہ بارش ہونے سے نقصانات بھی ہوتے ہیں، ہمارے ملک میں جہاں جہاں بارشیں بکثرت ہوتی ہیں وہاں نسبتاً آبادی بہت کم ہے، اگر عمدہ زراعت سے آبادی پر اثر پڑتا ہے تو مصنوعی آبپاشی کو بھی آبادی بڑھانے میں بہت کچھ دخل ہے، ہندوستان کا بہت کم رقبہ ایسا ہے جسے مصنوعی ذرائع سے سیراب کیا جاتا ہے، اس لئے یہاں آبپاشی کو آبادی سے دُور کا تعلق ہے، حقیقت امر یہ ہے کہ عمدہ زراعت کا انحصار زمین کی اصلیت پر ہے، اگر کہیں قابلِ زراعت زمین ہموار ہے تو وہاں چپّہ چپّہ پر زراعت ہو سکتی ہے، برخلاف اس کے اونچی نیچی اور غیر ہموار زمینیں عام طور پر ناقابلِ زراعت ہیں، ہندوستان کے ان علاقوں میں آبادی بکثرت ہے جہاں سطح زمین ہموار اور زرخیز ہے، بنگال صوبجات متحدہ میں بہت زیادہ آبادی ہے لیکن آسام میں ناموافق آب و ہوا اور کثرت باراں کی وجہ سے معاشی ذرائع محدود ہیں اس لئے وہاں آبادی بھی کم ہے، زمین کا عمدہ ہونا اسی وقت آبادی پر اثر انداز ہو سکتا ہے جبکہ بارش ضرورت

کے مطابق ہو، چونکہ ہندوستان میں بارش خاص اندازے سے نہیں ہوتی اس لئے اس کا بھی آبادی میں کوئی خاص دخل نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ حبِ وطنی یعنی ترک وطن نہ کرنے کی عادات ذرائع آمد و رفت کی کمی وغیرہ کا بھی آبادی پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑتا ہے، بدقسمتی سے یہ اثرات بھی یہاں بالکل مفقود ہیں، غیر ملک تو دور رہے، ہندوستان کے باشندے اپنے ملک میں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پسند نہیں کرتے۔

تقسیم آبادی (۱) مذہب | ہندوستان کی آبادی کی تقسیم کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں آبادی مذہب کے اعتبار سے مخصوص خطوں میں پھیلی ہوئی ہے، اگرچہ ذرائع آمد و رفت کی ترقی نے ہر قوم کے لوگوں کو دور دور پہنچا دیا ہے، لیکن پھر بھی ہنود وسط و جنوبِ ہند میں زیادہ آباد ہیں، صوبۂ مدراس میں ہنود کی آبادی ۸۹ فیصدی ہے، آسام، بہار، اوڑیسہ، صوبجات متحدہ و متوسط ہند میں بھی اور اقوام کی نسبت ہنود کی کثرت ہے، صوبۂ سرحد، بلوچستان، کشمیر، پنجاب، مشرقی بنگال اور سندھ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، برما میں بدھ مت کے پیرووں کی ۸۵ فیصدی آبادی ہے۔ سکھ محض پنجاب میں آباد ہیں، ہندوستان میں تقریباً ۱۲½ لاکھ جینی ہیں، جن میں سے نصف سے زائد صوبہ بمبئی اور ریاست بڑودہ میں رہتے ہیں، پارسی اور یہودی صوبہ بمبئی میں زیادہ ہیں،

عیسائی زیادہ تر جنوبی ہندوستان میں جاگزیں ہیں، قدیم اقوام کے لوگ عام طور پر بہار اوڑیسہ صوبجات متوسط، بنگال، برما، راجپوتانہ اور حیدرآباد دکن وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کی آبادی کے ہر فرقے کے لوگوں کا شعار، مذہبی عقائد اور رسوم جُدا جُدا ہیں، مثلاً مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جو پیدا ہوتا ہے، وہ اپنا رزق اپنے ساتھ لاتا ہے گویا ہر شخص کو روٹی دینے والا خدا ہے، اس میں کوئی شک نہیں، کہ رزاق مطلق خُدا ہی ہے، لیکن ہمیں خداوند تعالےٰ نے عقل اس لئے دی ہے کہ ہم دُنیا کے ہر مسئلے پر غور وخوض کرسکیں، ضرر رساں چیزوں سے پرہیز کریں، اور اپنی عقل کی برکت سے خوشحال زندگی بسر کریں، آبادی کا مسئلہ بھی دُنیاوی مسئلہ ہے، اور اس کو اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے، اسی لئے اکثر لوگ اُس وقت تک شادی بیاہ نہیں کرتے جب تک وہ شریک زندگی اور اولاد کے فرائض سے سبکدوش ہونے کے قابل نہیں ہو جاتے، جو لوگ ازدواج کے اس پہلو کو مدنظر نہیں رکھتے وہ ہمیشہ پریشان رہتے ہیں، بلکہ ان کی پریشانی کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، جس قدر افراد بڑھتے ہیں، اُسی قدر دُنیاوی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے کے مواقع کم ہوتے جاتے ہیں، ایک خاندان میں جتنے افراد زیادہ ہوتے ہیں، اتنا ورثہ انہیں کم ملتا ہے، کثیر الاولاد لوگ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں اور وہ لوگ بھی خوب سمجھتے ہیں،

جن کو براہ راست نقصان پہنچتا ہے۔

(۲) پیشہ | ہندوستان کے ۷۱ فی صدی باشندوں کا انحصار زراعت یا اس سے متعلقہ پیشوں پر ہے، اگر اس میں ۳ فیصدی اور افراد شامل کر لئے جائیں تو وہ لوگ بھی آجائیں گے جو خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے ہیں اور فصلوں کے بونے اور کاٹنے میں زمینداروں اور کاشتکاروں کو مدد دیتے ہیں، ہندوستان میں صنعت وحرفت دس فیصدی آبادی کے لئے روزی کمانے کا ذریعہ ہے، مگر زیادہ تعداد غیر منظم صنعتوں میں مصروف ہے، یہ لوگ عام طور پر معمولی ضرورت کی چیزیں اور زرعی آلات وغیرہ بناتے ہیں، منظم صنعت وحرفت کے کارخانے محض ایک فیصدی آبادی کے لئے روزگار مہیّا کر سکتے ہیں، تجارت اور ذرائع نقل وحمل میں تقریباً چھ سات فیصدی افراد کو کام مل سکتا ہے، اور بہت ہی کم افراد ہیں جو زرعی تحصیلات کو بیچنے کی خدمات انجام دیتے ہیں، تحفظ اور نظام ملک کا کام تقریباً نصف کروڑ یا ½ ۱ فیصدی آدمیوں سے چل رہا ہے، باقی افراد خانہ داری اور دیگر غیر منفعت بخش پیشوں اور کاموں سے شکم پُری کرتے ہیں، اکثر صوبے مثلاً بمبئی، بنگال، بہار، اوڑیسہ وغیرہ اگرچہ صنعت اور تجارت کے مرکز ہیں، لیکن پھر بھی اُن کی بیشتر آبادی کی گزران زراعت پر ہے۔

تمام دُنیا میں جتنے مہذب ممالک ہیں اُن میں فقط ہندوستان

ہی ایک ایسا ملک ہے جس کی آبادی کی گزر محض زراعت پر ہے، گویا یہاں بہت ہی کم تعداد ان لوگوں کی ہے جو صنعت وحرفت اور تجارت وغیرہ سے روزی پیدا کرتے ہیں، ظاہر ہے اگر ہندوستان جیسا طویل وعریض ملک محض زراعت پر قناعت کریگا تو اس کا مستقبل کبھی درخشندہ نہیں ہوسکتا، زراعت پر بھروسہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بارش پر اعتماد کرتے ہیں، اگر سوء اتفاق سے بارش نہ ہو تو سمجھ لیجئے قیامت آگئی یا اگر بارش ضرورت سے زیادہ ہوگئی تو خوشحالی کی تمام اُمید منقطع ہوگئیں۔

(۳) شہر اور دیہات | کسی ملک کی آبادی شہروں اور دیہاتوں کے اعتبار سے بھی تقسیم کی جاسکتی ہے، اگر ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں کا شمار کیا جائے تو شہروں کی نسبت دیہاتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان زرعی ملک ہے ہمارے ملک میں تقریباً پونے تین ہزار شہر ہیں اور سات لاکھ دیہات، ہندوستان کے شہروں کی آبادی زیادہ سے زیادہ گیارہ بارہ فیصدی ہے، یورپ کے ملکوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں ۷۸ فیصدی اور امریکہ میں ۵۲ فیصدی شہری آبادی ہے، بہرحال ہمارے ملک میں صنعت وحرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ بہت سے دیہات شہر بن رہے ہیں، چنانچہ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان ہمارے پچاس ہزار آبادی والے

شہروں میں سولہ فیصدی سے زائد اضافہ ہوا لیکن اس سے کم آبادی کے شہر بہت ہی کم ترقی کر سکے، دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں یہ ترقی آٹے میں نمک کے برابر ہے، ۱۸۹۰ء میں جرمنی کے نوّے فیصدی باشندے دیہاتوں میں رہتے تھے لیکن آج کل ۵۴ فیصدی شہروں میں آباد ہیں، اسی طرح آسٹریلیا کی دیہاتی آبادی ۱۸۴۳ء میں ۹۱ فیصدی تھی، لیکن ۱۹۱۰ء کے اعداد و شمار کے مطابق تقریباً ۷۳ فیصدی شہری آبادی ہو گئی، گویا صرف ۲۷ فیصدی دیہاتی آبادی باقی رہ گئی۔

ہندوستان میں شہری آبادی کم ہونے کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ نئی تہذیب کی دوڑ میں دوسرے ممالک سے بہت پیچھے ہیں، ممکن ہے دیہاتی لوگ بعض خوبیوں میں شہریوں سے بہتر ہوں، لیکن ماننا پڑے گا کہ جو تہذیبی خصوصیات شہریوں میں ہیں، گاؤں والے عموماً ان سے محروم ہیں، اسی لئے وہ سیدھے سادے کہلاتے ہیں، بہرکیف چونکہ ہندوستان کی بیشتر آبادی دیہاتوں میں آباد ہے، اس لئے ہندوستان ان ممالک کا مقابلہ نہیں کر سکتا جن کی شہری آبادی زیادہ ہے، ہندوستان کو دوسرے ممالک کے برابر لانے کے لئے ضروری ہے کہ دیہاتوں کو شہروں میں تبدیل کیا جائے، یہ مقصد صنعت و حرفت اور تجارت وغیرہ کو ترقی دینے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے، تہذیب و تمدّن چونکہ

شہروں میں ترقی پاتا ہے، اس لئے ہمیں اپنی شہروں کی آبادی بڑھانے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیئے ' ورنہ اندیشہ ہے کہ ممبئی اور کلکتہ کی طرح کے شہر اپنے باشندوں کے لئے چند در چند خطرات کا موجب بن جائیں گے، ہر صوبے میں ان شہروں کو ترقی دینی چاہیئے جن میں صنعت وحرفت اور تجارت کو ترقی دینے کے لئے آسانیاں موجود ہیں' اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ آبادی ایک ہی شہر میں نہیں بڑھے گی، بلکہ سارے ملک کو ترقی کا موقع ملے گا۔

(۴) زن و مرد | اگر آبادی کو زن و مرد کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کھاتے پیتے گھرانوں کی عورتوں کو چھوڑ کر عام گھروں کی عورتیں کچھ نہ کچھ مزدوری ضرور کرتی ہیں، ان کی کارکردگی کا اُجرت پر بھی کافی اثر پڑتا ہے، سنہ ۱۹۲۱ء کے اعداد و شمار کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ہزار مردوں کے مقابلہ میں ۹۴۵ عورتیں تھیں، اِن اعداد و شمار کا دوسرے ملکوں کے ساتھ مقابلہ کیجئے تو معلوم ہو، کہ یہاں لڑکیاں زیادہ تعداد میں پیدا ہوتی ہیں، لیکن دس سال کی عمر کے بعد ان کی تعداد کم ہونی شروع ہوتی ہے، اور سِن بلوغت کو پہنچنے تک بہت ہی کم رہ جاتی ہے، اس کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ ہندوستان کا ماحول لڑکیوں کے لئے دوسرے ممالک کی نسبت ناموافق ہے، قدیم زمانے میں تو لڑکیوں کا گلا پیدا ہوتے ہی گھونٹ دیا جاتا تھا، کہ

باپ کو خسر بننے کی شرمندگی نہ اٹھانی پڑے، خدا کا شکر ہے کہ اس قبیح رسم کا بالکل خاتمہ ہو چکا ہے، لیکن ابھی کئی ایسی خطرناک رسمیں موجود ہیں جو عورتوں کی صحت خراب کر کے بہت جلد ان کو موت کے گھاٹ پار اُتار دیتی ہیں، مثلاً بلوغت سے پہلے شادی کرنے کی قدیمی رسم، اور زچگی کے بے وقت تجربے سے بہت زیادہ جانیں ضائع ہوتی ہیں، حفظان صحت کے اصولوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بڑی بڑی خطرناک اور مہلک بیماریاں لگ جاتی ہیں، نسوانی آبادی کی زندگی کا تاریک ترین پہلو یہ ہے کہ عام طور پر عورتیں اپنی جان کو عزیز نہیں رکھتیں اور مرد بھی عورت کی چنداں پروا نہیں کرتے، مفلوک الحالی اور لاعلمی کی وجہ سے زچگی سے پہلے اور بعد پوری طرح آرام نہیں کیا جاتا، عام طور پر دائیاں اپنے فن سے کماحقہٗ واقف نہیں ہوتیں، ان کی بے احتیاطیوں سے زچاؤں کی صحت کو سخت نقصان پہنچتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہمیشہ عورتوں کی تعداد مردوں سے کم رہتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عام طور پر بڑے بڑے شہروں میں مردوں کی آبادی عورتوں سے زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ ان شہروں میں جو لوگ مضافات سے محنت مزدوری کرنے کے لئے آتے ہیں، وہ اپنی عورتوں کو ساتھ نہیں

لاتے، وہ اپنے دیہاتوں ہی میں رہتی ہیں، اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہیں، اس غیر متناسب نسبت کا شہر کی اخلاقی حالت پر جو کچھ اثر پڑتا ہے اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا باعث پردے کا رواج ہے حقیقتاً پردے کی وجہ سے جو عورتیں گھروں سے باہر نہیں نکلتیں، ان کی تعداد بہت ہی کم ہے، کہا جاتا ہے، اگر عورتیں محنت مزدوری نہ کریں تو مرد زیادہ کما سکتے ہیں، افسوس کہ ہمارے ملک کی مالی حالت ایسی نہیں کہ عورتیں بیکار رہیں، اگرچہ مرد کی بلند ذہنیت کا تقاضا یہی ہے کہ عورتیں گھروں میں آرام کریں" اور محض خانہ داری کی خدمات انجام دیں،

(۵) عمر | ہمارے ملک کی آبادی کو اگر عمر کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دس سال سے کم عمر کے بچے بڑی عمر کے آدمیوں کی نسبت زیادہ تعداد میں محنت مزدوری کرتے ہیں، لطف یہ ہے کہ جوں جوں عمریں بڑھتی جاتی ہیں، محنت کرنے والے افراد کی تعداد میں کمی ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ لوگ جو ستّر سال سے زیادہ عمر پاتے ہیں، ان کی تعداد ہزار پیچھے ۷ رہ جاتی ہے۔
ہم اس لحاظ سے ہندوستان کا دوسرے ممالک سے مقابلہ کریں تو بہت ہی افسوسناک نتائج برآمد ہوتے ہیں، ہندوستان میں مدّتِ عمر اس قدر کم ہے کہ ۵۰ سال کی عمر کو پہنچنے تک بیشتر لوگ راہیِ

ملکِ عدم ہو جاتے ہیں، اس تحقیق کا سب سے زیادہ بھیانک پہلو یہ ہے کہ ہمارے ملک کے محنت کش بچے دس اور بیس سال کی عمر میں تقریباً نصف کے قریب مر جاتے ہیں، انگلستان میں عام طور پر بچوں کو پندرہ سال کے بعد کام میں لگایا جاتا ہے اور وہ تقریباً ۶۵ سال تک محنت مزدوری کرتے رہتے ہیں، برخلاف اس کے ہندوستان کی حالت یہ ہے کہ بہت چھوٹی عمر میں بچے محنت مزدوری کرنی شروع کر دیتے ہیں، بُری خوراک اور بے وقت کی محنت سے اوّل تو وہ دیر تک زندہ ہی نہیں رہتے، اگر بچ جاتے ہیں تو اُن سے بڑی عمر میں کام کاج نہیں ہو سکتا، ہندوستان میں دس سال سے لے کر ۴۰ سال تک محنت مزدوری کی قابلیت باقی رہتی ہے، اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری محنت کرنے والی آبادی چالیس فیصدی سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن انگلستان اور فرانس میں تقریباً ساٹھ فیصدی لوگ اس گروہ میں شامل ہیں، اگر ہمارے ملک میں عوام کی صحت کی حفاظت کی جائے تو بہت سی جانیں بے وقت ضائع ہونے سے بچ جائیں اور اس طرح سے خود بخود محنت مزدوری کرنے والے گروہ کی تعداد میں اضافہ ہو جائے۔

یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ "تقسیم اعمار" میں تبدیلیاں بھی واقع ہوتی رہتی ہیں، کبھی قدرتی طور پر شرح اموات و پیدائش میں تبدیلی ہو جاتی ہے، کبھی جنگیں اور فسادات، قحط سالی اور وبائیں وغیرہ

اموات کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کر دیتی ہیں، ان سب ناگہانی بلاؤں کا اثر مختلف عمر کے لوگوں کی زندگیوں پر مختلف پڑتا ہے، مثلاً جنگ میں نوجوان زیادہ مارے جاتے ہیں، قحط میں جوانوں سے زیادہ بچّے مرتے ہیں، وبائیں جوانوں کا زیادہ شکار کرتی ہیں، نوجوانوں کی اموات سے ایک طرف آبادی کم ہوتی ہے اور دوسری طرف رفتار پیدائش سُست ہو جاتی ہے۔

(۶) پیدائش و اموات — اکثر مفکرین کا خیال ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا صحیح اندازہ محض پیدائش و اموات کے اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے، حقیقتاً پیدائش و اموات کے لحاظ سے ہندوستان بہت بلند درجہ رکھتا ہے، آبادی گھٹانے کے دیگر ارکان یہاں مفقود ہیں، سنہ ۱۹۱۱ء کے گوشوارے سے پتہ چلتا ہے کہ اوسطاً یہاں ہر صُوبے میں ہزار پیچھے ۴۲ افراد کا اضافہ اور ۳۹ افراد کی کمی ہوئی، برخلاف اس کے انگلستان میں فی ہزار ۳۱ کی پیدائش اور ۱۹ کی اموات وقوع میں آئیں، اور سنہ ۱۹۲۶ء میں یہ تعداد کم ہوتے ہوتے بتدریج ۱۸، اور ۱۲ رہ گئی، اسی سال ہندوستان میں بھی کسی قدر کمی واقع ہوئی، اور پیدائش و اموات کی تعداد ۳۵، اور ۲۷ تک آگئی۔

جن ممالک میں پیدائش افراد زیادہ ہوتی ہے وہاں اموات بھی زیادہ ہوتی ہیں، چونکہ ہمارے ملک کا نمبر پیدائش کے لحاظ سے بہت ہی اونچا ہے، اس لئے یہاں اموات کا درجہ بھی بلند ہے، ہندوستان میں اموات

کی کثرت کا سبب مفلوک الحالی ہے، پوری خوراک نہ ملنے سے امراض کا مقابلہ نہیں ہو سکتا، اس لئے وبائی امراض مثلاً ملیریا، ہیضہ، پلیگ، چیچک اور انفلوانزا وغیرہ سے لاکھوں جانیں ہر سال تلف ہو جاتی ہیں، قوت مدافعت نہ ہونے کے سبب سے کمزور انسان طویل العمر بھی نہیں ہو سکتے، وبائی امراض تو ہر ملک میں ہوتے ہیں، لیکن جہاں اصولات صحت کی اچھی طرح نگہداشت کی جاتی ہے، وہاں نقصانات بہت کم ہوا کرتے ہیں، چنانچہ یورپین ممالک میں وبائی امراض سے بہت کم جانیں تلف ہوتی ہیں، عمر طبیعی سے پہلے مر جانے سے ہمارے ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے، وہ لوگ جو مسلسل محنت اور لاتعداد روپیہ صرف کر کے علوم کے مختلف شعبوں میں تجربہ حاصل کرتے ہیں، عین اس وقت داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں، جب ان کی قابلیت اور تجربے سے ملک کو حقیقی فائدہ پہنچنے کا وقت آتا ہے۔

ہندوستان کی شرح اموات میں کمسن بچوں اور نوجوان مستورات کی اموات نمایاں نظر آتی ہیں، $\frac{1}{5}$ نوزائیدگان تقریباً ایک سال کے اندر ہی اندر مر جاتے ہیں، اور اموات کے میزان کا $\frac{1}{5}$ حصہ بچے ہی پورا کرتے ہیں، بڑے بڑے شہروں میں بچوں کی اموات زیادہ ہوتی ہیں، حالانکہ وہاں حفظان صحت کے نام نہاد محکمے بھی موجود ہوتے ہیں، بمبئی میں فی ہزار ۵۵٦ بچے مرتے ہیں، اور اس

کے برعکس لندن میں ہزار بچیچھے محض ۶۰ کی اوسط ہے۔

باوجود انتہائی چیخ پکار اور معقول انسداد کے اس نقصان میں کمی نہیں ہوئی، اس کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ یہاں بیاہ شادیاں سن بلوغت کو پہنچنے سے پہلے کر دینے کا رواج ہے، اس سلئے صحت خراب ہو جاتی ہے، اور تندرست بچے پیدا نہیں ہو سکتے اگرچہ اب قانون بھی بنا دیا گیا ہے، لیکن اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہو سکا۔ بعض غیر تعلیم یافتہ عورتیں اپنے بچوں کو افیون وغیرہ کھلا دیتی ہیں کہ خود آسانی سے کام کاج کر سکیں، مفلسی کی وجہ سے زچہ کی حفاظت بہت کم ہوتی ہے، اس سلئے بیشتر زچاؤں کی جان زچہ گیری کے زمانے ہی میں ضائع ہو جاتی ہے، پھر کمزور ماؤں کا دودھ بچوں کی صحت خراب کر دیتا ہے، شہروں میں خالص دودھ اور عمدہ خوراک میسّر نہیں آتی، اس سلئے بچہ اور زچہ دونوں کمزور ہوتے ہیں، اور عمر طبیعی کو پہنچنے سے پہلے اپنی جان شیریں جان آفریں کے سپرد کر دیتے ہیں۔

آبادی کا ازدیاد اگر ہم ہندوستان کی گزشتہ پچاس سال کی آبادی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں یہاں آبادی میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ کیونکہ شرح اموات و پیدائش تقریباً برابر رہی ہے۔ ۱۸۷۲ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان ہندوستان کی آبادی محض بیس فیصدی بڑھی، ۱۹۱۸ء میں انفلوانزا پھیلا اور بارشوں کی قلت

سے ہندوستان کی نوجوان آبادی کو سخت نقصان پہنچا، سنہ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان اگرچہ کوئی مصیبت نازل نہیں ہوئی، لیکن پھر بھی ہماری آبادی میں محض ½۱۰ اضافہ ہوا،

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ روز بروز دُنیا کی آبادی بہت سُرعت سے بڑھ رہی ہے، لیکن اس بات کا تاریخی کتب سے ثبوت نہیں ملتا، اطرافِ عالم میں جس قدر آبادی بڑھی ہے، وہ محض موجودہ دَور کا کارنامہ ہے، گذشتہ صدی میں دُنیا کی آبادی ۹۱۰۰ ہزار لاکھ سے ۱۸۵۱۰ ہزار لاکھ ہوئی، اس کے اسباب یہ بتائے جاتے ہیں کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں سائنس کی ترقی سے صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت کو عروج حاصل ہو کر دُنیا کی مالی حالت بہتر ہوئی، اس لئے آبادی بھی زیادہ سے زیادہ بڑھی، آج کل ماہرینِ معاشیات و سیاسیات کے دماغ اِس مسئلے کی طرف متوجہ ہیں کہ آبادی کی موجودہ تیز رفتاری ہماری خوشحالی کے معیار کو قائم رکھ سکے گی یا نہیں، یا ترقی کا دَور گزر چکا ہے، اِس لئے کیا اب ہمیں آبادی کو بڑھنے سے روکنا چاہیئے تاکہ معیارِ زندگی کہیں پھر پست نہ ہو جائے؟ بیشتر مفکرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اب مزید ترقی کے امکانات نہیں رہے، اگر زیادہ آبادی بڑھی تو موجودہ معیارِ زندگی پست ہو کر بہت جلد خوشحالی کا دور خواب و خیال ہو جائے گا۔

ہندوستان میں بھی یہی مسئلہ درپیش ہے، اور خیال یہ ہے کہ آبادی کی ترقی ملک کی مفلوک الحالی کا باعث ہو رہی ہے لیکن مخالف جماعت اس کی تردید کرتے ہوئے آبادی کے ازدیاد کا احساس مفلسی کا باعث خیال کرتی ہے۔

اس سے پیشتر کہ ہندوستانی آبادی کے ازدیاد پر بحث کی جائے، ضروری ہے کہ ہم "ازدیاد آبادی" کے صحیح معنی کو واضح کر دیں تاکہ ملک کی اصلی حالت آئینہ ہو جائے۔

جب کسی مخصوص زمانے میں محنت کا صلہ محنت کرنے والوں کی تعداد کم اور زیادہ ہونے سے اثر پذیر ہونے لگے تو سمجھنا چاہیے کہ تکثیر حاصل کا وقت آگیا ہے جس طرح ہر ایک صنعت میں تکثیر حاصل کا درجہ مقرر ہوتا ہے اس طرح آبادی میں بھی یہ درجہ معیّن ہے، اگر آبادی اس قدر کم ہو کہ تمام صنعتوں کو اس درجے تک نہ لا سکے تو آمدنی کم ہو گی اس کا علاج یہ ہے کہ آبادی بڑھائی جائے، برخلاف اس کے اگر آبادی اس قدر زیادہ ہو کہ اس درجہ سے آگے گزر جائے تو اس حالت میں بھی آمدنی کم ہو گی، اور اس کا علاج یہ ہے کہ آبادی کو گھٹایا جائے۔

اگر آبادی زیادہ بڑھتی ہے تو محنت کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ جاتی ہے، ان کے بڑھنے سے ملک کی دولت میں بھی اضافہ ہونا چاہیے، اگر ضرورت سے زیادہ ان کی تعداد ہو جائے تو آمدنی

میں کمی ہو جاتی ہے، گویا پیداوار دولت اور ان لوگوں میں ایک خاص نسبت قائم رہنی چاہیئے، جن میں دولت تقسیم ہوتی ہے، اگر یہ لوگ کم ہوں گے تو ان کو زیادہ حصّہ ملے گا اور اگر زیادہ ہوں گے تو ان کا حصّہ کم ہو جائے گا، چنانچہ جب آبادی بڑھتی ہے اور اس کے ساتھ دولت نہیں بڑھتی تو یہی صورت پیدا ہو جاتی ہے، بس یہی پہچان آبادی کے بڑھنے اور کم ہونے کی ہے،

اگر انسانوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور کسی قسم کی رکاوٹیں ان کے راستے میں حائل نہ ہوں تو ملک کی آبادی چند سال میں تگنی چوگنی ہو جانی معمولی سی بات ہے، اندریں حالات اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم جس قدر بھی مالی ترقی کر جائیں وہ طبعی آبادی کو سنبھالنے کے لئے بالکل ناکافی ہے، اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس ملک میں بغیر کسی رکاوٹ کے آبادی بڑھے وہاں آبادی یقیناً ضرورت سے زیادہ ہوگی، اس کے علاوہ شرح اموات و پیدائش کی کثرت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ آبادی بکثرت ہے۔

اس نظریئے کی روشنی میں ہم ہندوستان کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں، سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں آبادی کو روکنے کے لئے کچھ انسدادی تدابیر بھی اختیار کی گئی ہیں یا نہیں، اگر ہم اس نتیجے پر پہنچیں کہ ہمارے ملک میں انسدادی تدابیر بہت ہی کم عمل میں آتی ہیں اور آبادی کی روک تھام قدرتی

طور پر ہوتی رہتی ہے تو خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ رہی ہے۔

آبادی کی روک تھام دو طریقوں سے ہوتی ہے، اوّل قدرتی طور پر یعنی وبائیں، جنگیں، فسادات اور حادثات سے آبادی کم ہو جاتی ہے، لیکن جن ملکوں میں حفظانِ صحت کا اچھا انتظام ہے، وہاں وباؤں سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچتا، آخر مجبور ہو کر خود اختیاری طریقوں سے آبادی کو سُست رفتار بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، مثلاً عام طور پر شادی بیاہ بہت ہی کم ہونے لگتے ہیں کیونکہ لوگ بچوں کو پالنے اور بیوی کے اخراجات برداشت کے قابل نہیں ہوتے، اس لئے یا تو شادی نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو اس وقت جب وہ تمام اخراجات کے کفیل ہو سکتے ہیں، کوشش کی جاتی ہے کہ اولاد پیدا نہ ہو یا ایک بچے اور دوسرے بچے کی پیدائش میں کافی وقفہ ہو، (۲) بعض ناعاقبت اندیش لوگ اپنے بچے قبل از وقت یا پیدائش کے بعد ضائع کر دیتے ہیں۔

اور ممالک کی نسبت ہمارے ملک کے دستور اور رسم و رواج کچھ نرالے ہیں، مغربی ممالک میں شادی بیاہ کو مذہبی حیثیت سے کوئی خاص وقعت نہیں دی جاتی، لیکن اسلام میں رہبانیت گناہ ہے، ہندو شادی کرنا اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ ماتمی رسم بیٹا ادا کرے تاکہ روح کو ابدی چین نصیب ہو، اس کے علاوہ والدین

اپنے ہاتھ سے شادی کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں، اس لیئے قبل از وقت شادی کر دیتے ہیں، چونکہ عورتیں خانہ داری کی خدمات انجام دیتی ہیں، اس لئے شادی کرنے میں تامل نہیں کیا جاتا، عام طور پر عورتیں محنت مزدوری بھی کرتی ہیں، اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ شادی کرنے سے اخراجات نہیں بڑھیں گے، اِسی طرح بچّوں کو بھی بہت تھوڑی عمر میں کسی نہ کسی کام پر لگا دیا جاتا ہے، چونکہ ہندوستان میں معیارِ زندگی بہت ہی پست ہے اس لئے بچّے بغیر تعلیم حاصل کئے کوئی نہ کوئی معمولی سا کام کرنے لگتے ہیں، اس سے نقصان یہ ہے کہ وہ اپنے پیشے کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔

اب ذرا اعداد و شمار بھی دیکھئے، ہمارے ملک میں مرد پانسو فی ہزار غیر شادی شدہ ہیں اور عورتیں ۳۶۰ فی ہزار، اور ملکوں کے مقابلے میں یہ تعداد بہت ہی زیادہ ہے، اس کے علاوہ ہندوستان میں تقریباً ہزار پیچھے آٹھ سو لڑکیوں کی شادی پندرہ سال کی عمر تک کر دی جاتی ہے، تعلیم یافتہ طبقے میں آج کل دیر سے شادیاں کرنے کا رواج ہو رہا ہے، اور حکومت نے کمسنی کی شادی کو روکنے کے لئے ایک قانون بھی بنا دیا ہے۔

ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہماری آبادی ضرورت سے زیادہ رفتار سے بڑھ رہی ہے اوّل

تو خود اختیاری انسداد کی تدابیر اختیار ہی نہیں کی جاتیں، اور اگر ان کا کچھ اثر ہے تو بہت ہی کم جس کو حساب و شمار میں بھی نہیں لایا جاسکتا، یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ وہ لوگ جو آبادی بڑھانے کے معاملے میں اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلاتے ہیں، آخرکار انہیں ایسے طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں جن کی اجازت اخلاق، مذہب اور قانون ہرگز نہیں دیتا، اُمید کی جاتی ہے کہ سماج کی اصلاح اور تعلیم کی روشنی بہت جلد عوام کو بیدار کر دے گی، اور ہر شخص اُس وقت ازدواج کی طرف متوجہ ہوگا جب وہ اپنے آپ میں اس بارگراں کے اُٹھانے کی ہمّت پائیگا۔

جس وقت کسی ملک میں نوزائیدگان کی تعداد اس قدر بڑھ جائے، کہ شخصی اور ملکی آمدنی ان کی کفیل نہ ہوسکے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ رہی ہے، بعینہ یہی حالت ہندوستان کی ہے، یہاں شرح اموات و پیدائش دُنیا کے تمام مُلکوں سے زیادہ ہے۔

ملکی آمدنی کی تقسیم کسی مُلک کی مالی حالت کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی کل آمدنی جمع کرکے تمام افراد پر تقسیم کردی جائے تاکہ معلوم ہوسکے ہر شخص کی اوسط آمدنی کیا ہے، ہندوستان کے متعلق اندازہ کیا گیا ہے کہ یہاں ہر شخص کے حصّے میں ۶۵ روپیہ سالانہ یعنی ساڑھے پانچ روپے ماہوار کے قریب آتے ہیں، اوّل تو اسی اندازے

ہیں فرق نہیں ہو سکتا اگر ہو گا تو بہت ہی تھوڑا، اب خیال کیجئے ہمارے ملک میں کتنے افراد ہیں جن کی آمدنی ساڑھے پانچ روپے سے بھی کم ہو گی، ہمارے کھاتے پیتے گھروں کے نچ کے نوکر بھی اس سے زیادہ کما لیتے ہیں، ان حالات سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے لوگ کثیر تعداد میں موجود ہیں جنہیں کبھی کبھی وقت سوکھی روٹی میسر نہیں آتی، بر خلاف اس کے ہر یورپین کی اوسط آمدنی تیرہ سو روپیہ سالانہ ہے، ملاحظہ فرمایئے ہماری آمدنی میں اور ایک یورپین کی آمدنی میں کس قدر فرق ہے۔

اس مفلسی کا اثر ہم لوگوں کی عمروں کو گھن کی طرح کھا رہا ہے، اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر ہندوستانی کی اوسط عمر ۲۳ سال سے زیادہ نہیں، جو لوگ ۲۳ سال سے زیادہ زندہ رہتے ہیں وہ ان لوگوں کی عمروں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں جو اوسط عمر تک پہنچنے سے پہلے مر جاتے ہیں، عمروں کے لحاظ سے بھی انگلستان کے باشندے ہم لوگوں سے بہت بڑھے ہوتے ہیں، وہاں ہر انگریز کی اوسط عمر تقریباً ۵۵ سال ہوتی ہے۔

اراضی کی تقسیم | ہندوستان ایک زرعی ملک ہے، اس کی خوشحالی اور فارغ البالی کا انحصار کلیتاً زراعت پر ہے، اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں جس قدر آبادی ہے اس کے لئے ہماری قابل کاشت زمینیں کافی ہیں یا نہیں۔

گزشتہ مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں فی مربع میل ۱۹۵ آبادی تھی، برطانوی ہندوستان کی کل زمین میں سے صرف ۲۳ کروڑ ۲۰ لاکھ ایکڑ رقبہ میں کاشتکاری ہوتی ہے، ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ رقبہ بنجر پڑا ہے، اس کے علاوہ ۱۶ کروڑ ۴۰ لاکھ ایکڑ مزید رقبہ قابلِ زراعت ہے، لیکن اسے کام میں نہیں لایا جاتا، نیز ۱۴ کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ زمین ناقابلِ حصول ہے اور ۸ کروڑ ۹۰ لاکھ ایکڑ میں جنگلات ہیں، اس تقسیم اور شمار کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی قابلِ کاشت زمین ابھی مزید آبادی کے لئے خوراک بہم پہنچا سکتی ہے۔

اگر ان زمینوں کو تمام آبادی میں تقسیم کر دیا جائے تو ۱۶۷۵ ایکڑ زمین ہر شخص کے حصّے میں آتی ہے، لیکن اگر ان زمینوں کو نکال دیا جائے جو بنجر پڑی ہیں یا جن میں زراعت نہیں ہو سکتی یا زراعت کے علاوہ کسی دوسرے کام میں آتی ہیں تو برطانوی ہندوستان میں ہر آدمی کو تین چوتھائی ایکڑ زمین بمشکل مل سکتی ہے، ظاہر ہے کہ اتنی زمین ایک آدمی کے سال بھر کے گزارے کے لئے کبھی کافی نہیں ہو سکتی۔

۱۹۳۳-۳۴ء میں کل بیس کروڑ ۶۵ لاکھ ایکڑ زمین میں کھانے پینے کی فصلیں بوئی گئی تھیں یا دوسرے الفاظ میں برطانوی ہندوستان کے کل ایک تہائی حصّہ میں زراعت ہوئی تھی۔

ضبط تولید | اگرچہ تمام متمدّن اقوام ضبط تولید پر عامل ہیں لیکن ہمارے

ملک میں اس کو بہت ہی بُرا خیال کیا جاتا ہے، آج سے دس سال پہلے ایک شخص نے ضبط تولید کا پرچار کرنے کی بدولت کافی نقصان اُٹھایا، اس پر مقدمہ چلایا گیا، اور ہر طرف سے لعنت ملامت اور پھٹکار بھی پڑی، امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ عوام اس مفید تحریک کی اہمیت کو سمجھتے جاتے ہیں، بلکہ بڑے بڑے شہروں میں حکومت کی طرف سے ضبط تولید کے ادارے بھی قائم کر دیئے گئے ہیں، اکثر ضرورتمند لوگ ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، ضرورت ہے کہ ان اداروں کا فائدہ عوام تک پہنچانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے۔

ضبط تولید کی مخالفت کرنے کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہر تحریک مذہب کی پشت پناہی سے کامیاب ہوتی ہے، سوء اتفاق سے مذہب ضبط تولید کے خلاف ہے، مسلمانوں کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ ہے کہ جو شخص پیدا ہوتا ہے وہ اپنا رزق ساتھ لاتا ہے، دوسرے رہبانیت مسلمانوں میں گناہ ہے، ہندوؤں میں بھی اسی قسم کے عقائد ہیں، اس لئے کوئی شخص بھی ضبط تولید کو اچھا نہیں سمجھتا، لیکن جب اولاد کی کثرت ہوتی ہے تو ہر شخص گھبراتا ہے، ایک شخص کو مَیں نے بچشم خود آنسوؤں سے روتا ہوا دیکھا کہ ان کے ہاں غیر ضروری مہمان نازل ہونیوالا تھا اور وہ اس کا بوجھ اُٹھانے کے قطعی ناقابل تھے، لیکن اگر کچھ تسلّی تھی تو یہی کہ خدا رزّاق ہے، بات یہ ہے ہر شخص کو اتنا ہی بوجھ

اٹھانا چاہتے جتنا وہ آسانی سے اُٹھا سکتا ہے، اور اسے اتنے پاؤں نہیں پھیلانے چاہئیں کہ فاقہ کشی کی نوبت آجائے اور اس کے مرنے کے بعد چند گداگر باقی رہ جائیں جو در بدر مارے مارے پھریں۔

یہاں یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ ضبط تولید کوئی نئی چیز نہیں ہے، کثرت اولاد وغیرہ سے بچنے کے لئے اگلے زمانے میں بعض طریقے مطبوع خاص وعام رہے ہیں، لیکن وہ ایسے وحشیانہ طریقے تھے کہ مذہب، قانون اور اخلاق ہرگز ان کی اجازت نہیں دیتا۔

ضبط تولید کے متعلق مدّتوں بحث مباحثے جاری رہے ہیں، جو لوگ اس کے حامی ہیں وہ اس کے فائدوں پر نظر رکھتے ہیں اور نقصانات کو یہ کہتے ہوئے نظر انداز کرتے ہیں کہ ہر چیز کے دو پہلو ہیں، عقل کا تقاضا یہ ہے کہ بُرائیوں کو ترک کرے اور خُوبیوں سے فائدہ اُٹھائے، ضبط تولید کے حامی یُورپ کی خوشحالی، شرح اموات میں کمی، اور طویل العمری وغیرہ کو ضبط تولید ہی کا نتیجہ تصوّر کرتے ہیں، مخالفین کی یہ رائے ہے کہ ضبط تولید سے بد اخلاقی بڑھ جائے گی، دُوسرے انسان فطرت کے راستے میں روڑے اٹکا کر گناہ گار ہوگا، موافقین اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ وہ عفت جو کسی خوف کی وجہ سے قائم ہو اس کا اخلاقی حیثیت سے ہونا یا نہ ہونا برابر ہے، اس کے علاوہ بعض لوگ محض اس وجہ سے شادی نہیں کرتے کہ وہ اولاد کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے اگر ان کو ضبط تولید کے اصولوں سے واقفیت

ہو گی تو وہ شادی سے پرہیز نہیں کریں گے، اس طرح سے اخلاقی خرابیوں کے امکانات اور بھی کم ہو جائیں گے، دوسرے پرانے زمانے کے ضبط تولید کے غیر مہذب طریقے عمومیّت حاصل نہیں کریں گے، اس کے علاوہ کوئی مذہب حزم و احتیاط کے خلاف نہیں اور نہ ہو سکتا ہے، ایک گروہ کا یہ اعتراض ہے کہ ضبط تولید سے مفلس لوگ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے جن کو حقیقتاً اس کی ضرورت ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جس قدر سرمایہ ایک بچّے کے پالنے پر صرف ہوتا ہے کیا ضبط تولید میں اس سے بھی زیادہ صرف ہو جاتا ہے۔

ضبط تولید کے متعلق یہ کہنا کہ ہر طبقے کے لوگوں کو اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے بڑی سخت غلطی ہے، اس سے انہی لوگوں کو استفادہ کرنا چاہیئے جنہیں حقیقتاً اس کی ضرورت ہے، ضرورت کے موقع پر حزم و احتیاط اخلاقی اور مذہبی نقطہ نظر سے کبھی مذموم نہیں ہو سکتی، مثلاً وہ عورتیں یا مرد جو ایسے متعدّی اور خطرناک امراض میں مبتلا ہوں جن سے آئندہ نسلوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اگر ضبط تولید سے مدد لیں تو انہیں کون مطعون کر سکتا ہے۔

یہ تمام احتیاطیں اس لئے ہیں کہ غیر ضروری افراد کا اضافہ نہ ہو اور انسانی زندگی کی خوشحالی کا معیار بلند ہو بہت ممکن ہے کہ ہمارے سائنسدانوں کے خوش آیند خوابوں کی تعبیریں سچی ہو جائیں، اور وہی زمین جو آج کل سانس لینے کے لئے تنگ معلوم ہوتی ہے، مزید

آبادی کے لئے وسیع ہو جائے، لیکن موجودہ حالات کو نظرانداز کر کے آئندہ پر تکیہ کرنا کبھی عقلمندی میں شمار نہیں ہو سکتا، شاید آئندہ نسلیں ہمارے اس حزم و احتیاط پر ہنسیں اور ہمیں بیوقوف کہیں لیکن اگر وہ ہمارے ماحول میں ہوتیں تو ضرور ہم سے ہمدردی رکھتیں اور ہماری تائید کرتیں،

بڑھتی ہوئی آبادی ایک خوفناک طوفان ہے جو خوشحالی کے اسباب کو اپنے ساتھ بہا لے جائیگا، اور صدیوں تک قوموں کو دوبارہ اُبھرنے اور ترقی کرنے کا موقع نہیں دے گا۔

ہندو مسلم فساد

فساد کی جڑ قدرت نے انسان کو متعدد قوتیں عطا کی ہیں، ان میں سے ایک کا نام قوّت غضبی ہے، جب انسان کو کسی خواہش کے پُورا کرنے سے روکا جاتے تو یہ قوّت جوش میں آجاتی ہے اور ان رکاوٹوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتی ہے جو بام مراد تک پہنچنے میں سدّ راہ ہوتی ہیں، اس قوّت میں خوبی یہ ہے کہ نقصان پہنچنے سے پہلے تحریک میں آتی ہے، اگر سُوءِ اتفاق سے کوئی نقصان پہنچ جاتے تو غضب کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے، اور وہ اس وقت تک ٹھنڈی نہیں ہوتی، جب تک انتقام نہ لیا جائے، اس کا جوش انتقام اتنا شدید ہوتا ہے کہ انسان مذہب، رشتہ داری، قانون اور خوفِ خدا غرض سب کچھ بھول جاتا ہے۔

اِس بحث سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ قوّت غضبی نہایت بُری قوّت ہے، قوّت غضب میں جہاں بُرائیاں ہیں وہاں اچھائیاں بھی ہیں، اگر قوّت غضبی نہ رہے تو طبیعت کے ولولے اور اُمنگیں مٹ جائیں، اِس قوّت کا فقدان انسان کو بے غیرت بے حیا اور پست ہمّت بنا دیتا ہے، اس لئے قوّت غضبی کی تربیّت میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے

آج تک دُنیا میں جس قدر فسادات، انقلابات اور بغاوتیں عمل میں

آئیں وہ اس قوت کے تحریک میں آنے سے واقع ہوئی ہیں، دُنیا میں سب سے پہلا خونی فساد ہابیل اور قابیل میں ہوا تھا، جس میں ذاتی منفعت کے لئے سگے بھائی نے سگے بھائی کو قتل کر کے اپنے غُصّے کی آگ کو اس کے خُون سے ٹھنڈا کیا تھا، اس کے بعد سے قوّتِ غضبی کو ٹھنڈا کرنے کا یہ طریقہ ایسا مطبوع اور مقبول ہوا کہ بنی نوع انسان آج تک اس پر عمل پیرا ہیں۔

جب ایک جگہ رہنے والوں میں حسد اور رشک کی ہوا آتشِ غضب کے شعلے بھڑکاتی ہے تو محبّت اور ہمدردی کم ہو کر نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، یہ منافرت یگانوں کو بیگانہ کر کے آپس میں دُشمنی پیدا کرتی ہے، دُشمنی اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا اس طرح راستہ ڈھونڈھتی ہے، جس طرح رُکا ہوا پانی پھُوٹ بہنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرتا ہے، دُشمنی بڑھنے سے ظاہری رواداری بھی مفقود ہو جاتی ہے، اور مخالف جماعت کا ہر فرد بھُوکے شیر کی طرح اپنے دُشمن کے پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔

بعینہ یہی حالت ہندوستان کی ہے، یہاں ہم مذہب اور ہم قوم جماعتوں میں بھی دشمنی ہے، اور غیر مذہب فرقوں میں بھی نفاق اور نفرت ہے؛ مخالفانہ اور معاندانہ جذبات اس قدر ترقّی کر گئے ہیں، کہ ہندو مسلمانوں میں آئے دِن خُون خرابے اور جھگڑے فساد ہوتے رہتے ہیں۔

سرکاری اور غیر سرکاری تحقیقات ہندو مسلم اختلافات کے متعلق سرکاری کمیشنوں کی تحقیقات کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر جو خالص ہندوؤں کا ملک تھا تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی اور ہندو تہذیب اور جذبہ آزادی کو سخت صدمہ پہنچایا اور ان کا مال و دولت چھین کر اپنے ممالک کو مالا مال کر لیا، اس کے علاوہ جو چیزیں مسلمانوں کے نزدیک حرام ہیں وہ ہندوؤں کے ہاں جائز ہیں، اب آزادی کا زمانہ ہے اور ہر شخص کو اپنے مذہب کے احکام بجا لانے میں کُلی آزادی ہے، ہندو اپنے کھوئے ہوئے حقوق کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان کی بجا آوری پر مصر ہیں، لیکن مسلمانوں کو یہ بات گوارا نہیں، یہی حالت مسلمانوں کی ہے، جب وہ اپنے حقوق کو پامال ہوتا دیکھتے ہیں تو آتش غضب سے مشتعل ہو جاتے ہیں، اور اس طرح سے ایک قوم کے خلاف دوسری قوم کے جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں، علاوہ ازیں موجودہ حکومت کے زیر سایہ ہندوؤں نے بہت ترقی کی ہے، لیکن مسلمان مذہبی عصبیت کی بدولت دُنیاوی ترقی میں ہندوؤں سے بہت پیچھے ہیں اس لئے دونوں قوموں میں منافرت کے جذبات بھڑک رہے ہیں۔

غیر سرکاری کمیشنوں کی تحقیقات اس کے بالکل برعکس ہے، ان کا خیال ہے، اگر ہندوؤں کو مسلمانوں سے دشمنی یا نفرت ہوتی تو اس زمانے میں ہوتی چاہیئے تھی جب ان کی آزادی کو چھینا اور ان کی تہذیب کو نقصان پہنچایا گیا تھا، لیکن ان دنوں ہندو مسلمانوں کا اتحاد مسلّم تھا

اور ایک دوسرے سے تعلقات نہایت خوشگوار تھے، ابتدائی حملہ آوروں سے شکایت یقیناً تھی کہ وہ ہندوستان کی دولت اپنے ملک میں لے جاتے تھے، لیکن ہمایوں کے دوسرے حملہ کے بعد یہ شکایت پیدا نہیں ہوئی، اکبر اعظم نے اتحاد اور محبت کے وہ پیمان کئے تھے کہ ابھی تک ان کا نقش دلوں پر باقی ہے، مذہبی احکام بجا لانے میں جن پابندیوں کا الزام لگایا جاتا ہے ان کو عمومیت کی سند نہیں دی جاسکتی، ہاں موجودہ حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ دو قوموں کو آپس میں لڑا کر حکومت کی جائے، مزید برآں اقتصادی اور معاشی مشکلات رواداری اور حسن سلوک کی دشمن ہیں، مذہبی تعصب اور فرقہ پرستی کی آگ بھڑکانے والے ہمیشہ دراندازی کرتے رہتے ہیں، ابتدائی تعلیم جن لوگوں کے ذریعہ دی جاتی ہے وہ بچوں کے دل دوسری قوم کی طرف سے مسموم کرتے ہیں، دلوں کی سادہ لوح پر یہ نقش ایسے بیٹھتے ہیں کہ مٹائے نہیں مٹتے، اخبارات محض پیسے کمانے کیلئے اشتعال انگیز اور جھوٹی سچی خبریں شائع کرتے ہیں، ہر مسئلہ کو فرقہ دارانہ رنگ دے کر کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی تو ہندو مسلمان ہوتے ہی تھے اب ہر چیز ہندو مسلمان ہو گئی ہے، اگر ریل میں سفر کرنے کا اتفاق ہو تو خوانچے والوں کی طرح طرح کی آوازیں سنئے، ہندو پانی مسلمان پانی، اسلامی چنے، ہندو چائے، مسلمان چائے، غرض ہر چیز ہندو مسلمان کی تفریق اور فرقہ پرستی کی شہادت دیتی ہے، اس کے علاوہ

فرقہ پرستی میں اُن لوگوں کو بھی دخل ہے جن کا ذریعہ معاش لٹھ بازی اور شرانگیزی ہے، اگر وہ ہندو مُسلم فساد برپا نہ کریں تو کھائیں کہاں سے، ایسے لوگ گلی کوچوں میں گدّوں کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں، جونہی کسی ہندو مسلمان میں اُونچی نیچی بات ہُوئی یہ لوگ خم ٹھونک کر ادھر اُدھر سے نکل آئے، انفرادی معاملہ اجتماعی بنا اور اجتماعی بنکر سارے شہر کی فضا پر چھا گیا، فرقہ پرست اخباروں اور حریفوں کی بن آئی، تقریر و تحریر سے ملک کے ہر گوشے میں نفرت کی آگ بھڑک اُٹھی۔

ہندو مسلم فسادات اور ان کے نتائج

ایک تو قدرت نے انسانوں کو مختلف الطبع بنایا ہے، اس پر مذہب کی تفریق معاشی اور انسانی مدارج و مراتب اور آب و ہوا کا اختلاف وہ اثر رکھتا ہے جو کریلے کی بیل کے نیم پر چڑھ جانے سے ظاہر ہوتا ہے، نفرت کی دبی ہُوئی چنگاریاں شرارے بن کر نکلتی ہیں اور خرمن امن میں آتش زنی کرتی ہیں، باہمی تعلقات بگڑ کر دلوں میں فرق آجاتا ہے، دشمنی اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے راستے ڈھونڈھتی ہے معمولی سی بات بڑی بات بن جاتی ہے، ایک آدمی کا جھگڑا قوم کا جھگڑا کہلاتا ہے، فسادات برپا ہوتے ہیں۔ ان فرقہ دار فسادوں کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اکثر ان لوگوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچتا ہے جن کا فساد سے دُور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا ان کا قصور محض اس قدر ہوتا ہے کہ وہ مخالف مذہب سے تعلق رکھتے ہیں،

گھروں سے نکلنا تو ہے ہی خطرناک گھر بیٹھے بھی جان محفوظ نہیں ہوتی، کیا پتہ کس وقت کوئی شرانگیز گھر کو آگ لگا دے یا موقع تاک کر حملہ ہی کر دے اور بیٹھے بٹھائے لینے کے دینے پڑ جائیں، بازار کے بازار بند پڑے ہیں، کاروبار بالکل بند ہیں، تاجروں کا لاکھوں کا نقصان ہو رہا ہے، جن کی ہر روز کی آمدنی روزانہ کا خرچ ہے، وہ فاقوں سے نیم جان ہیں، فساد کرنے والے کُشت و خون کر کے روپوش ہو گئے، ان کی لائی ہوئی مصیبت سے ہر شخص پریشان ہے اور سوچ رہا ہے دیکھئے اب کیا ہوتا ہے اور یہ فساد کیا رنگ لاتا ہے، گلی کوچوں میں سپاہیوں کی روند کھٹا کھٹ گشت لگا رہی ہے، گھر گھر کی تلاشیاں ہو رہی ہیں، دشمنوں کی بن آئی ہے، انتقام لینے کا بہتر ین موقع ہاتھ آیا ہے، چنوں کے ساتھ گھن بھی پس جائیگا، اور گیر و دار کا ایسا سماں بندھے گا کہ اس سے مدتوں چھٹکارا نہ ہوگا، مقدمے چلیں گے جس کے خلاف جرم ثابت ہوگا وہ قید کی کڑیاں جھیلے گا، کسی ایک کو پھانسی کی سزا ملے گی، کوئی عبور دریائے شور بھیجا جائیگا، پہلے مقدمہ بازیوں کے لئے قوم سے چندہ جمع کیا گیا تھا، اب شہیدوں کے پسماندگان کے لئے ضرورت ہے، باقاعدہ دفتر کھل گئے ہیں، سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے مذہب اور قوم کے نام سے آ رہے ہیں، دس بیس ضرورتمندوں کو بھی خوش قسمتی سے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے، باقی یار لوگوں کے جلسے جلوسوں میں صرف ہوتا ہے، قوم کی خدمت کا

بہانہ ہے، لیڈروں کے عیش ہیں۔

سیاست | ایک گروہ کا خیال ہے کہ فرقہ دارانہ فساد حکومت کے ایماء سے ہوتے ہیں، جب حکومت دیکھتی ہے کوئی جماعت اس کے مُنہ آنا چاہتی ہے، تو اُس کو دبانے کا ایک ڈھنگ یہ بھی نکالتی ہے، پہلے تماشا دیکھتی ہے پھر جس جماعت کو دبانا منظور ہوتا ہے اُس پر سختی کرنا شروع کر دیتی ہے گویا اس کی تمام طاقت کسی مخصوص مسئلے سے ہٹا کر اپنے آپ کو سنبھالنے اور بچانے پر مرکوز کر دی جاتی ہے، اس الزام میں کچھ حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن حکومت دو کو لڑا کر حکومت کرنے کی دیرینہ پالیسی کی وجہ سے کافی بدنام ہے۔

ہندوستان میں آج تک جس قدر جنگیں اور انقلاب ہوئے ہیں وہ عام طور پر مذہب ہی کے نام پر ہوئے ہیں، ہمارے اہلِ ملک ابھی اس منزل پر نہیں پہنچے کہ محض اخلاق، قانون اور آزادی کے نام پر جانیں قربان کر سکیں یا یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر تحریک کے بانی نے مذہب کی برقی اور غیر فانی قوت سے فائدہ اُٹھایا، اور دوسرے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ حقیقتاً یہاں کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس پر مذہب کا رنگ نہ چڑھایا جائے، لطف یہ ہے کہ ظاہرا طور پر یہ فسادات مذہب کی آڑ میں ہوتے ہیں، لیکن ان کی تہ میں کوئی نہ کوئی سیاسی یا معاشی راز پوشیدہ ہوتا ہے، اسی لئے قومی لیڈروں کا خیال ہے کہ ہندوستان

میں امن وسکون معاشی مسائل کو روبہ اصلاح لانے سے ہو سکتا ہے۔

مذہب — عام طور پر ہر شخص مذہب کی اہمیت اور ضرورت کا قائل ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ دُنیا کا سب سے پہلا اور آخری قانون مذہب ہی ہے، جس نے بنی نوع انسان کو اپنے فرائض سے آگاہ کیا اور ایک مخصوص روش پر رواداری اور امن چین کی زندگی بسر کرنی سکھائی، اس کے علاوہ مذہب کی ناقابل تسخیر طاقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا، دُنیا میں جس قدر فتوحات مذہب کے نام سے ہوئی ہیں، انسے اہلِ علم بے خبر نہیں ہیں، کمزور اور تباہ حال قومیں مذہب کی قوت سے طاقتور اور کامیاب ہوئیں، غلامی کی زنجیریں اس بے پناہ قوت نے توڑیں؛ وحشی اور خونخوار قومیں مذہب کی جلا سے تہذیب اور شائستگی کے آسمان پر درخشندہ ستاروں کی طرح چمکیں، مذہبی رواداری کی بدولت دشمنوں اور غیر مذہبوں کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لیا گیا کہ من و تو کا فرق باقی نہ رہا، اب بھی وہی مذہب ہے جو کبھی اخوت اور یگانگت پیدا کرنے میں بے مثل تھا لیکن آج کل نفاق انگیزی اور حسد و بغض کی آگ سلگاتا اور فساد کے شعلے بھڑکاتا ہے، اس کا معمولی سا کرشمہ یہ ہے کہ پرائے تو پرائے اپنے بھی بیگانے ہوتے جاتے ہیں۔

تعلیم — ہمارے ملک میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو رہا ہے جو ہر مذہب کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے، سُوءِ اتّفاق سے یہ گروہ تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل ہے، اس لئے کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ یہ موجودہ تعلیم کا

اثر ہے، لیکن حقیقتاً یہ تعلیم کا اثر نہیں بلکہ مذہب کا اثر ہے، مذہب پرستوں نے ہر مذہب کو اتنا محدود کر دیا ہے کہ اس میں آزادی کی گنجائش نہیں رہی، اس لئے جن لوگوں کو تعلیم آزاد خیال بنا دیتی ہے وہ نام نہاد مذہبی پابندیوں سے متنفر ہو جاتے ہیں، مذہب کے نام سے پناہ مانگتے ہیں، اور محض نام کے ہندو اور مسلمان رہ جاتے ہیں، اسباب فسادات کی تحقیقات کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فسادات میں جس قدر لوگ عملی حصّہ لیتے ہیں وہ جاہل ہوتے ہیں، تعلیم یافتہ اوّل تو ان سے بالاتر رہتے ہیں اور اگر فسادات میں ان کا کچھ حصّہ ہوتا ہے تو محض اس قدر کہ گھس میں چنگی ڈال جمالو دور کھڑی، جیسے انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا اب عوام لڑتے مرتے پھریں، وہ تو اس وقت گھر سے باہر نکلیں گے جب امن وسکون قائم ہو جائیگا اور تباہ شدہ قوم کو سنبھالنے کا سوال پیدا ہوگا۔

اخبارات | فسادات کرانے میں اخباروں کو بھی بہت دخل ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اخبارات عام طور پر شخصی ملکیّت ہیں، جو شخص مالک ہے وہی ایڈیٹر ہے اور وہی اپنی پالیسی کا ذمہ دار، کوئی دوسرا شخص اس کو پوچھنے والا نہیں کہ کیا لکھتے ہو اور کیوں لکھتے ہو، نیز باقاعدہ صحافتی تعلیم نہ ہونے سے ایڈیٹروں کی تحریریں اکثر جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتی ہیں، حالات اور واقعات کی رَو ان کو اپنے ساتھ عوام کی طرح بہا لے جاتی ہے، حالانکہ ایڈیٹر میں بھی وُہی خصوصیات ہونی

چاہئیں، جو ایک کامیاب مقرر کے لئے ضروری ہیں، اگر وہ عوام کو اپنا ہم خیال نہیں بنا سکتا تو کامیاب ایڈیٹر کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں بلکہ فن صحافت کے لئے اس کی ذات سخت خطرناک ہے، ایسے ایڈیٹر عام طور پر خود بھی مصیبتوں میں مبتلا رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنی خام کاریوں سے تکلیفیں پہنچاتے ہیں، دو قوموں کو آپس میں لڑا دینا یا مخالف بنا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے، بڑھتے بڑھتے یہی مخالفت ہمہ گیر فساد کی صورت اختیار کر لیتی ہے، ایسے موقعوں پر ان کی بن آتی ہے، اشتعال انگیز سُرخیاں اور عنوان دے کر معمولی معمولی خبروں کو دہشت خیز اور وحشت انگیز بناتے ہیں، اس پر اخبار فروش گروہ اور زیادہ نون مرچ لگاتا ہے، وہ اخبار جسے کوئی پوچھتا تک نہیں ہزاروں کی تعداد میں بکنے لگتا ہے، اخبار فروشوں کی اشتعال انگیز آوازیں سُن سُن کر شہر میں سنسنی پھیل جاتی ہے، وہ لوگ جو مدتوں سے موقع کی تاک میں بیٹھے تھے کہ اپنے دلوں کی بھڑاس نکالیں، پکے ہوئے پھوڑے کی طرح ذرا سے اشارے پر پھوٹ بہتے ہیں۔

جمہوریت | جمہوریت پسند حضرات کا دعوٰے ہے کہ جمہوری حکومت عوام کی حکومت ہوتی ہے اس کے زیر سایہ وہ جھگڑے اور فساد نہیں ہوتے جو دوسری قسم کی حکومتوں میں پیدا ہو سکتے ہیں، تجربہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ جمہوریت کی بدولت جس قدر فساد اور مناقشے رونما ہوتے ہیں، اور قسم کی حکومتیں اُن سے مبرّا ہیں، ہم تسلیم کرتے

ہیں کہ جمہوری حکومت ظاہرا طور پر بہت زیادہ تسلّی بخش ہے اور عوام میں بیداری پیدا کرنے کی موجب ہے، لیکن اس کی بیداری اگر صحیح طریقے سے ترقی نہ کرے تو نہ صرف قوم کے لئے مضر ہے بلکہ دوسری ہمسایہ قوموں کے لئے بھی خطرناک ہے، آئے دنوں کے الیکشنوں اور انتخابوں سے ہمارے مُلک کی طاقت کو جس قدر نقصان پہنچ رہا ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں، اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ ہنگامے جمہوریت کے اساسی اصولوں کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتے ہیں تو ماننا پڑے گا کہ جمہوریت کی درآمد ہمارے ملک میں قبل از وقت ہے اور اس طرز حکومت سے بجائے فائدے کے مُلک کو نقصان پہنچ رہا ہے، بلکہ مَیں تو یہ کہونگا کہ جمہوریت کی آڑ میں منافرت اور نفاق کے بیج بوئے گئے ہیں۔

انسداد کی تدابیر

رواداری :- انسداد کی تدابیر میں سب سے پہلا درجہ رواداری کا ہے، اگر ہر مذہب کے اساسی قوانین کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ دُنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو رواداری کا سبق نہیں دیتا، ہندو اور مسلمان دونوں کے مذہب میں رواداری کی تعلیم موجود ہے، بلکہ ہندو مذہب میں کسی جاندار کو ستانا گناہ عظیم خیال کیا جاتا ہے، لیکن جب فساد برپا ہوتا ہے تو ہندو مذہب کے نام لیوا چھُری کٹاری ہو جاتے ہیں، وہ قوم جو چیونٹیوں اور سانپوں کو مارنا گناہ خیال کرتی ہے، انسانوں کو بیدریغ ذبح کر ڈالتی ہے،

یہی حالت مسلمانوں کی ہے، مذہب کے نام پر جان دیدینا ان کو غازی اور شہید بناتا ہے اور دُنیا و عقبےٰ میں ان کے مرتبے بلند کرتا ہے، اگر ہمارے مذہبی مبلّغ اور شریعت کے حامل مذہبی تعلیم میں رواداری و زیادہ اہمیّت دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمسایہ قوموں کے مذہبی احساسات کا احترام نہ کیا جائے۔

حد و بندی | انسان کا خاصہ ہے کہ اپنے ہم خیال گروہ میں رہنا سہنا پسند کرتا ہے، حقیقتاً اپنی جماعت کے لوگوں میں رہنے سے بہت آرام پہنچتا ہے، لیکن وہ جماعت جو ہم مذہبی کے پیش نظر کسی خاص جگہ پر چھاؤنیاں چھاتی ہے اور دوسری قوموں اور مذہبوں کے لوگوں کو وہاں آباد نہیں ہونے دیتی وہ ضرور کسی نہ کسی حد تک شہر کے امن کے لئے مخدوش ہوتی ہے، مثلاً فسادات کے ایّام میں اگر خالص ہندو یا مسلم آبادی میں کوئی مخالف مذہب کا آدمی جا پھنسے تو اُس کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے اور اس کی کوئی پُرسش نہیں ہو سکتی، برخلاف اس کے جن محلوں میں ہندو مسلمان دونوں فرقے آباد ہیں، وہاں رواداری اور ہمسایگی کے حقوق ہر حالت میں قائم رہتے ہیں چونکہ دونوں فرقوں کو برابر کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جو دوسرے کو ناگوار گزرے اور اس کے اثر بد سے تمام اہل محلہ کا امن و سکون غارت ہو جائے۔

یہی حالت تعلیم کی ہے، جن مدرسوں میں ایک مذہب کے طلباء

ہوتے ہیں، ان میں رواداری کا جذبہ تربیت نہیں پاتا، لیکن وہ مدارس جہاں مختلف مذہبوں اور فرقوں کے بچّے ایک جگہ بیٹھ کر پڑھتے ہیں طلباء میں محبّت، یگانگت اور دوستی استوار کرتے ہیں، ان مدارس کے طلبا یقیناً قومی مدارس کے طلباء پر اس حیثیّت سے فوقیّت رکھتے ہیں، جیسے تعلیم کے زمانے میں وہ ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہیں۔ اسی طرح تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ ہمسایہ قوموں سے دوستی اور محبّت قائم رکھنے کے اسباق نہیں بھولتے، بعض اساتذہ اپنے ماحول اور تعلیم کے اثر سے پرلے درجے کے متعصّب ہوتے ہیں، تعلیمی اداروں کے لئے اس قسم کے اُستاد بہت ہی خطرناک ہیں، اور خاص کر ایسے مدرسوں کے لئے جن میں ایک مذہب کے طالب علم تعلیم حاصل کرتے ہوں، چونکہ جماعت میں دوسرے مذہب کے طلبا نہیں ہوتے اس لئے ان کو تعصب کا زہر گھنگھولنے کا پورا پورا موقع مل جاتا ہے، بچّوں کے دلوں پر اُستاد کی عظمت اور اُس کا پُر زور طرزِ تکلّم ایسے گہرے نقوش اور اثرات پیدا کرتا ہے کہ وہ عمر بھر محو نہیں ہو سکتے اگر قومی مدرسوں میں مختلف مذہب کے طلباء کو یکجا کرنے کی کوشش کی جاتے، تو متعصّب اساتذہ خود بخود احتیاط سے کام لیں اور اپنا تعصّب اپنی ذات تک یا اپنے خاص حلقہ اثر میں محدود رکھیں، اس کے ساتھ ہمیں نصابِ تعلیم سے بھی شکوہ ہے، جب ہم بچّوں

کے لئے نصاب تعلیم مرتب کرنے بیٹھتے ہیں تو اکثر ایسے موضوع شامل کر لیتے ہیں جن سے تعصب اور منافرت کے جذبات بھڑکتے ہیں، خاص طور پر تاریخ کے نصاب اس لحاظ سے بہت ہی مطعون ہیں، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخی واقعات کو مٹایا نہیں جا سکتا لیکن ابتدائی تعلیم میں ایسے تاریخی واقعات کو داخل کرنا بہت ہی خطرناک ہے، جن سے ہندو مسلم اتحاد اور یگانگت کو ٹھیس لگتی ہے اور دو ہمسایہ قوموں کے درمیان نفرت اور نفاق کی خلیج وسیع ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں ہندو مسلم فسادات بہت کثرت سے ہونے لگے ہیں، کوئی دن ایسا نہیں جاتا جس دن کہیں نہ کہیں سے فساد کی خبر نہ آئے، اگر فساد نہ بھی ہو تو معمولی سے معمولی انفرادی جھگڑوں کو فرقہ دارانہ رنگ دیدیا جاتا ہے، میری آنکھوں دیکھی بات ہے، کوئی پندرہ سولہ سال ہوئے ایک سرکاری کالج میں کچھ جھگڑا ہو گیا، جو طلبا اس قضیہ کے بانی مبانی تھے وہ ہم قوم تھے، معاملہ بڑھتے بڑھتے مقدمہ کی صورت میں سرکاری عدالت تک پہنچ گیا، موقع پاتے ہی فرقہ پرست حضرات آن دھمکے اور ہندو مسلم سوال بنادیا، بادی النظر میں تعجب ہوتا ہے کہ آپس کا جھگڑا فرقہ دارانہ کیسے بن گیا، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مخالف قوم اس ضلعے میں اپنا قومی کالج کھولنا چاہتی تھی، اس کو موقعہ ہاتھ آیا، ایک طرف سے تمام ہندو وکلا پیروی کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور دوسری طرف سے تمام مسلمان وکلا، جس قوم کو نقصان

پہنچتا تھا اس کی آنکھیں کھل گئیں، حقیقت یہ ہے کہ اس مقدمہ کی ہار جیت میں کالج کے رہنے اور نہ رہنے کا سوال پیدا ہو گیا تھا، آخر کار مستغیث نے عدالت سے مقدمہ اٹھالیا اور آپس میں فیصلہ کر لیا،

اس ایک واقعہ پر کیا منحصر ہے ہزاروں واقعات اس قسم کے ہوتے ہیں جن سے ہمسایہ قوموں کے باہمی تعلقات خراب ہوتے جاتے ہیں، اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ ہر محلّے اور علاقے میں ہندو مسلمانوں کے مشترکہ بورڈ اور مصالحتی کمیٹیاں قائم کر دی جائیں، نیز کوشش کی جائے کہ ہر محلّے میں ہندو مسلمان دونوں آباد ہوں، تاکہ ایک دوسرے سے میل جول اور ہمسائگی کے باعث آپس میں محبت اور دوستی پیدا ہو، قاعدہ ہے جہاں محبت ہوتی ہے وہاں درگذر اور برداشت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور معمولی کیا بڑے بڑے معاملات محض باہمی ارتباط کی بدولت نہایت خوش اسلوبی سے طے ہو جاتے ہیں۔

ملکی تقسیم ہندو مسلم نفاق اور فساد کی بدولت آج کل ایک جماعت اس خیال کی پیدا ہو گئی ہے، کہ ہندوستان کو ہندو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے، گویا ہندوستان کے ایک حصّے میں خالص مسلمان آبادی ہو جائے اور دوسرے میں نری ہندو آبادی، اس تجویز کو عمل میں لانے سے وہی نقصانات اور احتمالات ہیں جو خالص ہندو مسلم محلّے آباد کرنے سے ہو سکتے ہیں، اس نظریئے کے حامی اس طریق کار کو ملک کے لئے مفید

سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہندو مُسلم فسادات کا یہی آخری علاج ہے بعض ممالک میں ایسا ہوا بھی ہے، ان کا دعوےٰ ہے کہ اگر یہ طرزِ عمل اختیار نہ کیا گیا تو قدرتی طور پر آہستہ آہستہ ایسا ہو جائیگا، جن لوگوں کو کسی خاص صوبے میں متواتر نقصان اور تکلیفیں پہنچیں گی وہ خود بخود ان صوبوں میں منتقل ہو جائیں گے جہاں ان کا جان و مال زیادہ محفوظ رہے گا، اور زیادہ آسانیاں میسّر ہونگی، کہنے والے یہ کہتے ہیں، کہ فلسطین میں یہی صورت اختیار کی گئی ہے، لیکن وہاں تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا، بلکہ وہاں کی حالت بد سے بدتر ہو گئی ہے، اور آخر کار حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ مجوزہ تقسیم کو باطل قرار دیدیا جائے، بہرحال اگر ہندوستان کی نت نئی مصیبتوں کا اس طریقِ کار سے خاتمہ ہو سکتا ہے تو یہ صورت نہایت تکلیف دہ ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ وہ دو قومیں جو آپس میں شیر و شکر تھیں، اب ایک دوسرے سے اتنی متنفّر ہو گئی ہیں کہ ایک جگہ رہنا بھی گوارا نہیں کر سکتیں۔

فرقہ دارانہ تناسب ہمارے مدبّرین نے فرقہ دارانہ تصادم کا ایک علاج یہ بھی کیا ہے کہ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی ملازمتوں میں فرقہ دارانہ تناسب قائم رکھنے کے قوانین بنائے ہیں، اس طریقِ کار سے بہت سی شکایتیں دُور ہو گئی ہیں اور اب وہ بات نہیں رہی کہ جس قوم کا آدمی برسرِ اقتدار ہوا اُس نے اپنے ہم مذہب اور ہم قوم آدمی رکھ لئے اور دوسری قوموں کے حقوق کو پامال کر دیا، لیکن باوجود اس قانون کے اب

بھی یہ حال ہے کہ جہاں کہیں جس کا بس چلتا ہے، وہاں وہ کچھ نہ کچھ کر ہی گزرتا ہے، اور اپنے تعصّب کی بدولت اپنے تمام ماحول کو مکدر کر دیتا ہے، قاعدہ ہے ایک مچھلی جل کو گندا کرتی ہے، اگر کہیں ایک مرتبہ کسی شخص کے ساتھ ناانصافی یا جبر و تشدّد ہوتا ہے وہاں اس کے اثرات مدّتوں تک باقی رہتے ہیں، اور ایک شخص کی زیادتی سے تمام قوم بدنام ہو جاتی ہے، اگر آپس میں خوشگوار تعلقات ہوں تو یہ معمولی باتیں ہیں، لیکن جب بغض و عناد اپنے اظہار کے بہانے تلاش کرنے کے درپے ہوں تو بات کا بتنگڑ بن جانا کون بڑی بات ہے۔

بہرحال فرقہ دارانہ تناسب بہت ہی اچھّی اور معقول تجویز ہے لیکن جب اس چادر کو زیادہ پھیلایا جاتا ہے اور چاروں طرف سے کھینچ کر فرقہ دارانہ گند کی کو ڈھانکنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کشیدگی سے چادر کے تار تار ہونے کے بعد جو کچھ برآمد ہوتا ہے اس کو مذاقِ سلیم اور طبع لطیف ہرگز گوارا نہیں کر سکتی، مثلاً ہر ریڈیو سٹیشن ماہوار ایک مقررہ رقم صرف کرتا ہے، اسے پروگرام کی ترتیب اور روپے کی تقسیم میں بھی فرقہ دارانہ تناسب قائم رکھنا پڑتا ہے، اگر سوءِ اتفاق سے فرقہ دارانہ تناسب پورا نہیں ہوتا تو اس کو ہندو مسلم آرٹسٹ کسی نہ کسی طرح مہیّا کرنے پڑتے ہیں، چاہے پروگرام خراب ہو یا درست رہے لیکن فرقہ پرستوں کو تو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے لطف یہ ہے کہ اگر پروگرام پر نکتہ چینی کی جائے تو ریڈیو والے فوراً فرقہ دارانہ

تناسب کی آڑ لیتے ہیں، ایک محکمۂ ریڈیو پر کیا منحصر ہے تقریباً ہر محکمہ میں فرقہ دارانہ تناسب کا تاریک پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔

انتظام | فسادات کو روکنے کے لئے حکومت کی طرف سے بھی بہت کوشش کی جاتی ہے، لیکن عموماً شکایت یہ ہے کہ فسادات رُو نما ہونے پہلے خاطر خواہ انتظام نہیں کیا جاتا، حکومت عام طور پر اُس وقت تک خاموش رہتی ہے جب تک کوئی حادثہ پیش نہ آجائے، جب سے صوبائی حکومتیں قائم ہوئی ہیں اُس وقت سے حکومت کی پالیسی میں بہت نمایاں فرق پیدا ہوگیا ہے چنانچہ ایک قانون غنڈہ ایکٹ کے نام سے بنایا ہے جس کی رو سے ان لوگونکو شہر بدر کردیا جاتا ہے جو فساد اور شرارت انگیزی کے لئے بدنام ہیں، معلوم ہونا چاہیئے کہ فسادات کا انتظام اور روک تھام محض حکومت پر فرض نہیں بلکہ امن پسند شہریوں کے بھی کچھ فرائض ہیں، اکثر ان کی خاموشی اور غیر دلچسپی فسادات کو ترقی دیتی ہے، اگر وہ اپنے فرائض کو محسوس کریں تو فسادات کا بہت آسانی سے قلع قمع کیا جاسکتا ہے مثلاً ہر شہر کے مختلف علاقوں میں ہندو مسلمانوں کی اتحادی انجمنیں قائم کی جائیں اور ان کے کارکن محکمۂ پولیس سے تعاون کریں تو فسادات کے جراثیم اپنا اثر دکھانے سے پہلے فنا کئے جاسکتے ہیں، اور ایسے لوگوں کا خاطر خواہ اور قبل از وقت انتظام ہوجاسکتا ہے، جو فساد برپا کرنے میں حصہ لیتے ہیں، تھوڑے عرصے کا ذکر ہے کہ بمبئی میں ہندو مُسلم

فساد برپا ہوئے حکومت بمبئی نے نہایت دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے ہر اس شخص کو کسی نہ کسی طرح پابند کر لیا جس سے نقص امن کا اندیشہ تھا، ایسا کرنے سے ممکن ہے بعض بے گناہوں پر بھی سختی ہوئی ہو، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس سے فائدہ کیا پہنچا، وہ فساد جس سے تمام شہر کا امن خطرے میں پڑ گیا تھا بہت آسانی سے دُور ہو گیا، اگر ایسے طریقے ہر جگہ استعمال کیے جائیں تو بہت سے بے گناہوں کی جانیں اور مال تلف ہونے سے بچ جائیں، اور ان لوگوں کے مزاج خود بخود راستی پر آجائیں جنھوں نے فساد کرانا اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔

ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات اس کثرت سے ہونے لگے ہیں کہ ان سے تمام ملک کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا ہے، اسلئے نہایت ضروری ہے کہ فسادات کے اصلی اسباب دریافت کر کے ان کا تدارک کیا جائے، جب تک اصلی اسباب کو دُور نہیں کیا جائیگا، اُس وقت تک ان فسادات کا ہرگز خاتمہ نہیں ہو سکتا، فسادات کے اساسی اسباب دریافت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جہاں کہیں فسادات کے جراثیم پیدا ہوتے نظر آئیں ان کی طرف فوراً توجّہ کی جائے، ہر قوم کے با اثر آدمیوں کو ایک جگہ جمع کر کے حالات پر غور کیا جائے اور وہ طریقے اختیار کیے جائیں جن سے عوام کے بھڑکے ہوئے جذبات اور بگڑے ہوئے خیالات سکون پذیر ہو کر راستی پر آجائیں،

اس قسم کی انجمن بنانے سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان لوگوں کا آسانی سے پتہ لگ جائیگا جو فسادات کی آگ پر تیل چھڑک کر اس کو زیادہ بھڑکاتے ہیں۔

ایسی کانفرنسوں کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہندو مسلمانوں میں بدمزگی کے اساسی اسباب دریافت کرتے ہوئے یہ معلوم کریں کہ ان اسباب کو کن طریقوں سے دُور کیا جاسکتا ہے، نیز ہندو مسلمانوں کی بلاتفریق مذہب و ملّت کونسی ضرورتیں ہیں جو پُوری نہیں ہوتیں، ان ضرورتوں کو پُورا کرنے سے ظاہری حالات اور باہمی تعلّقات میں کیا تبدیلی واقع ہوگی، آیا اس طریق کار سے فسادات کا خاتمہ ہوسکیگا، ہندو مسلمان کن طریقوں سے ایک دوسرے کو دُکھ پہنچارہے ہیں، یہ طریقے اختیار کرنے کا باعث کسی جماعت کی تعلیمی کمزوری، سیاسی پستی یا معاشی انحطاط تو نہیں ہے، اگر کوئی جماعت حقیقت میں دوسری جماعت سے پیچھے ہے تو اس کا سبب اس کے اپنے مذہبی قوانین اور رسم و رواج تو نہیں یا واقعی وہ دوسری قوم کی درازدستی اور بدسلوکی کا شکار ہیں۔

اگر اس طریقے سے صحیح جذبات کے ساتھ اس ٹیڑھے مسئلے پر غور کیا جائے تو بہت جلد ہندو مسلم فسادات کا خاتمہ ہو سکتا ہے، موجودہ زمانے میں جبکہ یورپ جنگ عظیم کے خطرات میں مبتلا ہے، اور اندیشہ ہے کہ جنگ کے چھڑ جانے سے انسانی قوتوں، جانی اور مالی نقصانوں سے تمام اقوام عالم کا شیرازہ بکھر جائیگا تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ حکومت ہند

ہندوستان میں امن عامہ پیدا کرنے کی بدل خواہشمند نہ ہو، اور اس مسئلے کے حل کرنے میں اہل مُلک کی پُوری طرح امداد نہ کرے۔

دردمندانہ اپیل

اے ہندو مُسلمانو، تم ایک مُلک کے رہنے والے ہو، تمہارے حالات اور واقعات ایک جیسے ہیں، وہ بھی دن تھے جب تم بھائیوں بھائیوں کی طرح رہتے تھے، ایک دوسرے کا مصیبتوں میں ساتھ دیتے تھے، تمہاری محبت اور یگانگت دوسرے مُلکوں کے سامنے مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی تھی، کبھی تم نے غور کیا وہ کیا اسباب ہیں جو محبّت کی جگہ نفرت اور عناد کو دے رہے ہیں اور تم ایک دوسرے سے دُور ہوئے جا رہے ہو، آئے دن کے فسادات اور لڑائی جھگڑے تمہارے ملک کی اصلی حالت کا عکس ہیں، کیا تم محبّت کے اس سبق کو بھُول گئے جو تمہارے آباد اجداد نے تمہاری گھٹی میں ڈالا تھا، تم دونوں ایک دوسرے کے ہمسائے میں کس محبّت اور امن سے رہتے تھے، صدیوں کے امتداد اور زمانے کے انقلاب تمہاری دِلی کیفیّتوں اور خیر اندیشیوں میں فرق نہ آنے دیتے تھے، کیا تم ہی وہ لوگ ہو اور سچ مچ تمہاری رگوں میں انہی نیک نہاد بزرگوں کا پاک خوُن گردش کر رہا ہے، جن کے دل ہمدردی اور محبّت کے جذبات سے معمور تھے، جن کی ہر حرکت ایک دوسرے کے جذبات کا احترام جھلکتا تھا، اور ہر بات سے رواداری اور پاسداری ٹپکتی تھی، نہیں تم ہرگز وہ نہیں، تم تو ایک دوسرے کے دُشمن اور

خون کے پیاسے ہو، تمہارے خیالات اور تمہاری طاقتیں ایسے ناپاک اور ذلیل مقصد کی طرف رجوع ہیں جس سے تمام ملک میں بے چینی پھیل گئی ہے، تمہاری کشاکش اور مخالفت سے کسی قوم کا جان و مال محفوظ نہیں رہا، وہ اطمینان قلب اور آرام جان جو ہندوستان سے مخصوص تھا اس کی روایتیں اور حکایتیں باقی رہ گئی ہیں، اے ہندو مسلمانو، اپنے دلوں کا جائزہ لو، حالات کو دیکھو، مصلحت کو پہچانو، اس وقت ملک کے سامنے گرسنگی اور مفلسی کے دو ہیبت ناک دیو دانت نکوسے کھڑے ہیں، اگر تم دونوں نے مل کر اس درد کا مداوا نہ کیا تو یہ تم دونوں کو نگل جائیں گے، وقت کا تقاضا ہے اور حالات مجبور کر رہے ہیں کہ تم اپنی متفقہ کوششیں اہم مسئلوں کے حل پر صرف کرو، یہ ملک کی خدمت کا وقت ہے لڑائی جھگڑے کا موقع نہیں۔

اے ہندو مسلمانو، تم دونوں ایک ملک کے باشندے ہو تم کو یہیں رہنا ہوگا، تمہارے لئے کوئی نئی سرزمین پیدا نہیں ہوگی، پھر کیا وجہ ہے کہ تم بیگناہوں کا خون بہاتے ہو، تمہیں کون سے مذہب نے سکھایا ہے کہ دوسرے مذہب کے آدمی کو قتل کر دو، مذہب تو نظام عالم کے قیام کا باعث ہے اور روحانی تسکین دینے کا مدعی ہے، تمہارے طرز عمل سے تمہارے مذہب بدنام ہیں، اگر تمہاری حالت یہی رہی تو دیکھنا ایک دن وہ آئیگا جب تمام دنیا مذہب کے نام سے متنفر ہو جائیگی اور لامذہبی کو فخر خیال کرے گی۔

اے ہمسایہ قوموں آپس میں گلے مل جاؤ، قدیمی روایات کو از سرِ نو زندہ کرو، جو لوگ امن کے دشمن ہیں اپنی توجّہ اور قوّت ان کی اصلاح کی طرف مرکوز کرو، یہ آئے دن کے جھگڑے اور فسادات لباسِ انسانیت پر دھبّے ہیں، مذہب انسان میں مایوسی گناہ ہے، اپنی ہمتیں اور ارادے بلند رکھو، تاریخ عالم شاہد ہے کہ اس قسم کے ناہنجار اور ناخوشگوار واقعات اکثر قوموں کو پیش آئے ہیں، لیکن بلند ہمّت اور زندہ قوموں نے ان کی تاریک اور مکدّر گہرائیوں سے نکل کر درخشندہ اور ہمّت افزا دَور میں قدم رکھا ہے، کاش موجودہ کشاکش تمہارے لئے بھی ایک درخشندہ دَور کا پیش خیمہ ہو۔

بیروزگاری

بیروزگاری کی عمومیت | آج کل بیروزگاری کی بہت ہی گرم بازاری ہے، کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں بیروزوں کی انجمنیں قائم نہیں یا بیروزگاری کے خلاف جہاد نہ ہو رہا ہو، سرکاری اور غیر سرکاری کمیٹیاں اور کمیشن مقرر ہوئے تاکہ بیروزگاری کو دُور کرنے کے لئے مناسب تجویزیں سوچیں، لیکن کسی صورت سے بھی یہ مشکل اور اہم مسئلہ حل نہیں ہو سکا، اور مستقبل قریب میں اس آفت کے دُور ہونے کے امکانات بھی نہیں آتے، بیروزگاری مادرِ ہند کے بدن پر ایک ایسا خوفناک زخم ہے جس کو جتنا زیادہ کھجایا جا رہا ہے اسی قدر زیادہ بڑھ رہا ہے۔

بیروزگاری قدیم الایّام ہے | بیروزگاری کا مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے، مُدّتہائے دراز سے نہ صرف ہندوستان بلکہ کل ممالک عالم اس مصیبت میں گرفتار ہیں، بیکاری ہندوستان میں بھی مُدّتوں سے ہے، اور دن بدن اس میں ترقّی ہو رہی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے بیکاری کے شکار دیہاتی اور جاہل تھے اور اب تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس مصیبت میں گرفتار ہے، ہمارے ملک میں بیروزگاری کے خلاف صدائے احتجاج تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف سے بلند کی جا رہی ہے۔

کام نہیں رہا، جس مُلک میں ترقی کرنے کا میدان وسیع ہو وہاں اِس قسم کی شکایت کرنا غلطی ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن کاموں میں مخصوص قابلیّت کی ضرورت ہے، اُس کے لئے ویسی قابلیّت کے آدمی یہاں موجود نہیں ہیں، دُوسرے الفاظ میں جس قسم کی تعلیم و تربیت عام طور پر لوگوں کو دی جاتی ہے، ویسا کام ان کو نہیں ملتا، اس لئے بیروزگاری کی شکایت برابر بڑھ رہی ہے اور مُلک میں بےچینی روزافزوں ہے۔

ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ تر دفتری ملازمت کا خواہشمند ہے، ظاہر ہے کہ دفاتر ہر سال اتنے آدمیوں کو ملازمت نہیں دے سکتے جتنے تعلیم سے ہر سال فارغ ہوتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ صنعتی اور زرعی تعلیم حاصل کی جائے، صنعتی ادارے بے شمار بیروزگاروں کو روزگار دے سکتے ہیں، صدیوں کے تساہل اور جمود نے ہم لوگوں کی ہمّت پست کر دی ہے اور ہم یہ سمجھنے لگے کہ کوئی ایسا کام سرسبز اور کامیاب نہیں ہو سکتا جس میں حکومت کی امداد شامل نہ ہو، بیروزگاری کے وبال کو دُور کرنے کے لئے حکومت پر انحصار کرنا اور خود ہمّت نہ کرنا اس پیچیدہ مسئلہ کو پیچیدہ تر بنا رہا ہے۔

موجودہ تعلیم کے نقائص موجودہ طرزِ تعلیم سے ہمیں اور بھی زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے، اعلےٰ تعلیم کی بدولت معیارِ زندگی بلند ہوتا جا رہا ہے، اور آمدنی کے وسائل کم ہو رہے ہیں، مثال کے طور پر ایک گھر میں ایک

شخص کمانے والا ہے، وہ اپنی اولاد کو عام دستور کے مطابق مروجہ
اعلیٰ تعلیم دلواتا ہے، تعلیم حاصل کرنے کے بعد کثیر تنخواہ کی ملازمت
نہ ملنے کے باعث اولاد بیکار رہتی ہے، اس گھر کا معیار زندگی پست
ہو جاتا ہے، نمائش کا شوق چھوٹی موٹی نوکری کرنے کی اجازت نہیں دیتا،
مفروضہ معیار کو قائم رکھنے کے لئے یا قرض لیا جاتا ہے یا چوری کی جاتی
ہے' یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں انقلاب اور بغاوت کے خیالات
نشو و نما پا رہے ہیں' اور حکومت رفاہ عام کے کام پس پشت ڈال کر
اپنی کوششیں اس گروہ کی اصلاح اور انسداد میں صرف کر رہی ہے۔

سرکاری ملازمت کا شوق | تعلیم یافتہ لوگوں کی بیکاری کا مسئلہ محض موجودہ
طرز تعلیم کا نتیجہ ہے، یہ تعلیم اس لئے رائج کی گئی تھی کہ حکومت ہند
کو اپنے دفاتر میں کام کرنے کے لئے کلرکوں کی ضرورت تھی، تھوڑے
سے عرصے میں یہ ضرورت پوری ہو گئی، لیکن طرز تعلیم میں کوئی تبدیلی
نہیں کی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ بیروزگاروں کی تعداد دن دگنی رات چوگنی
ہو گئی، گورنمنٹ کے ملازموں کی عزت، فارغ البالی اور کثیر تنخواہ کو
دیکھتے ہوئے ہر تعلیم یافتہ شخص کی یہی خواہش ہوتی ہے، کہ وہ بھی
حکومت کی ملازمت کرے، لیکن ملازمتیں اتنی کہاں ہیں کہ ہر ایک کی
یہ آرزو پوری ہو سکے، ملازمت کے امیدواروں کی زیادہ تعداد کو دیکھ کر
حکومت نے مقابلے کے امتحان کا دستور نکالا ہے تاکہ بہترین امتحانی قابلیت
کا شخص انتخاب ہو سکے، اب حالت یہ ہے کہ اگر چند آدمیوں کی ضرورت

ہوتی ہے تو ہزاروں آدمی امتحان دے کر ناقابلیّت کی سند لیتے ہیں اور بیکار مارے مارے پھرتے ہیں، اگر ہندوستان کے تمام اخباروں کو جمع کر کے ان صفحات کا جائزہ لیا جائے، جن میں مختلف قسم کی ملازمتوں کی ضرورت کے اشتہارات ہوتے ہیں تو بلاشبہ ہزاروں ملازمتوں کے اشتہار نکلیں گے، لیکن حکومت کی ملازمت کے دلدادہ نجی کی نوکری کو حساب و شمار ہی میں نہیں لاتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نجی کی ملازمتوں میں زیادہ ہمت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ صفتیں موجودہ تعلیم کھو دیتی ہے، سرکاری ملازمت تو انسان کو محض اس قابل بنا دیتی ہے کہ کرسی پہ بیٹھ کر چند سطریں لکھ دی جائیں۔

وحشت انگیز جماعت کی تنظیم بیروزگاری کا نتیجہ ہے

بیروزگاری کی وجہ سے ملک میں ایک انقلابی جماعت پیدا ہو گئی ہے، اس جماعت نے حکومت اور عوام کا معاشی نظام درہم برہم کر دیا ہے، آئے دن نہایت وحشتناک خبریں اخباروں میں گشت لگاتی رہتی ہیں، چلتی گاڑیوں میں ڈاکے پڑتے ہیں، بنکوں اور ساہوکاروں کو لوٹا جاتا ہے، ریل کی پٹڑی توڑ کر اَن گنت جانیں ضائع کی جاتی ہیں، پُر امن مجمعوں پہ بم پھینک کر بے گناہ لوگوں کا خون بہایا جاتا ہے، یہ تشدّد پسند جماعت پُرجوش نوجوانوں پہ مشتمل ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں جس قدر بیروزگاری اور تباہ حالی پیدا ہوئی ہے، وہ غیر ملکی حکومت کے غیر ہمدردانہ سلوک کا نتیجہ ہے، اس لئے وہ کھُلے بندوں حکومت

کی مخالفت اور اس کے اقتدار کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، جب پکڑے جاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم حکومت کو خواب خرگوش سے بیدار کرنا چاہتے تھے، ان تحریکوں کا انجام چاہے کچھ ہی ہو لیکن اس کا نقصان براہ راست عوام کو پہنچتا ہے، بہرحال حکومت کا فرض ہے کہ اس طرف فوراً توجہ دے اور جلد سے جلد بیروزگاری کا انسداد کرے۔

موجودہ تعلیم سے صنعت وحرفت کو بھی نقصان پہنچا ہے

موجودہ طرز تعلیم میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں محض دماغی نشوونما کا پہلو مدّ نظر رکھا گیا ہے، اور عملی تعلیم کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، انٹرنس تک نہ تو کوئی دستکاری سکھائی جاتی ہے، اور نہ تجارت، زراعت یا صنعت وحرفت، اس تعلیم سے ان لوگوں کو خاص طور پر زیادہ نقصان پہنچتا ہے، جن کے گھروں میں کوئی صنعت وحرفت جاری ہے مثلاً ایک بڑھئی کا بیٹا انٹرنس پاس کرنے تک اپنے آبائی کام کو ہاتھ ہی نہیں لگاتا، دس سال کے عرصے میں دستکاری کا شوق بالکل فنا ہو جاتا ہے اس طرح سے موجودہ تعلیم صنّاعوں اور کاریگروں کے گھرانوں سے صنعت وحرفت کا خاتمہ کر رہی ہے اس کے علاوہ عوام دستکاری اور تجارت کو ذلیل اور نیچ پیشہ خیال کرنے لگے ہیں۔

ہندوستان کی تباہ حالی کے اسباب

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں اس وقت تقریباً چار کروڑ انسان بیکاری کا شکار ہیں یعنی ہر سو آدمیوں میں سے گیارہ بیروزگار ہیں، اس کی وجہ زیادہ تر اقتصادی

کمزوری بتائی جاتی ہے، ہماری مالی حالت کسی سے پوشیدہ نہیں، ہر ہفتے لاکھوں اور کروڑوں روپے کا سونا ہمارے مُلک سے باہر چلا جاتا ہے، تجارتی کیفیت یہ ہے، کہ اوّل تو مُلک میں پیداوار ہی ضرورت سے کم ہوتی ہے، اور اگر زیادہ ہو تو مصنوعات کے تبادلے میں بیرونی ممالک کو بھیج دی جاتی ہے، ہندوستان کی صنعتیں ترقی کے میدان میں اس قدر پیچھے ہیں کہ غیر ممالک ہمارے ملک میں اپنی مصنوعات یہاں کی چیزوں سے بہت کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں، مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ہماری صنعتیں ترقی نہیں کرتیں، چنانچہ دوسرے مُلکوں کے سستے مال کی درآمد سے ہماری اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوگئی ہے، اس کے علاوہ مشینوں کے عام استعمال نے ان گھریلو صنعتوں کا خاتمہ کر دیا ہے جن سے چھوٹے چھوٹے گھرانے اپنی روزی پیدا کر لیتے تھے، موجودہ طرزِ تعلیم نے معیارِ زندگی کو غیر معمولی طور پر بلند کر کے ہندوستان جیسے غریب ملک کو اور زیادہ مالی مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے، جن لوگوں کے پاس روپیہ ہے وہ اس کو مفید صنعتوں میں صرف کر کے عوام کو فائدہ پہنچانا نہیں جانتے، ہم لوگوں کا روپیہ اگر صرف ہوتا ہے، تو ایسے کاموں پر جن سے مُلک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

ہمارے تجارتی مرکزوں میں بھی کساد بازاری کا دَور دَورہ ہے، کیونکہ ہماری مصنوعات دیگر ممالک کی مصنوعات سے مہنگی تیار ہوتی ہیں، اس کے علاوہ ہمارے ملک کے پاس تجارت کے لئے روپیہ

بھی بہت کم ہے، صنعت و حرفت کے لئے جس قسم کے آدمی درکار ہیں، وہ ڈھونڈے نہیں ملتے، اگر ملتے ہیں تو غیر ملکی تعلیم یافتہ جن کو اتنی زیادہ تنخواہ دینی پڑتی ہے کہ کوئی صنعت آسانی سے ان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی، ہماری یونیورسٹیاں جس قسم کے تعلیم یافتہ پیدا کر رہی ہیں وہ سوائے سرکاری دفاتر کے کسی اور مصرف کے نہیں ہوتے اور کوئی حکومت بھی اتنی کثیر تعداد کو ہر سال اپنے دفاتر میں جذب نہیں کر سکتی، اگر زراعت کو مغربی ممالک کے انداز پر پیمانۂ کثیر پر لایا جاتا ہے تو اس کے لئے بے حد روپے کی ضرورت ہے، اور زمینداروں کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں اور پھر زراعت سے ایک دم اتنا منافع نہیں ہو سکتا کہ لگایا ہوا روپیہ ایک دو سال میں واپس آجائے، مشینوں کے عام استعمال نے گھریلو صنعتوں کو تباہ کر دیا ہے، تعلیم کے رواج نے معیار زندگی اس قدر بلند کر دیا ہے کہ ہر گھر کی آمدنی اس کو قائم نہیں رکھ سکتی، لوگوں کو عام طور پر روپیہ جمع کرنے کا بہت زیادہ شوق ہے اس کو یا تو صندوق میں بند کر کے رکھ دیا جاتا ہے یا زیور بن جاتے ہیں، اس طرح سے دن بدن روپیہ کم ہو رہا ہے، اور روپیہ کے کم ہونے کا اثر تجارت کی ترقی پر پڑ رہا ہے، اس کے علاوہ شادی بیاہ اور مرنے جینے کے رسم و رواج بہت صرف طلب ہیں، امیر غریب ان رسموں کو ادا کرنے سے قرضدار ہو جاتے ہیں اور مدتوں تک

اس سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

بیروزگاری کے انسداد کی تدبیریں

ہندوستان کی حالت کو دیکھتے ہوئے نہایت ضروری ہے کہ محض اُنہی لڑکوں کو یونیورسٹی تعلیم دی جائے جن کے والدین مُدّتوں بے دریغ روپیہ خرچ سکتے ہیں اور وہ طالب علم بھی اس قابل ہونے چاہئیں کہ یونیورسٹی کی تعلیم آیندہ زندگی میں ان کے لئے مفید ہو، یہ کھُلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہمارے مُلک کی ترقی صنعت و حرفت سکھانے کی درسگاہیں کھولنے پر مبنی ہے، ان کے ساتھ ساتھ مشترکہ سرمایہ سے ایسے بڑے بڑے کارخانے کھولنے بھی ضروری ہیں جو صنعتی اداروں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو آسانی سے جذب کرلیں، اس کے علاوہ فنّی اور صنعتی تحقیقات کے ادارے بھی کھولے جائیں، جو نہایت قابل طلبا کو تنخواہیں بھی دیں اور ان سے مفید کام بھی لیں، نیز دیہاتوں میں تعلیم کی روشنی پھیلائی جائے تاکہ دیہاتیوں کی جہالت دُور ہو اور وہ ان نقصانات سے محفوظ رہیں جو اپنی سادگی اور بے علمی کی وجہ سے اُٹھاتے ہیں۔

آج کل یہ تجویز بھی زیر غور ہے کہ پچاس سال کی عمر ہونے کے بعد سرکاری ملازموں کو پنشن دیدی جائے، اور ان کی جگہ نئے ملازم بھرتی کیے جائیں، نیز جن عہدوں کی تنخواہیں بہت زیادہ ہیں وُہ کم کردی جائیں، بڑی بڑی تنخواہوں پر غیر ممالک سے کوئی شخص نہ بُلایا جائے اور کم تنخواہ پر یہی کام اپنے ملک کے آدمیوں سے

لیا جائے، نیز ملٹری پر کم سے کم روپیہ صرف کرنے کی تجویز پر زور دیا جا رہا ہے تاکہ اس روپیہ کو ہندوستان کی ترقی اور بہتری کی مدّوں پر صرف کیا جائے۔

حال میں حکومت ہند نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ گورنمنٹ کی ملازمت میں داخل ہونے کے لئے ۱۷ سالہ نوجوانوں کا داخلے کا امتحان لے لیا جائے اور ۲ سے ۴ سال تک اُن کو ملازمت کا امیدوار رکھا جائے، ایسی تجویز سے بیروزگاری میں تخفیف ہونی مشکل ہے کیونکہ اس قسم کا امتحان ملازمتوں کی تعداد میں اضافہ نہیں کر سکتا، اس لئے بیروزگاری کا صحیح حل نہیں کہلایا جا سکتا، ملازم رکھنے کے نت نئے اصول بنانے سے بیروزگاری دُور نہیں ہو سکتی، اصل میں اس مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ حکومت اور رعایا متفقہ کوششوں سے طلبا کو یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے سے پہلے اس قسم کی ابتدائی تعلیم کا شوق دلائے جس سے درسی تعلیم کے بعد وہ کسی صنعتی ادارے میں کچھ نہ کچھ کام سیکھنے لگیں، اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ملک کے معاشی سرچشموں کو ترقی دی جائے، اور زراعت، تجارت اور صنعت وحرفت کا شوق طلبا کے دلوں میں ابتدائی تعلیم کے زمانے ہی میں پیدا کر دیا جائے تاکہ ان کی توجّہ ملازمت حاصل کرنے کی طرف سے ہٹ جائے، اور وہ شروع ہی سے کسی خاص پیشہ کی طرف دلی شوق سے متوجّہ ہو جائیں، امید ہے کہ اس طریقے سے محض

بیروزگاری کا مسئلہ ہی حل نہیں ہوگا بلکہ ملک کی اقتصادی حالت بھی بہتر ہو جائے گی۔

عملی پیش قدمی | موجودہ دور میں ہر صوبائی حکومت بیروزگاری کی طرف متوجہ ہے، اور اس بارے میں بہت سے صوبوں نے عملی طور پر کچھ نہ کچھ پیش قدمی بھی کی ہے، مثلاً پنجاب میں یہ قرار پایا ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو زمین کا اتنا بڑا ٹکڑا کاشت کرنے کے لئے دیدیا جائے جس میں کاشتکاری کرکے وہ معقول زندگی بسر کرسکیں؛ لیکن شرط یہ ہے کہ اس زمین میں وہ خود کاشتکاری کریں، اس کے علاوہ بعض مفید گھریلو صنعتوں کی تعلیم بھی دی جارہی ہے، امید ہے کہ اس طرح بیروزگاروں کی ایک معقول تعداد کے لئے روزگار مہیا ہونے کے ذرائع بہت جلد وسیع ہو جائیں گے۔

حکومت صوبجات متحدہ بھی اس میدان میں کسی اور صوبے سے پیچھے نہیں، وہاں بھی ہر سال بہت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو انتخاب کرکے ان کو گھریلو صنعتوں کی تعلیم دی جارہی ہے، تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان نوجوانوں کو حکومت کی طرف سے کچھ مالی امداد بھی ملتی ہے جس سے وہ اپنا کاروبار شروع کرسکتے ہیں، اس کے علاوہ یو۔پی کی حکومت کی سب سے زیادہ توجہ تعلیمی ترقی کی طرف ہے، ان کا خیال ہے کہ وردھا سکیم بہت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے روزگار مہیا کردے گی۔

ابھی چند دن ہوئے حکومت بہار نے اعلان کیا تھا کہ حکومت کی طرف سے بیروزگاروں کے لئے جو محکمہ اطلاعات قائم کیا گیا تھا وہ اطلاعات مہیّا کرنے کے علاوہ تعلیم یافتہ بیروزگاروں کے لئے صنعتی تعلیم اور علمی اور عملی ٹریننگ دینے کا بھی انتظام کر رہا ہے۔

بمبئی کے ہندوستانی تاجروں کی انجمن نے حکومت ہند کے سامنے تجویز پیش کی ہے کہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں متوسط طبقہ اور مزدور پیشہ لوگوں کے متعلق بیروزگاری کی تفصیلات بھی حاصل کی جائیں تاکہ حالات کا صحیح اندازہ کرکے کوئی عملی قدم اُٹھایا جاسکے۔

صوبہ مدراس میں حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ تعلیم یافتہ بیروزگاروں کو زرعی اور گھریلو صنعتوں وغیرہ کی تعلیم دینے کے لئے ہر ضلع میں ایک تعلیمی مرکز کھولا جائیگا، اس مفید سکیم کا تجربہ پہلے چار ضلعوں میں ہوگا، ہر ضلع کے ایسے مرکز کو پانسو ایکڑ زمین بھی دی جائیگی اور اس کے علاوہ اس فنڈ میں سے کچھ مالی امداد بھی ملیگی جو برسرروزگار افراد سے ایک روپیہ فی کس چندہ لے کر جمع ہوگا، تجویز یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو بیس روپے ماہوار تنخواہ لیتا ہے اور تین سال سے ملازم ہے چاہے وہ کوئی نجی کام کرتا ہے یا سرکاری ملازمت میں ہے اس سے بیروزگاروں کی امداد کے لئے ایک روپیہ چندہ لیا جائے، اس طریقے سے جس قدر روپیہ جمع ہو حکومت اسی قدر رقم اپنی طرف سے اس میں شامل کردے، اور پھر یہ رقم بیروزگاری دُور

کرنے کے لئے صرف کی جلئے۔

حکومت مدراس نے تعلیم یافتہ بیروزگاروں کی مردم شماری بھی کی ہے جس سے صوبے کی صحیح حالت کا اندازہ ہوتا ہے، ظاہر ہے یہ ایسے اقدامات ہیں جن سے بیروزگاری کی اصلی کیفیّت آئینہ ہوکر ملک و قوم کی تمام تر توجّہ اس طرف منعطف ہو جائیگی اور تعلیم یافتہ افراد کی بیروزگاری کا کچھ نہ کچھ انسداد ہو سکے گا، اگر یہ ضروری مسائل اور ان کو حل کرنے کی کوششیں اسی طرح جاری رہیں تو بہت جلد ہمارا ملک ایک ایسے دور میں قدم رکھے گا جس میں تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت غرض زندگی سے متعلق ہر شعبہ میں ترقی ہو گی، اور اس ترقی کی بدولت ہمارے ملک سے بیروزگاری عنقا ہو جائیگی۔

گداگری

ابتدا | گداگری کی ابتدا اور تدریجی ترقی کی چھان بین کے لئے کچھ زیادہ جانکاہی اور عرق ریزی کی ضرورت نہیں، قیاس و ادراک کی رہنمائی سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نوع انسان نے عالم خاک کو آباد کیا ہوگا تو تھوڑی سی مدت کے بعد گداگری کا آغاز ہو گیا ہوگا، کیونکہ جب حضرت انسان علیین سے اس تیرہ خاکدان میں تشریف لائے تو ان کے سر پر مصائب و آلام کے ایسے بوجھ لدے ہوئے تھے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے اور گرائے نہ بنے کے پُورے پُورے مصداق تھے، وہ ہرچند اپنی غیر فانی املاک کو ورثے میں تقسیم کرتے تھے لیکن اس لازوال اور لچکدار ترکے میں کچھ ایسی برکت تھی کہ کسی طرح کمی نہ آتی تھی، جس طرح شدائد زمانی اور آفت ہائے آسمانی اب بھی لوگوں کو لنگڑا، لُولا، لُنجہ، اپاہج بنا کر دوسروں کا محتاج بنا دیتی ہیں اسی طرح اس وقت بھی اپنی کرنی میں کمی نہ کرتی ہونگی، یہ آلام و مصائب انسانی زندگی کے ابتدائی دَور میں آزمائش کے لرزہ خیز نام سے موسوم تھے اور لوگ ان کو خوشی خوشی برداشت کرتے تھے، لیکن اب ہم ان کو جزا اور سزا کا نام دیتے ہیں، چونکہ ہمدردی ذات انسانی کا مخصوص

جوہر ہے اس لئے جو شخص اس ابتلا اور آزمائش میں گرفتار ہو جاتا ہے ہم اس سے پوری پوری ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں، اور دامے، درمے، قدمے امداد کا مستحق بھی سمجھتے ہیں، ان حالات کو پیش نظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے گداگری نے بھی انسان کی طرح عروج و زوال کے مدارج طے کئے ہوں گے، گویا جب انسان کا گزر مدارج زوال میں ہوگا تو گداگری اس وقت عروج کی منزلوں میں ہوگی۔

علمی گداگری | ٹھیک ان دنوں جب یونان علوم و فنون کا مرکز تھا اور اس کی روشنی افراد عالم کی نظروں کو خیرہ کر رہی تھی، ایک نئی قسم کی گداگری کا آغاز ہوا جسے علمی گداگری کہیں تو بجا ہے، دانایانِ یونان نے قرار دیا کہ علوم و فنون صحیح معنوں میں اہلِ یونان کی کفالت اور سرپرستی ہی سے ترقی کر سکتے ہیں، اس لئے طلبا کا پیٹ پالنا ہر کھاتے پیتے شخص کا فرض ہے تاکہ طالب علم بے فکر ہو کر تعلیم حاصل کریں، اور فارغ التحصیل ہو کر اطراف عالم میں علم کی روشنی پھیلائیں، چنانچہ یونان کی قدیمی یونیورسٹی کے طلبا کالے چغے پہنتے اور اپنی پیٹھ پر ایک جھولی[۱] لٹکائے رکھتے تھے تحصیل علم سے فارغ ہو کر وہ شہر کے گلی کوچوں میں نکل جاتے، شہر والے بغیر مانگے ان کی جھولیوں میں روٹیاں ڈال دیتے وہ نہایت اطمینان سے اپنی اقامت گاہوں میں

---

[۱] اس جھولی کو انگریزی میں ہڈ (Hood) کہتے ہیں۔

واپس آتے جو کچھ مل جاتا وہ بے فکر ہو کر کھاتے اور تحصیل علوم و فنون میں مشغول رہتے ، اگر کوئی شاہزادہ بھی یونان کی یونیورسٹی میں آتا تو وہ بھی باوجود دولت کی ارزانی اور روپے پیسے کی فراوانی کے اس رسم کی پابندی کرتا اور عام طالب علموں کی طرح تعلیم پاتا۔

کئی ہزار سال گزر گئے زمانہ کہیں کا کہیں پہنچ گیا لیکن وہ یونانی رسم اب تک جاری ہے ، ہماری یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور گریجوایٹ اب بھی وُہی کالے چُغے پہنتے اور وُہی جھولی اپنی پشت پر لٹکاتے ہیں ، زمانے کی ترقی نے طالب علموں سے ٹکڑ گدائی چھڑا دی ، ورنہ گزشتہ صدی تک ہندوستان میں بھی یہ یونانی رسم رائج تھی ، مسجدیں اور مندر علوم کے سرچشمے گنے جاتے تھے ، مُلّاؤں کی گھر گھر روٹیاں مقرر تھیں ، مُلّاجی روٹیاں جمع کرنے کا کام اپنے طالب علموں سے لیتے ، تر مال خود کھا جاتے جو باقی بچتا وہ اپنے عزیز طالب علموں میں تقسیم کر دیتے جس شاگرد سے زیادہ خوش ہوتے اُسے شیر مالیں اور باقر خانیاں عطا فرما کر اپنی خوشنودی اور شفقت کا اظہار فرماتے ، وہ علم کے بھوکے طالبعلم سُوکھے ٹکڑوں کو پانی میں بھگو بھگو کر کھاتے ، علم کے چشموں سے اپنی پیاس بُجھاتے اور ان علوم کو زندہ رکھتے جن کا اب نام لیوا بھی کوئی نہیں رہا ، سبحان اللہ ان سُوکھے ٹکڑوں اور خیراتی روٹیوں میں کیسی برکت اور قوت تھی کہ آج کل کے مرغن اور لذیذ کھانوں میں نہیں ، ہمارے آج کل کے طالب علموں کو ہر قسم کی آسانیاں میسّر ہیں ، اچھا

کھلانے کو ہے اور اچھا پہننے کو، لارڈ اور بیفکرے کہلاتے ہیں، اعلےٰ سے اعلےٰ سندیں اور ڈگریاں بھی حاصل کرتے ہیں لیکن مبلغ علم کو پرکھو تو کچھ نہیں، سندوں کو دیکھو" تو الف سے لے کر یے" تک کُل حروف، لیکن کوئی ایک حرف بھی شرمندۂ معنی نہیں۔

فقیروں کی عظمت

یونان کی علمی گداگری نے ہمارے دلوں میں گداگروں کی عظمت کا بیج بویا اس پر مشرق کی آب و ہوا اور رُوحانی فضا نے سونے پر سوہاگے کا کام کیا، گویا ہندوستان کے باشندے رُوحانیت پسند ہو گئے، جس شخص میں رُوحانیّت کا شائبہ نظر آتا ہے فوراً اُسکی طرف جُھک جاتے ہیں اور اُسے رُوحانی پیشوا تسلیم کر لیتے ہیں، جب کوئی رُوحانی پیشوا بن گیا تو سمجھ لینا چاہیے اس کو اپنے مرید پر اختیارات کُلّی حاصل ہو گئے، دُنیا و آخرت کا وہ مالک ہے، دل اور دماغ پر اُس کا قبضہ ہے، جان و مال پر اس کو اختیار ہے، وہ جو چاہے کام لے سکتا ہے، جس طرح چاہے نچا سکتا ہے، اگر خوش ہو جائے بخشوا دے، دولتمند بنا دے، اور اگر کہیں بگڑ بیٹھے تو دُنیا اور عاقبت دونوں خراب کر دے، نہ اِدھر کا رکھے اور نہ اُدھر کا رہنے دے

اس بات کو گداگروں اور فقیروں کی خوش قسمتی سمجھئے کہ آج تک جس قدر رُوحانی پیشوا گُزرے ہیں وُہ دُنیا سے متنفّر تھے، اور دُنیاوی جاہ و دولت کو پائے استحقار سے ٹھکراتے تھے ؎

اے ہما پیش فقیری سلطنت کیا چیز ہے
بادشاہ آتے ہیں پابوس گدا کے واسطے

اب بھی جو شخص ترک دنیا کر کے درویشانہ زندگی اختیار کرے اُس پر رُوحانی قوتوں کے مالک ہونے کا شُبہ گزرتا ہے، اس کے ساتھ ہی کہیں اگر دو چار ہوشیار مُرید بھی مل جائیں تو سبحان اللہ اپنے گُرو کی رُوحانی قوتوں کے ڈھونگ رچا کر اچھے اچھے ہوشیار اور تعلیم یافتہ لوگوں کو اُلو بنا سکتے ہیں، کتب ہائے تاریخی کے سینے ان نام نہاد رُوحانی پیشواؤں کی سیہ کاریوں سے سیاہ اور سادہ لوح انسانوں کے دل ان کے کارناموں سے چھلنی ہیں، یہ روحانی پیشوا ترک دُنیا کی تبلیغ کرتے ہیں لیکن خود شاہانہ زندگی کے لطف اُڑاتے ہیں، رُوحانیت کا سُنہری پردہ ان کے بُرے اور قابل ملامت افعال کی پردہ داری کرتا ہے، لوگ کہتے ہیں دُنیا نے اُنیسویں صدی میں بہت ترقی کی ہے اور توہمات کا پردہ تار تار ہو گیا ہے، بیشک اس تار تار اور زرتار پردے میں سے حقیقت نیم عریاں نظر آتی ہے، اب اس کی نیم عُریانیاں ہی اس کو یقین کا درجہ دیتی ہیں اور نفی سے اثبات کی طرف لاتی ہیں۔

اِس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ فطری طور پر انسان نہایت کمزور واقع ہوا ہے، اور آئے دن کے انقلابات، عروج وزوال، رنج وشادمانی، عزت وذلت اس کمزوری پر وہ اثر کرتے ہیں جو سونے پر

سُہاگہ، جب اسبابی دُنیا کے اسباب بگڑتے ہیں، اور حادثات کی تیز و تند موجیں مقاومت اور اثبات نفس کی قوتوں کو متزلزل کر دیتی ہیں تو کمزور طبع انسان ہر طرف ہاتھ پاؤں مارتا ہے، تنکوں کا سہارا ڈھونڈھتا ہے، ایسے موقعوں پر فقیروں کی بن آتی ہے، اپنی بے سر و پا باتوں سے کبھی کامیابی اور نجات کی بشارت دیتے ہیں، کبھی صبر کی تلقین اور آنے والی مصیبتوں کی پیشینگوئی کر کے تحفظ اور تدارک کے قیمتی نسخے تجویز فرماتے ہیں، تعویذ گنڈے، ٹونے ٹوٹکے اور وظیفے ایسے ہی تلخ اوقات میں دستگیری کرتے ہیں، اگر کسی کا بدرقہ تیر بہدف ثابت ہو گیا تو روحانی فوقیت اور طاقتوں پر شبہ کرنے والا کافر، ورنہ یہ کہہ کر صبر کر لیا گیا کہ خدا کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔

ہماری ایک عزیزہ مدت سے بیمار ہیں، کمزوری اور مسلسل بیماری نے انہیں کسی قدر توہم پرست بنا دیا ہے، کچھ فطرتاً اور کچھ واقعاً ان کو فقرا سے دلچسپی ہو گئی اور وہ اس حد تک پہنچی ہے کہ اگر ان کے دروازے پر کوئی فقیر نہیں آتا تو وہ سمجھتی ہیں برکات کا دروازہ بند ہو گیا، سُوء اتفاق سے ان کے شوہر کی تبدیلی ایک چھاؤنی میں ہو گئی، وہاں کئی دن تک کسی فقیر کی آواز کانوں میں نہ آئی ان کا دل آپ ہی آپ بیچین ہونے لگا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ چھاؤنی میں بھیک مانگنے کی اجازت نہیں، اس لئے یہاں کوئی فقیر نہیں آتا، انہوں

نے اپنے شوہر سے کہا مَیں ایسی جگہ پر نہیں رہ سکتی جہاں فقیر نہ ہوں، ان کے شوہر نے ان کو خیرات کرنے کے اَور اَور طریقے بتلائے، لیکن انہوں نے ایک نہ سُنی، آخر قریب کے دیہات میں سے فُقرا کو آدمی بھیج کر بُلانا پڑا، اب ان کو راستہ معلوم ہوگیا ہے، اس لئے جب موقع پاتے ہیں چھپ چھپا کر آجاتے ہیں اور بجائے پیسوں کے اکثر روپے ہی لے جاتے ہیں، جو لوگ گداگری کا انسداد کرنا چاہتے ہیں وہ اس قسم کے خیالات کو کس طرح تبدیل کرسکتے ہیں۔

درویشی | جس طرح اور مذاہب میں فقیروں اور گداگروں کی سرپرستی اور ان کی امداد واجب سمجھی جاتی ہے اسی طرح اسلام میں بھی فقیروں کے حقوق عوام میں مسلّم ہیں، اسی مذہبی رعایت سے گداگروں میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی ہے جو گداگری پر فقر کا طُرّہ لگاتی ہے، اور اپنے آپ کو درویش کے باعظمت نام سے امتیاز دیتی ہے، ان میں سے بعض کے فوق العادت کارنامے عالم و عامی کو مسحور کرتے اور فقر و درویشی کی عظمت کا سکّہ عوام کے دلوں پر بٹھاتے ہیں، ان بزرگوں کا رُوحانی فیض ابھی تک جاری ہے، اور ہمیشہ رہے گا، حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ باکمال درویش تھے اور اپنی رُوحانی قوّتوں اور بابرکت نظروں سے تقدیریں بدل دیتے تھے، افسوس کہ ان کے کارناموں سے عیّاروں اور مکّاروں نے

فائدہ اُٹھایا اور درویشی کے نام کو اُچھالا، ممکن ہو سکتا ہے اب بھی ان لوگوں میں باکمال اور فیض رساں درویش موجود ہوں لیکن جنس کاسد کی فراوانی نے زرِ عیار کو گمنامی اور رُسوائی کے غبار میں چھپا دیا ہے، جو لوگ درویشی کے دعویدار ہیں وہ خود بھی اصل اور نقل میں کچھ تمیز نہیں کر سکتے ہمارا اور آپ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

آج کل کے زمانے میں ہر موٹا مسٹنڈا گداگر اپنے آپ کو درویش کہتا ہے اور صاحب کمال ہونے کا مدعی ہے، درویشوں کی بُہتنات سے درویشی اور گداگری میں فرق صرف اتنا رہ گیا ہے کہ گداگر ایک ٹکڑے پر اپنا حق سمجھتا ہے اور درویش اپنے آپ کو دُنیا اور آخرت کی دولت کا مالک تصوّر کرتا ہے، جو چاہتا ہے وصول کرتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اس کو اپنی دولت سمجھ کر صرف کرتا ہے، گویا درویشوں کی شان شاہانہ ہے اور گداگر کی گدایانہ۔

اگر ہندوستان کے بڑے بڑے درویشوں کی ذاتی جائداد اور آمدنی کا اندازہ کیا جائے تو بلا مبالغہ اکثر لاکھوں کے آدمی نکلیں گے یہ گروہ اپنا سلسلۂ نسب اور رشتۂ مُریدی حضرت علی علیہ السّلام سے ملاتا ہے اور اس بات کا مدعی ہے کہ فقیری اور درویشی مذہب اسلام میں ان کی ذات فیض انتساب سے شروع ہوئی ہے، لیکن اگر ان حضرات اور آنحضرتؐ کی خصوصیات کا مقابلہ کیا جائے، تو زمین آسمان کا فرق نظر آئیگا وہ عدیم المثال درویش کبھی جوتیاں گانٹھتا

کبھی پتھر ڈھوتا تھا، اور جَو کی روٹی پر گزر اوقات کرتا تھا، وہ بھی کبھی کبھی وقت میسّر نہ آتی تھی، کھانے کو بیٹھے ہیں کسی گداگر نے دستک دیدی، جو کچھ دسترخوان پر حاضر تھا اس کی نذر کیا، پانی پی کر خدا کا شکر بجالائے اور عبادت میں مصروف ہو گئے، کئی کئی دن اس طرح گزر جاتے، لیکن دست سوال کسی کے سامنے دراز نہ ہوتا، گویا درویشی سے نعوز انسانی میں فرق نہ آنے پاتا، بر خلاف اسکے ہمارے درویشوں کی کچھ اور ہی حالت ہے، مَیں نے بچشم خود دیکھا ہے ایک ایک درویش آٹھ آٹھ آدمیوں کی خوراک کھا جاتا ہے، اور ڈکار تک نہیں لیتا، عبادت اور ریاضت کی گفتگو میں بہت ہیں لیکن عمل کا نام و نشان نہیں، تن و توش کو دیکھو تو رستم زماں، تارک دُنیا ہونے کے مدعی لیکن پُورے دُنیا دار، نام خاک نشین اور بے برگ و نوا، گھر کا جائزہ لو تو امیرانہ ٹھاٹھ، رئیسوں کی طرح عیش و عشرت کے کل سامان مہیّا، چار چار بیویاں، بیشمار لونڈیاں اَن گنت مُریدنیاں، لباس درویشی میں گدائے متکبّر، یا بھیڑ کی کھال میں بھیڑیئے، راعی نام مگر رعیّت کُش، رہبری کے موید، افعال و اطوار گمراہ کُن، گفتگو کو سُنو تو بے مغز کے الفاظ، بے سر و پا خیالات، سامعین کی یہ حالت کہ لفظ لفظ پر سر دھنیں، آنکھوں سے آنسوؤں کا تار نہ ٹوٹے، جو حکم ہو جاتے یا اگر کسی بات کا اشارہ پائیں تو یہ کہہ کر بجالائیں ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کُن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بیخبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

اگر سُوءِ اِتّفاق سے اندرونی حالت کا پتہ چل جائے تو کوئی شکل دیکھنے کا روادار نہ ہو، اور بیساختہ زبان سے نکلے کہ تقدس کے لباس میں کیسی گندگی اور نجاست پوشیدہ تھی، اگر دماغ پر تقدس کا پردہ پڑا ہوا ہو، تو یہ کہہ کر خوش ہو جائیں کہ اس میں بھی کوئی راز ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ درویشوں میں اہل اللہ اور خدا رسیدہ بزرگ ضرور ہوں گے لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ جو لوگ حقیقتاً درویش ہیں وہ دُنیادار نہیں، وہ تو اپنی ذات باصفات سے خلق اللہ کو فائدہ پہنچاتے ہیں چہ جائیکہ ان کو دونوں دونوں ہاتھوں سے لُوٹ کر کھا جائیں اور مُریدوں کی عزت، عصمت اور دولت غرض کچھ بھی ان کی دست برد سے محفوظ نہ رہے۔

گداگری بحیثیت فن | ہزارہا سال کی مشق نے گداگری کو فن کی حیثیت دیدی ہے، جس طرح اور پیشے ہیں اسی طرح گداگری بھی باقاعدہ پیشہ بن گیا ہے، اگر کبھی فقیروں اور گداگروں کی منڈلیوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں میں بھی خاندانی فقیروں اور گداگروں کو بڑی عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، نیز انسانی جذبات اور احساسات کو گداگری فنا نہیں کر سکتی، وہ بالکل ہم جیسے انسان ہیں، عشق و محبت اور گناہ کا شوق ان لوگوں میں عام اِنسانوں

کی طرح موجود ہے بلکہ نام ونمنگ کا خیال ہم لوگوں کو اکثر مانع آتا ہے لیکن یہ لوگ وہ ہیں جن سے لیلیٰ مجنوں کے افسانے زندہ اور شیریں و فرہاد کے کارنامے تازہ ہیں، اگر ان لوگوں کے لباس سے ہم لوگ بھی حضرت غالب کی طرح فائدہ اُٹھانا چاہیں تو مضائقہ ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا میری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

خیر یہ تو فن گداگری کی برکات ہیں، سوال یہ ہے کہ گداگری کی اگر فنی حیثیت تسلیم کر لی جائے تو اس کے تعلیمی ادارے کہاں واقع ہیں جہاں تک ہماری معلومات مساعدت کرتی ہیں ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ دُنیا میں کہیں بھی فن گداگری سکھانے کا منظور شدہ کالج یا مدرسہ نہیں، اب تک یہ فن سینہ بہ سینہ اور پُشت در پُشت چلا آتا ہے، لیکن مستقبل قریب میں گداگری کی باقاعدہ تعلیم گاہیں جاری ہو جانے کا قوی امکان ہے، کیونکہ ملک میں کوشش ہو رہی ہے کہ فقیروں اور گداگروں کے لئے تربیت گاہیں کھول دی جائیں تاکہ ان لوگوں کو بھیک مانگنے کی ضرورت پیش نہ آئے، اس تحریک سے بعض لوگ یہ خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ اس تجویز کو عمل میں لانے سے گداگری کے فن کو سخت نقصان پہنچے گا، لیکن ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ ایسا ہونے سے فن گداگری کی درس وتدریس خودبخود سائنٹیفک اصول پر آجائے گی، اور گداگری کا مستقبل خوب چمک جائیگا، اس وقت تک گداگری کے

بلندی محض اتنا جانتے ہیں کہ کس شخص کی جیب سے پیسہ کیونکر نکالا جاسکتا ہے، یا کتنا اخلاقی دباؤ ڈالنے سے کسی کو خیرات دینے پر مجبور کرسکتے ہیں، باقاعدہ درس و تدریس سے ایسے سائٹیفک طریقے دلوں سے ناخنوں میں آجائیں گے اور گداگروں کی فنّی کامیابی مسلّم ہو جائیگی۔

بہرحال اگر رسمی اور منظور شدہ گداگری کے ادارے موجود نہیں تو افسوس نہیں کرنا چاہئے، غیر رسمی ادارے بکثرت موجود ہیں، جو پبلک کی امداد سے چل رہے ہیں، دُنیا بہ اُمید قائم، سرکاری امداد بھی مل جائیگی، اب تک گداگری کے غیر رسمی ادارے مندروں، مسجدوں اور مزاروں کی سرپرستی میں قائم ہیں، ان اداروں میں گداگری کی تعلیم مفت دی جاتی ہے، اگر خوبیٔ قسمت سے وہاں کسی اہل کمال کی صحبت میسّر آجائے پھر نہ تو اپنی تقدیر پر آنسو بہانے اور افسوس کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی اور پیشے پر رشک کھانے کی حاجت، بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے اللہ اس بہتات سے دیتا ہے کہ سمیٹے نہیں سمٹتا۔

سائنٹیفک گداگری بعض بے خبروں کا خیال ہے گداگری ہندوستان سے مخصوص ہے انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یورپ میں بھی گداگری کی کثرت ہے، وہاں گداگری کی ایسی عدیم النظیر مثالیں ملتی ہیں کہ ہندوستان والوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتیں، بات

یہ ہے بڑے لوگوں کی بڑی باتیں، دانایانِ فرنگ کی عقل و دانش کی اطراف عالم میں دھوم ہے، ان کے ہاں ہر کام کو سائنٹفک اصولوں پر کرنے کی عام عادت ہے، اس لئے گداگری بھی سائنٹفک طریق پر ہوتی ہے، بلکہ ممالک یورپ میں گداگری کو تحفظ شاہ پسندی کا فخر بھی حاصل ہے، گویا ان کے ملک میں غیر ملکی شخص گداگری نہیں کر سکتا، یہ ہمارا ہی ملک ہے جس میں صلائے عام کا ڈنکا بج رہا ہے اور مادر وطن کا دامن بلا امتیاز مذہب و ملّت ہر ایک کو پناہ دینے کے لئے تیار ہے، غالباً اسی لئے ہندوستان کو جنّت نشان کہتے ہیں۔

حسن اتفاق سے کسی رسالے میں پیرس کے ایک گداگر کا مقدمہ میری نظر سے گزرا، اس دلچسپ مقدمے کے دلچسپ واقعات کچھ اس طرح سے تھے جیسے کوئی فقیر مدّت سے ایک مخصوص جگہ پر بیٹھتا تھا، اس کی آمدنی نہایت معقول تھی، ایک اور گداگر نے اس جگہ کو پسند کیا اور فقیر سے کہا بولو بھائی اس جگہ کا قبضہ مجھے کتنے میں دوگے، سودا ہوتے ہوتے ایک سو پونڈ پر فیصلہ ہو گیا، قیمت ادا کر دی گئی اور گداگر کا اس پر قبضہ ہو گیا، یہ کتنی ہی مدّت وہاں بیٹھے لیکن اتنی آمدنی نہ ہوئی جتنی پہلے فقیر کو ہوتی تھی، تنگ آکر فریب دہی کا مقدمہ عدالت میں دائر کر دیا کہ فلاں جگہ کا قبضہ میں نے فلاں فقیر سے ایک سو پونڈ دے کر لیا جس قدر آمدنی کا یقین

دلایا گیا تھا وہاں سے اس کی نصف بھی نہیں ہوتی، لہٰذا ملزم کو سزا دے کر میری رقم مجھے واپس دلائی جائے، مجھے یاد نہیں ان دونوں میں کون جیتا اور کون ہارا، انصاف یقیناً ہوا ہو گا، اور کچھ تعجب نہیں کہ پہلا فقیر کامیاب ہوا ہو، کیونکہ اس مخصوص جگہ کی آمدنی میں اس کی ذاتی خصوصیات اور کمالات کو بھی دخل تھا۔

اس مقدمہ کی کارروائی اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ یورپ میں گداگری نہایت منظم اور باقاعدہ اصولوں سے ہوتی ہے، کوئی شخص کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا، چھوٹے موٹے گداگر علم ضرورت کی چیزیں خوانچوں میں لگائے چیلوں کی طرح منڈلاتے پھرتے ہیں، آپ ان سے ایک دیا سلائی لے کر سگرٹ سلگا لیجئے اور پوری ڈبیہ کی قیمت چُپ چپاتے ادا کر دیجئے، ظاہر ہے ان طریقوں سے گداگری کا انسداد نہیں ہوتا بلکہ گداگری کی طرف رغبت بڑھتی ہے، میرے نزدیک ہمارے گداگروں کا طریقہ زیادہ مہذب اور سائنٹفک ہے کہ وہ سر پر اپنی ضرورت اور حالت کا اظہار چند پُر اثر الفاظ یا صورت حال سے کر دیا اور حسب حیثیت کچھ نہ کچھ وصول کر لیا۔

گداگری کے عام طریقے چونکہ ہمارے ملک میں گداگری نے ابھی شاہ پسندی کا اعزاز اور باقاعدہ فن کی حیثیت، اختیار نہیں کی، اس لئے یہاں گداگری بہت کس مپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی ہے، اس ترقی کرنے والے فن کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ گداگری اور ذلت کو ہم معنی سمجھا

جاتا ہے، لیکن باوجود اس بے اعتباری کے ہمارے گداگر کافی ترقی کرچکے ہیں اور اپنے فن میں اس قدر ہوشیار ہوگئے ہیں کہ مہذب ممالک کے گداگر ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے، ہمارے ناخواندہ گداگروں کے معمولی کارنامے ہیں کہ اپنے پاؤں پر تیزاب ڈال کر اُسے جلا ڈالا، یا گوشت کا پارچہ کسی عضو پر پھٹی پُرانی دھجیوں سے باندھ لیا، اس میں سے خُون بہ رہا ہے، پیپ رس رہی ہے، مکھیاں بھنک رہی ہیں اور فقیر خوفناک اور درد بھری آواز سے کراہ رہے ہیں، مُنہ سے جھاگ جاری ہیں، پیٹ کمر سے لگا ہے، ایک ہاتھ مُنہ کی طرف ہے، دوسرے سے پیٹ کی جانب اشارہ کر رہے ہیں، آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری ہیں، بچّہ گود میں ہے اسے چٹکیاں لے لے کر رُلائے جاتے ہیں، اور ظاہر کرتے ہیں کہ بھوکا ہے، کسی حاملہ فقیرنی کی خدمات حاصل کرلیں، وہ ساتھ ساتھ ہے، رو رہی ہے، درد سے بےچین ہے، گویا بچّہ ہونے کو ہے، لوگ ترس کھا کھا کر پیسے دیتے چلے جاتے ہیں، لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ شہر میں بہت سے زنانے خیراتی ہسپتال ہیں بھیک کیوں مانگتے ہو، کیا فطرت کو عُریاں کر رہے ہو، کانٹوں پر تڑپ رہے ہیں، شیشے بچھا کر ان پر لیٹے ہیں، اُوپر کا دھڑ زمین میں دفن ہے، چادر بچھی ہوئی ہے، اس پر پیسوں کے ڈھیر لگے ہیں، اور کچھ نہیں تو مٹی کھائے جاتے ہیں، گھاس سے مُنہ بھر لیا، جگالی کر رہے ہیں، جمعرات اور منگل کو جوق در جوق دورہ کر کے بغیر مانگے پیسے ہی پیسے جمع کر لئے، کسی نوجوان کو خوبصورت

دلہن ملنے کی بشارت دی، کسی کو اولاد کی دعائیں سنائیں، اور تھوڑی سی کوشش سے کچھ نہ کچھ وصول کر لیا، ہمارے معمولی گداگروں کے یہ ادنےٰ کرشمے ہیں اور اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ فلسفہ جذبات کے پورے پورے ماہر ہیں۔

ہوشیار گداگر | عام گداگروں کے ہاتھوں فقیری اور گداگری کا پیشہ سخت نقصان اُٹھا رہا ہے، اور یہ خرابی اس پیشہ کی عام مقبولیّت اور باقاعدہ تعلیم کے فقدان سے پیدا ہو رہی ہے، ہوشیار گداگر چند پیسوں کے لئے اپنی عزّت کبھی خطرے میں نہیں ڈالتا، وہ ایسے طریقے سے مانگتا ہے کہ فقر کی شان برقرار رہے اور اپنی عزّت میں کوئی فرق نہ آنے پائے، جس کی جیب خالی کی جائے وہ یہ نہ سمجھے کہ اس سے بھیک مانگی گئی ہے بلکہ یہ خیال کرے کہ اس نے فرضِ انسانی ادا کیا، اور اپنا گھر جنّت میں بنایا ہے، یا اس کارِ خیر سے وہ ثواب کمایا ہے کہ باقی عمر میں کسی کارِ خیر کی ضرورت نہیں رہی، بالفرض اگر کسی فریب خوردہ کو اپنی حماقت اور فقیر کی مکّاری کا پتہ بھی چل جائے تو افسوس کرنے کی نوبت نہ آئے بلکہ بیساختہ کہہ اُٹھے اس کا حق تھا جو اُس نے نہایت خوبصورتی سے وصول کر لیا۔

ہمارے ملک میں اس قسم کے ہوشیار گداگر بکثرت ہیں، اگر یورپ اپنی سائنٹفک گداگری پر ناز کر سکتا ہے تو ہم بھی بلا مبالغہ ہندوستان کے بے ضابطہ اور بے قاعدہ حاصل کئے ہوئے فنِ گداگری

پر فخر کرنے میں حق بجانب ہیں۔

ہوشیار اور تجربہ کار گداگروں سے کم و بیش ہر شخص کا واسطہ پڑتا ہے، اگر بدقسمتی سے کوئی ان دلچسپیوں سے محروم رہ جاتا ہے، تو اکثر یار دوستوں اور عزیزوں سے گداگروں کی نہایت مزیدار باتیں سننے میں آجاتی ہیں، چنانچہ میں بھی گداگروں اور درویشوں کے فیضان سے بے بہرہ نہیں، اس لئے چند ذاتی تجربات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

کوئی سولہ سترہ برس کا ذکر ہے، والد مرحوم کا تازہ تازہ انتقال ہوا تھا، یتیمی کے صدمے سے دل مجروح اور دماغ معطل تھا، ایک دن ٹھیک دوپہر میں دروازے پر کسی نے دستک دی، میں نیچے اترا، ایک خضر صورت، درویش صفت بزرگ کھڑے تھے، انہوں نے نہایت تپاک سے سلام علیکم کہا، دونوں ہاتھوں سے ہاتھ ملایا، ڈیوڑھی میں تخت بچھا ہوا تھا، اس پر بلا تکلف بیٹھ گئے، والد کے انتقال کا نہایت دردناک الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے پھر میرے سر پر دست شفقت پھیرا اور دعائیں دیتے ہوئے فرمایا کہ میں ملتان سے آیا ہوں، تمہارے والد سے میری ملاقات تھی، خدا بخشے ہمیشہ مہربانی فرماتے تھے، اس وقت میں بہت مصیبت میں مبتلا ہوں، شرافت زبان ہلانے کی اجازت نہیں دیتی، یہ کہتے کہتے آنکھوں سے آنسو امنڈ پڑے، جس طرح بھی ہو

پانچ روپیہ دیدو بیٹا، مَیں دُعا کرونگا، خداوند کریم تمہاری پریشانی دُور کر دے گا۔ ان بزرگ کا جادُو مجھ پر اثر کرچکا تھا، مَیں اطمینان سے اُوپر گیا، ان کی خضر جیسی بُزرگانہ صورت، بڑے سے پگڑ، چھاج جیسی ڈاڑھی، اور اعرابی لباس سے پوری طرح مرعوب تھا، ہر چند سب نے منع کیا، لیکن مَیں نے پانچ روپے لاکر اُن کے حوالے کئے، روپوں پر قبضہ کرتے ہی اُنھوں نے دُعائیں دیتے ہوئے اپنا رستہ لیا، مجھے ابھی تک یہ واقعہ اس طرح یاد ہے جیسے آج کا دن، لیکن کبھی اس بات کا افسوس نہیں ہوا، چاہے میری یہ ہٹ دھرمی ہی سمجھئے۔

اس قسم کے دلچسپ واقعات بکثرت پیش آتے ہیں، لیکن لُطف اُس وقت آتا ہے جب کوئی کسی ہوشیار گداگر کے جال میں پھنستا ہے، اور یہ لطف اور بھی دوچند ہو جاتا ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ مجھے دھوکا اور فریب دیا جارہا ہے، لیکن پھر بھی سائل کی درخواست رد کرنے کی جرأت نہیں ہوتی، بلکہ عقلمندی اسی میں سمجھتا ہے کہ جانتے بوجھتے بیوقوف ہی بن جائے، خاص کر بڑے شہروں میں اس قسم کے گداگروں سے اکثر سابقہ پڑتا ہے وہ شاید اس لئے کہ شہری لوگ دیہاتیوں کی نسبت اپنے آپ کو زیادہ ہوشیار سمجھتے ہیں، بہرکیف تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ روپوں کی بلا چند پیسوں میں ٹل سکتی ہے، بشرطیکہ انسان تفکرات اور پریشانیوں میں مبتلا نہ ہو، اگر کسی وقت قلب پر رقت طاری ہو اور حُسنِ اتفاق سے کوئی نبض شناس

گداگر مل جائے پھر تو جیب خالی ہی کرنی پڑتی ہے، چاہے بعد میں آپ کچھ ہی کہا کریں۔

دلّی میں ایک بہت ہوشیار گداگر ہیں، مجھے ایک دو مرتبہ ان کے ساتھ ہمدردی کرنے کا فخر حاصل ہے، ان کا روزانہ کا کام یہ ہے کہ کسی نئی آسامی کو دیکھا، گھر تک ان کا تعاقب کیا، دوسرے دن نہایت اطمینان سے جاکر دروازے پر دستک دیدی، نہایت مایوسانہ انداز میں مُنہ بسورتے ہوئے عرض کیا کہ میں کوئی بھکاری نہیں ہوں، مصیبت زدہ ہوں، اتنے میں دو چار آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے میں تارکشی کا کام کرتا تھا، معقول آمدنی تھی، میاں خُدا تمہیں مصیبت سے بچائے، شہزادوں میں سے ہوں، خدا کی قسم آج تک کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا، لیکن آج حالات نے مجبور کر دیا ہے مشین کے تاگے نے تارکشی کا کام تباہ کر دیا، گھر میں میّت پڑی ہے، کفن کو ایک پیسہ نہیں، بچے بھوک کے مارے جاں بلب ہیں، میں کچھ نہیں کہتا، چل کر دیکھ لیجئے، عمر بھر دُعائیں دوں گا، میری عزّت کو بچا لیجئے خدا آپ کو اجر دیگا۔

اب کون جاتا ہے اور کون دیکھتا ہے، جو کچھ بن آیا خود دیدیا، اگر جادو نے پُورا پُورا اثر کیا، تو محلّے میں سے دس پانچ اور جمع کر دیئے، ایک دفعہ ایک صاحب اس کی گفتگو سے ایسے اثر پذیر ہوئے کہ کفن دفن کے لئے روپے لےکر اس کے ساتھ ہو لئے، لیکن سائل راستے

ہی میں غائب ہو گیا، ایک اور صاحب کے متعلق سُنا ہے کہ وہ جھوٹے کے گھر تک پہنچے، اور وہاں سے بے نقط سُناتے آئے۔

آج کل مسافری کا چکمہ بہت عام ہو گیا ہے، اور ہر شخص اس سے واقف ہے، لیکن پھر بھی ہوشیار گداگروں کے لئے ابھی تک بہت گنجائش ہے، گٹھ کتروں کی داستان سُنا کر شرافت اور عزت کا سہارا لیتے ہوئے کچھ نہ کچھ وصول کر ہی لیا جاتا ہے، بڑے بڑے سٹیشنوں پر اکثر اوقات مایوسانہ شکل بناتے کوئی نہ کوئی گداگر مل جاتا ہے، روپیہ سوا روپیہ ہاتھ میں ہے، دو روپے کی اور ضرورت ہے، آپ جیسے فیّاض اور خدا ترس لوگوں کی مسافر نوازی سے اتنے جمع ہو گئے ہیں، بس کچھ نہیں کہتا میں نے آج تک کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا، تین روپے میں فلاں جگہ کا ٹکٹ آتا ہے، آپ دریافت کر لیں، مجھے ٹکٹ خرید دیجئے، دو تین روپے بھلا ایک دم کون دیتا ہے، ہاں ایک آدھ میں کیا کلام ہو سکتا ہے، اس طرح سے ایک دو گھنٹے میں دو چار روپے جمع ہو جانے معمولی بات ہے۔

مجھے ایک نصف ذاتی واقعہ ہمیشہ یاد رہیگا، گذشتہ سال ایک ہوشیار گداگر میری سسرال پہنچے، بڑے تپاک سے میرے خسر صاحب سے ملے، میرے سارے خاندان سے پوری پوری واقفیت کا اظہار کیا اور کہا کہ میں نے آپ کے داماد کو پالا پوسا ہے،

اب مَیں دہلی جارہا ہوں، بیوی اور بچّے کو سٹیشن پر چھوڑ آیا ہوں، یہاں تک کا ٹکٹ میرے پاس تھا وہ ختم ہو گیا، میرا خیال تھا، آپ کے داماد یہاں ہوں گے تو وہ مجھے دہلی بھیجنے کا انتظام کر دینگے، آپ سے عرض کرتے ہوئے شرم آتی ہے، مَیں دہلی پہنچتے ہی انہیں روپے دیدوں گا، اگر آپ کو یقین نہ آئے تو مَیں آپ کے ہاں ٹھہر جاتا ہوں آپ تار دے کر انہی سے دریافت کر لیجئے، مَیں نے آپ کے سمدھیانے کی اور خاص کر آپ کے داماد کی مُدّتوں خدمت کی ہے، وہ ہوتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا، نام اور پتہ صحیح بتانے اور ہر سوال کا معقول جواب دینے سے ہمارے جہاندیدہ خُسر صاحب کو پورا یقین ہو گیا کہ یہ شخص جو کچھ کہتا ہے بالکل درست ہے اُنہوں نے نہایت اطمینان سے دو آدمیوں کا دہلی کا کرایہ دے کر انکو رخصت کیا، ان سے کھانا نوش فرمانے کے لیئے کہا تو اُنہوں نے جواب دیا جو کچھ آپ نے مہربانی فرمائی ہے وہ بہت کافی ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری بیوی بچّے بھوکے رہیں اور مَیں کھالوں، چنانچہ اس بات پر ایک روپیہ اور وصول کیا، کہتے ہیں وہ تو یہ بھی کہتا تھا کہ اگر کوئی چیز دہلی بھیجنی ہو تو بھیج دیجئے، لیکن ہمارے خُسر صاحب نے زبانی پیغام ہی کافی سمجھا اور زیادہ محبّت کا اظہار نہ فرمایا۔

کچھ مُدّت کے بعد جو میرا سسرال جانا ہوا تو باتوں باتوں میں یہ ذکر بھی آگیا، جو نام وہ بتاتے تھے مَیں نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ سُنا تھا،

آخر بہت لمبّی چوڑی مضحکہ خیز بحث و تمحیص کے بعد انہوں نے فرمایا کہ سمدھیلنے کا معاملہ تھا، اس لئے یقین کرنا اور روپے دے دینا ہی مناسب تھا۔

اس قسم کے واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں لیکن گزشتہ سال ایک نہایت دلچسپ حادثہ پیش آیا اگرچہ اس کا میری جیب پر کوئی اثر نہیں پڑا لیکن اگر پڑتا بھی تو افسوس نہ ہوتا، ایک دن شام کا وقت تھا، میں ایک ڈاکٹر کی دکان پر بیٹھا تھا اتفاق ایسا ہوا کہ وہاں حضرت خواجہ حسن نظامی بھی تشریف لے آئے، ان کے آنے کے تھوڑی دیر بعد ایک اور نوجوان بھی آ بیٹھے، معلوم ہوتا تھا کوئی مریض ہے، یا کوئی دوا لینے آیا ہے، رسمی گفتگو کے دوران میں خواجہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے اس نوجوان کی طرف اشارہ کرکے پوچھا، یہ کون صاحب ہیں، ڈاکٹر صاحب نے عدم واقفیت کا اظہار کیا، خواجہ صاحب نے انہی سے دریافت فرمایا۔ "عاقل را اشارہ کافی" وہ شخص ایک دم چیخیں مار مار کر رونے لگا، حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا، روتے روتے ہچکیاں لے کر اس نے اپنی داستان یوں سنائی کہ میں کانپور سے آیا ہوں، کارونیشن ہوٹل میں قیام ہے، ایک صاحب میرے ساتھ تھے، وہ میرا بٹوہ لے کر غائب ہو گئے، ہوٹل والا مجھے تنگ کر رہا ہے، کہتا ہے پولیس کے حوالے کر دونگا، سامان ضبط کر لونگا، دو وقت سے کچھ نہیں کھایا، آج رات کو وہ مجھے نکال دیگا اور پتہ نہیں کیا سلوک کریگا، عجب مصیبت

میں مبتلا ہوں، ہر چند ڈھونڈھا ہے، کوئی واقف نہیں ملا، خدارا مجھے اس مصیبت سے بچائیے، خواجہ صاحب نے مجھ سے کہا، آپ ان کی مدد کرینگے، میں نے عرض کیا جو آپ فرمائیں، ادھر ڈاکٹر صاحب نے خود بخود اپنے بٹوے کا جائزہ لینا شروع کیا، اتنے میں وہ نوجوان قہقہہ مار کر ہنس دیا، ہم سب لوگ حیران رہ گئے، معلوم ہوا کہ یہ صاحب تعلیم یافتہ نقّال ہیں اور ریڈیو میں اپنے کمالات نشر کرنے آئے ہیں۔

ہم لوگ ان کے کمالات کے معترف اور دل ہی دل میں شرمندہ ہوئے کہ اصل اور نقل میں تمیز نہ کر سکے، اگر گداگر میں اس قسم کے اوصاف ہوں تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کتنی آسانی سے لوگوں کی جیبیں خالی کرا سکتا ہے، ہمارے ہوشیار گداگر اسی قسم کے کمالات سے متصف ہیں، اسی لئے ان پر کیمیا گر ہونے کا شبہ ہوتا ہے، اگر ان کی جامہ تلاشی لی جائے تو ہزاروں روپے کی اشرفیاں ان کی گدڑی میں سے برآمد ہوتی ہیں، میری نظروں میں کئی ایسے گداگر ہیں جو اپنے ذاتی مکانوں میں رہتے ہیں، شادی بیاہ کے موقعوں پر نہایت پُر تکلف دعوتیں کرتے ہیں اور رسُوم عروسی کی ادائیگی میں اچھے اچھے امیروں سے پیچھے نہیں رہتے، یہی وہ گدا ہیں جو اپنے پیشے میں کامیاب گدا کہلانے کے مستحق ہیں، اور گداگری کا نام ان کی بدولت اُونچا ہے۔

~~~
~~~

ہمدردی

؟ خداوند تعالےٰ نے انسانی جسم میں جس قدر اعضا اور قویٰ بنائے ہیں ان کا کوئی نہ کوئی مصرف ضرور رکھا ہے، گویا ہماری کوئی قوت اور حصّۂ جسم بیکار نہیں، ہمارے تمام اعضا کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک تو وہ اعضا ہیں جو ہمارے جسم میں حاکم کا کام کرتے ہیں اور اعضائے باطنی کہلاتے ہیں، دوسرے وہ اعضا جو اعضائے باطنی کے احکامات کو ماتحتوں کی طرح بجا لاتے ہیں، ان کو ماہرین نے اعضائے ظاہری کا نام دیا ہے، چنانچہ ہمدردی ایک ایسی تحریک ہے جو اعضائے باطنی سے حرکت میں آتی ہے اور اعضائے ظاہری اس سے اثر پذیر ہو کر مختلف حرکات شائستہ کا اظہار کرتے ہیں۔

ہمدردی کا جذبہ کم و بیش ہر انسان بلکہ حیوان میں بھی موجود ہے، اس کا اثر طبیعت یا قلب و دماغ پر اس طرح سے ہوتا ہے کہ دوسرے کی تکلیف یا دُکھ درد کو دیکھ کر دیکھنے والے کے دل و دماغ میں ایک قسم کی بےچینی یا ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے، اور خواہ مخواہ بغیر کسی تعلق یا معقول وجہ کے انسانی طبیعت ان اسباب تکلیف کو دُور کرنے

کے لئے اُکساتی ہے، یہ مسلّمہ امر ہے کہ ہمدردی ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے، جن سے روحانی اور جسمانی تعلق زیادہ ہوتا ہے گویا ہمدردی کا دائرہ اثر تعلقات کی وسعت اور گہرائی کے ساتھ ساتھ گھٹتا بڑھتا ہے۔

انسان کی انسان کے ساتھ ہمدردی ہونا ایک معمولی سی بات ہے کیونکہ ؎

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند

جذبۂ ہمدردی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے پرائے کی قیود سے آزاد ہے، چنانچہ ہمیں حیوانات کے ساتھ بھی ہمدردی ہے، ان کے دُکھ درد میں ہم شریک ہوتے ہیں، اگر کوئی جانور مرجاتا ہے، تو اس پر ہم افسوس کرتے ہیں، پالتو جانوروں کے ضائع ہونے پر آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں اس سے بڑھ کر اگر سانپ جیسے موذی جانور کو ہم کچلتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو اسوقت بھی ہمارے دل میں ہمدردی کی تحریک کچھ نہ کچھ ضرور حرکت میں آجاتی ہے۔

ہمدردی کا جذبہ محض جانداروں تک ہی محدود نہیں ہمیں بیجان چیزوں سے بھی ہمدردی ہوتی ہے، مثلاً پُرانے زمانے کی تباہ شدہ شاہی عمارتیں دیکھ کر انقلابات ایّام کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور ہم بے ساختہ ان کھنڈرات سے

ہمدردی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔

اگر ہم کسی عمدہ کتاب، تصویر یا کسی اور قیمتی چیز کو کسی نااہل کے قبضے میں دیکھتے ہیں تو ہمیں اس چیز سے خواہ مخواہ ہمدردی ہو جاتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی ہمدردی بہت ہی خطرناک ہے، کیونکہ اگر وہ زر اور زاری سے ہاتھ نہ آئے تو ہم خلاف قانون ذرائع بھی اختیار کر لیتے ہیں، ایسی ہمدردی کی بدولت اکثر بڑے بڑے فسادات اور بغاوتیں برپا ہو جاتی ہیں۔

ہمدردی کا تجزیہ | علم جذبات کے ماہروں نے ہمدردی کو محبت، دوستی اور قوم پرستی سے علیحدہ جذبہ قرار دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ ہمدردی اس تحریک کو کہتے ہیں جس کے ذریعے دوسروں کی خوشی سے خوشی اور رنج سے رنج ہوتا ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر یہ لطیف رُوحانی تعلق مصیبت زدہ لوگوں سے ہو تو اس کی رحمدلی کہیں گے، کسی ایک شخص پر محیط ہو جائے تو دوستی کہلائیگی، کسی مخصوص قوم کے ساتھ ہوگا تو اس کو قوم پرستی کے نام سے موسوم کیا جائے گا، اور اگر یہ تعلق اس قدر وسیع ہو کہ تمام بنی نوع انسان اس کے دائرے میں آجائیں تو اس کو ہمدردی کہیں گے۔

بعض فلاسفہ کا نظریہ اس کے برعکس ہے، وہ کہتے ہیں، ہمدردی اور دوستی ایک ہی جذبے کے دو مختلف نام ہیں، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہمدردی اور دوستی ایک دوسرے سے بہت ہی قریب ہیں،

بعض اوقات ان میں امتیاز کرنا بہت ہی دشوار ہو جاتا ہے، بہرحال ہمدردی ایک نہایت ہی پاکیزہ، بے لوث اور شریفانہ رشتہ محبت ہے جو بغیر کسی لالچ یا فائدہ کے خیال کے ایک انسان کو دوسرے انسان سے ہوتا ہے، جن لوگوں میں ہمدردی کا مادہ ہوتا ہے وہ دوسروں کے لئے بلا وجہ تکلیف اُٹھاتے ہیں، اس تکلیف یا انسانی فرض کی ادائیگی سے ایک قسم کی رُوحانی خوشی اور اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے، نیز رُوح میں بالیدگی طبیعت میں استقلال اور مرتبہ انسانیت میں کمال حاصل کرنے کی قوّت پیدا ہوتی ہے۔

ہمدردی قربانی سکھاتی ہے | وہ لوگ جن کے دلوں میں خدا نے ہمدردی کا بیج بویا ہے خود غرضی، غرور اور تکبّر سے کوسوں دُور ہیں، اولوالعزمی ہر وقت ان کو بیکسوں کی امداد کے لئے اُبھارتی ہیں، انسانی ہمدردی انہیں دوسروں کی مصیبتیں اپنے سر لیتے وقت سہارا دیتی ہے۔

ہمدرد انسان دوسروں کی مدد فی سبیل اللہ کرتے ہیں، وہ کسی صلے کی تمنّا نہیں رکھتے گویا نیکی اس لئے کرتے ہیں کہ نیکی ہے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ نیکی امیر کے ساتھ کر رہے ہیں یا غریب کے ساتھ، بلکہ ایسے لوگوں کی مدد کرنا جن کی مدد کرنے سے عام لوگ گریز کریں باعث فخر و مباہات خیال کرتے ہیں، اپنی ذاتی خواہشوں اور آسائشوں کو دوسرے کی بہبودی پر ترجیح نہیں دیتے، یہی وہ لوگ ہیں جن کی نیک نیتی کی بدولت دُنیا میں ہمدردی اور انسانیت کا نام باقی ہے۔

ہمدرد انسان کس قدر بے لوث اور عالی ہمّت ہے وہ نہیں دیکھتا کہ دشمن کے ساتھ ہمدردی کر رہا ہے یا کسی دوست کے ساتھ، اپنے مذہب والا اس کی ہمدردی سے فائدہ اُٹھا رہا ہے یا کوئی ایسا شخص جو اس کے مذہب یا ذات پر جا و بیجا نکتہ چینی کرنے والا ہے، غرض ادنیٰ، اعلےٰ، امیر، غریب، فقیر، محتاج، اپنے پرائے، مُلکی اور غیر مُلکی ہمدرد انسان کی دولت، ہمّت، قلم اور زبان سے یکساں فائدہ اُٹھاتے ہیں، اس کی نفس کُشی، بلند ہمتی، عالی حوصلگی اور تکمیل انسانیّت کا اس سے بہتر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

ہمدردی مصنوعی بھی اچھی ہے

یہاں ان لوگوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جن کے دلوں میں ہمدردی کا شائبہ تک نہیں ہوتا، لیکن محض اپنی شہرت اور عزّت میں اضافہ کرنے کی خاطر وہ ہر موقعے پر ہمدردی کا اظہار کر کے عوام میں مقبولیّت حاصل کر لیتے ہیں، ہمدردی چاہے بناوٹی طور پر کی جائے اور چاہے کوئی طبیعت کی تحریک سے ہمدردی کرے، ہر حال میں قابلِ ستائش ہے، ہاں اس سے ان لوگوں کی رذالت ضرور ثابت ہوتی ہے جو نمائش کے لئے ہمدردی کرتے ہیں، ہمدردی دکھلاوے کی چیز نہیں، دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنا اپنے ساتھ بھلائی کرنا ہے، بغیر صلہ یا نمائش کی تمنّا کے نیکی کرنے سے جو روحانی لذّت اور مسرّت حاصل ہوتی ہے اسے کچھ وہی لوگ جانتے ہیں، جو اس کے مزے سے آشنا ہیں،

ورنہ تکلف میں سراسر تکلیف ہے ، بہرحال ہمدردی پھر بھی اکارت نہیں جاتی ، اگر کوئی شخص اس کے اشتہار سے اعلیٰ رتبہ یا بلند مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو وہ بھی مل جاتا ہے ، اب ہمدردی تو کتنی پیاری ہے کہ ہر لباس میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور دوست دشمن سب کو یکساں مرغوب ہے۔

حیوانات بھی ہمدردی سے خالی نہیں

انسان تو اشرف المخلوقات ہے وہ اگر ہمدردی کے جذبہ سے بیچین ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں ، کیسی عجیب بات ہے کہ جانوروں کے دل بھی اس شریف جذبے سے معمور ہیں ، بہت ہی مشہور کہانی ہے کہ ایک زخمی کتے کو ایک دوسرا کتا جو پہلے کبھی زخمی ہو کر کسی ہسپتال میں اچھا ہوا تھا ، کان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا اُسی ہسپتال میں علاج کے لئے لے گیا ، بھڑ ایک چھوٹا سا کیڑا ہے ایک کو چھیڑو دس بارہ بھنبھناتی ہوئی آجاتی ہیں ، ایک کتے کو مارو چاروں طرف سے کتے بھونکتے ہوئے نکل آئیں گے ، کتے میں اور جانوروں کی نسبت کچھ زیادہ ہمدردی کا جذبہ ہے ، اسی لئے ہمارے شعرا بھی اس کو رقیب سے کم درجہ نہیں دیتے ، عاشق نے محبوب کی گلی میں قدم رکھا اور اس نے بھونکنا شروع کیا ، سارے محلے کو آگاہ کر دیا کہ آپ تشریف لے آئے ہیں ، ہوشیار ہو جانا ، کتے کو چھوڑ کر اور جانور بھی اس جذبے سے متمتع ہیں ، جن کا ذکر کرنا بیجا طوالت ہے ، کسی کتاب میں میری نظر سے ہمدردی کا

ایک بالکل سچّا واقعہ گزرا جس کا بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

حیوانی ہمدردی کا حیرت خیز مظاہرہ

سنہ ۱۹۰۸ء میں ایک بہت بڑا قافلہ کوہ سیاہ کے قریب سے گزر رہا تھا، یہ لوگ خلیج فارس کی بندرگاہوں سے پوشیدہ طور پر بندوقیں اور ہتھیار وغیرہ خرید کر افغانستان لے جا رہے تھے، رستے میں ایرانی حکومت کے دو سپاہیوں نے ان کو روکا، ان لوگوں نے ان دونوں سپاہیوں کو قید کر لیا اور اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے، ارادہ یہ تھا کہ کہیں موقع پا کر ان کا کام تمام کر دینگے تاکہ کسی اور مصیبت کا سامنا نہ ہو، ان میں سے ایک ایرانی تھا اور دوسرا بلوچ، ایرانی کو رستے میں بھوک لگی اس نے اپنی کمر سے روٹی کھولی اور کھانی شروع کی، اتّفاق سے ایک افغان اس کے پاس سے گزرا اُس نے افغان کو روٹی کھانے کی دعوت دی، چلتے چلتے افغان نے ایک نوالہ توڑ لیا اور پھر اپنے اونٹوں کو سنبھالنے میں مصروف ہو گیا، چونکہ دُھوپ نکل آئی تھی، اس لئے یہ قافلہ گودزرہ کے مقام پر ٹھہر گیا، ان بے آب وگیاہ صحراؤں میں دن کو سفر کرنا ناممکن ہے، اس لئے ہمیشہ رات کو سفر کرتے ہیں، قیام کے بعد ان دونوں قیدیوں کا سوال پیش ہوا، قرار پایا کہ اب یہ دونوں اپنی منزل سے بہت دُور آ گئے ہیں اور کسی طرح زندہ واپس نہیں پہنچ سکتے، ان کو افغانستان لے جانا بیکار ہے نیز خطرے سے بھی خالی نہیں اس لئے ان کو گولی سے اُڑا دینا چاہیے۔

ان سے کہا گیا کہ مرنے سے پہلے دُعا مانگ لو، ایرانی کو گولی کے نشانے پر کھڑا کر دیا گیا اور چند افغان بندوق داغنے کے لئے بالکل تیار کھڑے ہو گئے، اتنے میں وُہی افغان جس کو ایرانی نے روٹی کا ٹکڑا دیا تھا بھاگا ہوا آیا اور ایرانی کے آگے کھڑا ہو گیا، اس نے کہا کہ میں نے اس کا نمک کھایا ہے، اگر اس کو مارنے کا ارادہ ہے تو پہلے مجھ سے نبٹ لو، پھر اس سے بات کرنا، غرض لڑ جھگڑ کر اس افغان نے ایرانی کی جان بچالی، جب رات ہوئی اور قافلہ روانہ ہوا تو افغان نے ایرانی سے کہا پیارے اگر جان پیاری ہے تو یہ ستارہ سامنے ہے اس کی سیدھ میں روانہ ہو جا، رات رات میں سفر کر لینا ورنہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ اس بیابان میں دن کو زندہ رہنا ناممکن ہے، ایرانی نے کہا اگر بلوچ کو بھی میرے ساتھ کر دو تو بہت مہربانی ہو گی، مہربان افغان نے اس کی یہ آرزو بھی پوری کی، اور پانی کا ایک مشکیزہ بھی دیا، یہ دونوں تمام رات چلتے رہے، پانی ختم ہو گیا، ایرانی مسلسل سفر کی تھکان اور پیاس سے نیم جان ہو گیا تھا مگر بلوچ برابر سہارا دیتا اور ہمّت بندھاتا لئے جاتا تھا، آخر ایرانی بیہوش ہو کر گر گیا، جب ہوش آیا تو اس نے بلوچ سے کہا، بھائی تم جاؤ، دُھوپ تیز ہوتی جا رہی ہے، اگر چوکی تک سلامت پہنچ جاؤ تو میرے لئے پانی لے آنا، ورنہ میرا انجام میری حالت سے ظاہر ہے، بلوچ روانہ ہو گیا اور ایرانی ریت پر بیہوش ہو کر گر پڑا، جب سُورج کی گرمی اور زیادہ بڑھی

تو ایرانی کو ہوش آیا، گرتے پڑتے ایک خشک جھاڑی کے سایہ میں جاگرا، کبھی ہوش آجاتا کبھی بیہوش ہو جاتا، سوائے موت کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، اس بے بسی اور بے کسی کے عالم میں اس نے دیکھا جھاڑی سے دو گز کے فاصلے پر دو ہرن بیٹھے ہیں، اس کو فوراً خیال آیا کہ یہ ہرن کہیں نہ کہیں سے پانی ضرور پیتے ہونگے، وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ دونوں ہرن اپنی جگہ سے اُٹھے، یہ بھی ان کے پیچھے پیچھے گرتا گھسٹتا روانہ ہوا ہر دو چار قدم کے بعد ایرانی بیہوش ہو ہو جاتا تھا، جب اس کو ہوش آتا تھا تو ہرن اس سے دو گز کے فاصلے پر اس کے منتظر کھڑے نظر آتے تھے، یہ پھر ہمّت کر کے دو چار قدم چل لیتا تھا، غرض اس طرح صبح کے دس سے دن کا ایک بج گیا، ایرانی کی حالت یہ تھی کہ دو تین گز سے زیادہ فاصلے کی کوئی چیز اسے نظر نہ آتی تھی، ہر لحظہ ہمّت جواب دے رہی تھی، لیکن ہرن اسے کسی خاص مقام کی طرف لئے جا رہے تھے یکایک ہرنوں نے چونکڑی بھری، ایرانی بیہوش ہو گیا، بہت دیر کے بعد اسے ہوش آیا، کیا دیکھتا ہے بلوچ اس کے منہ میں پانی ٹپکا رہا ہے، ہوش و حواس درست ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ایک ایسے مقام کے قریب ہے جہاں جان بچانے کے لئے پانی موجود ہے۔

یہ واقعہ حیوانی ہمدردی کی غیر فانی مثال ہے اور ثابت کرتا ہے کہ حیوان بھی انسان کی طرح ہمدردی کا مادہ رکھتے ہیں، پالتو جانوروں کی ہمدردی کی مثالیں ایک نہیں سینکڑوں ملیں گی جن سے ثابت ہو گا

کہ جانور بھی اپنے آقا کے ساتھ محبت اور ہمدردی رکھنے میں کسی انسان سے پیچھے نہیں، جب آقا کو تکلیف ہوتی ہے ان کے پالتو حیوانات بےچین ہو جاتے ہیں، گویا ہمدردی کے برقی رَو ان کے دلوں کو اسی طرح متاثر کرتی ہے جس طرح انسان کے احساسات لطیفہ کو اکساتی ہے۔

ہمدردی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے

ہمدردی کم و بیش ہر انسان میں ہوتی ہے، لیکن کبھی کبھی ناماحول اور ناموافق واقعات ہمدردی کو خود غرضی میں تبدیل کر دیتے ہیں، خود غرض انسان سنگدل ہوتا ہے ایسے لوگوں کو اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ اگر ہم کسی کی ہمدردی کے محتاج ہوتے اور کوئی ہم سے ظاہری یا حقیقی ہمدردی کا اظہار نہ کرتا تو ہماری کیا حالت ہوتی، زمانے کے انقلابات پر نظر رکھنی چاہیئے، ہمیشہ کسی کے حالات ایکساں نہیں رہتے، کبھی مصیبت کے دن آتے ہیں کبھی آرام کے، تقدیر کسی کو بناتی اور کسی کو بگاڑتی ہے، زمانہ کبھی اُبھارتا اور کبھی گراتا ہے، غرض دُنیا میں کوئی چیز ایک حالت پر قائم نہیں رہتی، ایسے خیالات کو دل و دماغ میں جگہ دینے سے ہمدردی کی برقی رو انسان کے دل میں پیدا ہونے لگتی ہے۔

حیوانات بھی ہمدردی کے مستحق ہیں

بعض سنگدل فلاسفر جانوروں کو گھاس پھوس سے مثال دیتے ہیں، اس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ جانور کسی قسم کی ہمدردی کے مستحق نہیں، ہمارے نزدیک جانوروں کو گھاس پھوس کے برابر خیال کرنا سنگدلی اور ناانصافی ہے،

جانور بے زبان ہیں، جب انہیں تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کس مایوسی سے دیکھتے ہیں، گویا امداد کے طالب ہوتے ہیں، لیکن حضرت انسان ان کی ذرّہ بھر پروا نہیں کرتے، لدّو جانور پر اس قدر بوجھ لادیں گے کہ چیں بُلوا دیں گے، اگر کسی جانور کا گوشت لذیذ ہے تو اس کی نسل ہی ناپید کردیں گے، جب تک کوئی جانور کام دے رہا ہے اس کا آقا خوش ہے جونہی بیکار ہوا اس کو گولی سے اُڑا دیا یا قسائی کے حوالے کیا، بیشک انسان اشرف المخلوقات ہے اور اسے ہر چیز کو اپنے کام میں لانے کا زیادہ سے زیادہ حق ہے، لیکن خدا نے اسے اس لئے اشرف المخلوقات نہیں بنایا کہ وُہ اپنے سے ادنےٰ مخلوق کو بلاوجہ آزار پہنچائے، جانور ہماری خدمت کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، ان کی قدر کرنے کے علاوہ ہمیں ان کی بے زبانی اور بے بسی کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیئے ان پر بے جا اور بے ضرورت ظلم و ستم کرنا خلعت انسانیّت پر دھبّہ لگانا ہے وہ بھی ہماری طرح کی مخلوق ہیں! ان میں بھی جان ہے، تکلیف اور آرام کے احساسات سے وہ عاری نہیں، کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کہ ان کو لا انتہا ہی اذیت کے لئے وقف کر دیا جائے۔

متمدّن ممالک میں جہاں انسانوں کے علاج معالجے کے لئے خیراتی شفاخانے تعمیر کئے جاتے ہیں وہاں حیوانات کے ہسپتال بھی کھولے جاتے ہیں، ہمارے مُلک میں تقریباً ہر ضلعے اور تحصیل میں حیوانات

کے ہسپتال موجود ہیں، ان میں حیوانات کے دُکھ درد کا باقاعدہ علاج ہوتا ہے، اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں حکومت نے ہمدردیٔ حیوانات کے ادارے جاری کر رکھے ہیں، ان اداروں کے ملازمین لدو جانوروں کی نگرانی کرتے ہیں، اگر کوئی شخص کسی کمزور یا بیمار جانور سے کام لیتا ہے تو اس کو گرفتار کرلیا جاتا ہے، اگر کوئی جانور کی بساط سے زیادہ اس پر لادتا ہے تو اس کا بھی چالان ہوتا ہے، ہر قسم کی سواری کے لیے سواریوں کی تعداد مقرر ہے تاکہ جانور پر اس کی ہمّت سے زیادہ بار نہ پڑے، پھر بھی بہت سے شقی القلب لوگ جانوروں کو مار مار کر زخمی کر دیتے ہیں جن کو دیکھ کر ہمدردی کا جذبہ متاثر ہوتا ہے اور حضرت انسان کی سنگدلی پہ آنسو ٹپکاتا ہے۔

ہمدردی کی اہمیّت ہمدردی ایک ایسی شریف اور طبعی خصلت ہے جس کا تقاضا مصیبت زدہ انسانوں اور حیوانوں کی بغیر کسی لالچ کے مدد کرنا ہے، ہمدردی ایک ایسا دلکش نغمہ ہے جس سے غمزدہ دلوں کے رنج و غم میں تخفیف ہوتی، اور دنیا سے جہالت، ظلم اور تعدّی دُور ہوتی ہے، ہمدردی وہ زینہ ہے جس کے ذریعے بنی نوع انسان افلاس اور نکبت کی گہرائیوں سے نکل کر تہذیب و تمدّن کی معراج پر پہنچتے ہیں، ہمدردی افرادِ عالم میں یگانگت اور یک جہتی پیدا کرتی ہے، غرض ہمدردی شرطِ انسانیّت اور مہذب و متمدّن ہونے کی دلیل ہے۔

محبت

محبت کیا ہے؟ | محبت وہ پاکیزہ جذبہ ہے جس سے دُنیا کا نظام قائم ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ع

محبت نہ ہوتی تو دُنیا نہ ہوتی

محبت ایک رُوحانی رشتہ ہے جس میں تمام دُنیا منسلک ہے، وُہ افراد جو محبت کے سلسلۂ بے زنجیر کے اسیر ہیں چاہے دُور ہوں یا نزدیک ایک دوسرے کے قریب ہیں، محبت وہ حرارت ہے جو ہر قسم کی قربانی اور ایثار کے لیے آمادہ کرتی ہے، محبت وہ نظام ہے جس کی موجودگی میں باہمی نفاق اور فساد معدوم ہے۔

محبت وہ تعاون ہے جس کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان کی خوشی اور غم میں شریک ہے، ادنیٰ، اعلیٰ، مہذب، غیر مہذب، امیر، غریب انسان، حیوان سب کے خمیر میں محبت کی چاشنی ہے، قانونی بندشوں کا خیال دل کو تکلیف دیتا ہے، لیکن محبت کی بندشیں مسرت اور انبساط پیدا کرتی ہیں، محبت کی بدولت بہت سی تکلیفیں انسان خوشدلی سے برداشت کرتا ہے، وہ فرائض جن کی ادائیگی میں محبت کی کارفرمائی نہیں ہوتی اس پر شاق گزرتی ہیں، بغاوتیں، فسادات

اور لڑائی جھگڑے وہیں ہوتے ہیں جہاں محبّت کا عمل درآمد نہیں ہوتا، جہاں محبّت کی عملداری ہے وہاں عدل و انصاف کی عدالتیں قائم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ محبّت کا قیام نا انصافی اور ظلم و تعدّی کو رخنہ اندازی کا موقع ہی نہیں دیتا۔

محبّت کی کرشمہ سازیاں

محبّت وہ دلکش اور رُوح افزا نغمہ ہے جس کی الاپیں زمین اور آسمان کے درمیان ہر وقت گونجتی ہیں، محبّت وُہ نشہ ہے جس سے افراد عالم سرشار اور مست ہیں، اور شب و روز یگانگت کے رُوح پرور گیت گاتے ہیں اسی سے مردہ دلوں میں زندگی کے آثار نمایاں ہیں، سچ پُوچھو تو اسی سے دُنیا کا نظام قائم ہے، جہاں محبت نہیں حقیقت یہ ہے کہ وہاں کچھ بھی نہیں، محبّت ہی دُنیا اور عاقبت کا حاصل، اور محبّت ہی زندگی ہے، محبّت کے بغیر زندگی بے مزہ ہے، جس قوم میں محبّت کا فقدان ہے اس میں ترقی کے جوہر مفقود ہیں، جہاں محبّت نہیں وہاں آرام جان نہیں، محبّت کے بغیر دُنیا ایسی آرامگاہ ہے جس پر کانٹے بچھے ہوئے ہوں، بعض لوگ تو یہاں تک بڑھے ہیں کہ محبّت کو اپنا مذہب کہتے ہیں، اور بعض محبّت کو خُدا بتلاتے ہیں، اور اسے انسان ہی نہیں سمجھتے جو محبّت سے بے بہرہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں محبّت کا فقدان انسان کو درندہ بناتا اور انسانیّت کے درجہ سے گراتا ہے، گویا محبّت ہی انسانیّت ہے اور محبت ہی تمام فضائل انسانی کی تحصیل و تکمیل کا سرچشمہ۔

محبّت کا بھیانک پہلو | محبت ایک نہایت لطیف اور شریف جذبہ ہے،
اس کو ہوا و ہوس کا آلۂ کار بنانا کسی طرح محمود نہیں، محبّت سے رُوح
ترقی کرتی ہے، دماغ روشن اور دل کدورتوں سے پاک ہوتا ہے،
انسان مجاز سے حقیقت کی طرف بڑھتا ہے لیکن بعض ہوس پرست
اور خود غرض لوگ محبّت کے کچھ اور ہی معنے لیتے ہیں جس سے محبّت جیسا
پاکیزہ اور لطیف جذبہ نہایت بھیانک اور نفرت انگیز صُورت
اختیار کر لیتا ہے، غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی!

ان لوگوں کی بدولت سوسائٹی میں جہاں کہیں محبت کا نام آتا ہے
سُننے والوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں، اور چشم زدن میں ایک نہایت
بھیانک منظر آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے
کہ محبّت کا دعوے کر کے بعض حضرات ایسے مذموم افعال کے مرتکب
ہوئے ہیں جن کے اعادے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور ان
کو بیان کرنے کی شائستگی اجازت نہیں دیتی، وہ نام نہاد محبّت
کے دعویدار تو یہ کہہ کر ع

بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا

جو کرنا تھا وہ کر گزرے، لیکن محبّت کے دامن پر ایک ایسا بدنما دھبّہ
لگا گئے جو رہتی دُنیا تک محبّت کے نام سے افرادِ عالم کو بیزار رکھے گا،

اور شرم و حیا، عزت آبرو ہمیشہ خون کے آنسوؤں سے روئیں گی، پر وہ دھبہ دھوئے نہ دھلے گا، اور مٹائے نہ مٹے گا، ہماری شاعری کی بنیاد بھی کچھ ایسی ہی محبت پر قائم کی گئی ہے، چند شعرا کو چھوڑ کر ہر شاعر کا کلام ہوس پرستی کے جذبات سے معمور ہے، اور سوسائٹی کے اخلاق کو بگاڑ رہا ہے، مخرب الاخلاق ناولوں سے بھی ہزاروں خاندانوں کے دل داغدار ہیں اگر شعروں اور ناولوں کے ذریعہ سے محبت کا صحیح درس دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اولوالعزمی اور ترقی کے خیالات پیدا نہ ہوں۔

محبت فطری عطیہ ہے

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس سے خداوند کریم نے انسان اور حیوان کا خمیر اٹھایا ہے، اگر محبت فطری نہ ہوتی تو والدین چھوٹے چھوٹے بچوں کو تکلیفیں اٹھا کر نہ پالتے اور اولاد کی راحت کو اپنے آرام پر ترجیح نہ دیتے، مثل مشہور ہے سارا جوبن گھالے تو ایک بچہ پالے، بچوں میں اگر فطری محبت نہ ہوتی تو اپنے ماں باپ سے مانوس نہ ہوتے، اور اپنی زندگی ان کی خدمت کے لئے وقف نہ کرتے۔

محبت اگر طبعی نہ ہوتی تو سوسائٹی کا نظام درہم ہو جاتا کوئی ضرورت کے وقت کسی کے کام نہ آتا، گویا محبت کا نقدان قیامت کا منظر پیش کرتا۔

حیوانوں میں بھی محبت ہے

محبت سے محض مہذب اور غیر مہذب قومیں ہی بہرہ ور نہیں ہیں، درند اور پرند بھی محبت کے پاکیزہ جذبے سے سرفراز

ہیں، ہنس اپنے شریک زندگی سے جُدا ہونے کے بعد کھانا پینا ترک کر دیتا اور آخر کار محبّت کی بدولت اپنی جانِ عزیز جاں آفریں کے سپرد کر دیتا ہے پرندے اپنے بچّوں کو ناگہانی آفتوں سے بچانے کے لئے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں، اگر کسی جانور کا بچّہ ضائع ہو جاتے تو کئی کئی دن تک اس پر دیوانگی کا سا عالم طاری رہتا ہے، بس اسی یکجہتی اور ہمدردی کا نام محبّت ہے جو حیوانوں اور انسانوں کے دلوں میں یکساں کار فرما ہے۔

پالتو جانور اپنے آقا سے اپنی محبّت کا اظہار عجیب عجیب طریقوں سے کرتے ہیں، کُتّے کو دیکھو اپنے مالک کو دیکھ کر دُم ہلاتا ہے، اِدھر اُدھر بھاگتا ہے، اور پھر آکر آقا کے پاؤں پر سر رگڑتا ہے، محبّت کی حرارت اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور جسم میں عجیب قسم کی قوّت پیدا کر دیتی ہے، کیا مجال کہ مالک کو ذرا تکلیف پہنچے یا غیر شخص گھر کی چیز کو ہاتھ لگانے پائے، مالک کے اشاروں پر چلنا اور اس کی وفاداری میں جان تک قربان کر دینا اسی جانور کا کام ہے، گھوڑے کی محبّت بھی ضرب المثل ہے، اسی طرح اور پالتو جانور بھی محبّت میں کسی سے کم نہیں۔

خُدا کی قُدرت ہے کہ درندے بھی محبّت سے محروم نہیں وہ بھی اپنے آقا کے حکم کی تابعداری کرتے ہیں، شیر جیسا خونخوار درندہ انسان کا مطیع اور فرمانبردار بن جاتا ہے، یہ محبّت نہیں تو اور کیا ہے جو اسکی درندگی اور خونخواری کو اطاعت اور فرمانبرداری میں تبدیل کر دیتی ہے،

غرضمندی اور محبّت | بعض لوگوں سے خواہ مخواہ محبّت ہو جاتی ہے اور بعضوں سے آپ ہی آپ دشمنی اور بُغض لیکن پھر بھی گرد و پیش کے حالات محبت کی تربیت اور پرورش میں بڑی مدد دیتے ہیں، فطری طور پر انسان ہر اُس چیز سے محبّت کرنے پر مجبور ہے جو اسکی رُوحانی یا جسمانی ضرورتوں کو پُورا کرتی ہے یا کسی ضرورت کی تکمیل میں معاون ثابت ہوتی ہے، انسان کی یہی خودغرضی ہر اُس شخص سے مانوس کر دیتی ہے جو اس کی کسی غرض کو پُورا کرتا ہے یا اس کی کسی غرض کو حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے، برخلاف اس کے جو چیزیں انسان کی غرض پورا کرنے میں رُکاوٹ پیدا کرتی ہیں ان سے نفرت ہو جاتی ہے، بعض اوقات یہی نفرت بڑھتے بڑھتے دشمنی کی صورت اختیار کر لیتی ہے، بعینہ یہی حالت حیوانوں کی ہے، وہ بھی اپنے دوست اور دشمن کو پہچانتے ہیں اسلئے اپنے دوستوں سے محبّت اور دشمنوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

غرض پرستی اگرچہ محبّت کے بڑھنے اور گھٹنے میں بہت مدد دیتی ہے، لیکن ایسی محبّت جو اغراض پر مبنی ہو اس کو بے لوث یا بے غرض محبت نہیں کہا جا سکتا، محبّت جیسے پاکیزہ جذبے کو غرض سے آلودہ کرنا محبّت کی وقعت کم کر دیتا ہے، محبّت وہی مستحسن ہے جو بے غرض ہو، اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ محبّت کسی غرض سے پیدا ہوئی اور غرض پُوری ہونے کے بعد بھی باقی رہی، بعض اوقات یہ محبّت بھی وہی صورت اختیار کر لیتی ہے جو بے غرض محبّت سے مختص ہے، بہتر تو یہ ہے کہ

محبّت کو غرض کی آلائش سے پاک رکھا جائے، اگر ایسا ممکن نہ ہو تو دوسرے کی اغراض کا بھی اسی قدر خیال رکھنا چاہیئے جس قدر ذاتی اغراض کا، نیز محبّت میں ایسی اغراض کی تکمیل سے ہمیشہ گریز ہی کرنی چاہیئے جس سے دوسرے کو نقصان پہنچے اور اپنا فائدہ ہو، اس قسم کی محبت کو محبّت کہنا گناہ ہے، ایسا رویہ محبّت کو اس طرح فنا کر دیتا ہے جس طرح دُھوپ شبنم کو یا ہوا کا تیز جھونکا شمع کو۔

صحبت کا اثر | بعض اوقات محبّت ایک دم بھی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اکثر محبّت پاس رہنے سہنے اور اُٹھنے بیٹھنے سے ہوتی ہے، کسی حکیم کا قول ہے جو محبّت جلدی پیدا ہوتی ہے وہ جلدی فنا ہو جاتی ہے، جس محبّت کو پرورش پانے میں دیر لگتی ہے وہ عام طور پر دیرپا ہوتی ہے اور اس طرح رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے کہ اس کی بیخ کنی آسانی سے نہیں ہو سکتی، جو محبّت ایک دم پیدا ہوتی ہے معمولی معمولی باتیں اس کو توڑ ڈالتی ہیں، لیکن جو محبّت آہستہ آہستہ پرورش پاتی ہے اس میں بڑی ناگوار حرکات سے بھی انسان اس طرح درگذر کر جاتا ہے جس طرح کوئی معمولی سی بات ہوتی ہے، محبّت کا رشتہ اگرچہ نہایت ناپائیدار کہلاتا ہے، لیکن امتداد زمانہ اس کو بٹ دے دے کر اس قدر مضبوط بنا دیتا ہے کہ بڑی سے بڑی طاقت اس کو آسانی سے توڑ نہیں سکتی۔

شادی بیاہ کا پرانا طریقہ محبت بڑھاتا ہے۔

ہمارے اکثر نوجوانوں کو ہندوستان کے شادی بیاہ کے قدیمی طریقے ناپسند ہیں، وہ عموماً مغرب کے آزادانہ ازدواجی طریقے کی تعریف کرتے ہیں، جس کے ماتحت اپنی مرضی کے مطابق اپنے نصف احسن کا انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے، یورپ کی موجودہ حالت زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ وہ شادیاں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں جو فریقین کی ظاہری نمائش سے متاثر ہو کر کی جاتی ہیں اور وہ مراحل جو نئے جوڑے کو آہستہ آہستہ طے کرنے چاہئیں بہت جلد طے کر لئے جاتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شادی ہونے کے بعد فریقین ان مسرتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے جو سنجوگ کا لوازمہ کہلاتی ہیں، برخلاف اس کے وہ جوڑے جو آہستہ آہستہ گردو پیش کے حالات سے متاثر ہوتے ہوئے قدم قدم زندگی کے میدان میں بڑھتے ہیں ہمیشہ خوشدلی اور مسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں، امتداد ایام کے ساتھ ساتھ محبت ناہموار حالات کو ہموار کر دیتی ہے، ظاہر پرستی گھٹتی اور حقیقی محبت بڑھتی جاتی ہے آخر کار درگزر کرنے کی قوت اس درجہ پیدا ہو جاتی ہے کہ دو چقماق ٹکراتے ہیں، ان میں سے چنگاریاں نکلتی ہیں لیکن خرمن زندگی کے لئے وہ ضرر رساں ثابت نہیں ہوتیں۔

ہندوستانی طریقہ ازدواج میں سب سے بڑی قباحت

یہ نکالی جاتی ہے، کہ طرفین ایک دوسرے سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں حقیقتاً ناواقف ہونا اتنی بُری بات نہیں جتنی یہ بات قباحت کی ہے کہ طرفین ایک مرتبہ بھی شادی سے پہلے ایکدوسرے کو دیکھ نہیں سکتے، اگر یہ رسم اُٹھا دی جائے تو کوئی بُرائی نہیں، کیونکہ اسلامی شرع بھی اس کی اجازت دیتی ہے۔

محبّت میں اعتدال ضروری ہے، اس بات کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دُنیا کی ہر خوبی میں اعتدال کی حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے جادۂ اعتدال سے متجاوز ہونے سے افراط اور تفریط پیدا ہوتی ہے، افراط اور تفریط چاہے اچھائی میں ہو یا بُرائی میں کبھی اچھی نہیں کہلائی جاتی، یہی حالت محبّت کی ہے، اگر محبّت میں افراط پیدا ہو تو اس کو فلاسفہ عشق کہتے ہیں اور عشق ایک قسم کا دیوانہ پن ہے، برخلاف اس کے اگر محبّت تفریط کی طرف بڑھے تو دشمنی ہے، دشمنی بذاتِ خود مذموم ہے، اس لئے نہایت ضروری ہے کہ محبّت کو اعتدال کے راستے سے اِدھر اُدھر نہ ہونے دیا جائے تاکہ ذم کا پہلو پیدا نہ ہو۔

جو لوگ ازدیادِ محبّت سے ایک دوسرے کے ساتھ بہت زیادہ بے تکلف ہو جاتے ہیں، اکثر ان میں بدمزگی پیدا ہو کر محبّت نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے، کسی حکیم نے کہا ہے بے تکلفی محبّت کی دشمن ہے مولانا حالی فرماتے ہیں ؎

بڑھاؤ نہ آپس میں اُلفت زیادہ مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

ممکن ہو سکتا ہے یہ شعر مخصوص حالات میں غلط ثابت ہو لیکن مسلّمہ یہ ہے کہ زیادہ بے تکلّفی اور زیادہ محبّت انسان کو اندھا کر دیتی ہے اور وہ جوش محبّت میں بہت سے ایسے افعال کر گزرتا ہے جس پر بعد میں خود بخود ندامت ہوتی ہے۔ شارع اسلام کا قول ہے کہ آپس میں وقفہ سے ملو تاکہ محبّت بڑھے، اس مقولہ کی تفسیر یہ کہ زیادہ ملنے جلنے سے بے تکلّفی بڑھتی ہے اور بے تکلّفی میں بعض ایسی باتیں پیدا ہونے لگتی ہیں جن پر سنجیدگی خود شرمانی ہے، بہرحال محبّت کا رشتہ بہت نازک رشتہ ہے، اس کو قائم رکھنے کے لئے بہت زیادہ حزم و احتیاط کی ضرورت ہے تاکہ یہ نازک تعلق ہمیشہ قائم رہے اور اس کی بدولت پسندیدہ اور دلخوش کن نتائج برآمد ہوں۔

ورزش

ورزش کی اہمیّت اور ضرورت،

اعضائے رئیسہ اور جسم کو تندرست و توانا رکھنے کے لئے ورزش کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے غذا کی، لیکن عام طور پر ہم لوگوں میں ورزش کی اہمیّت کا پُورا پُورا احساس نہیں کیا جاتا، بچّے سمجھتے ہیں کہ کھیلنا کُودنا ورزش ہے، جوان خیال کرتے ہیں کہ روزانہ کا کام انجام دینا ورزش میں داخل ہے، رہے بُوڑھے وہ ورزش کو اپنے وقار ہی کے منافی سمجھ بیٹھے ہیں، یہ درست ہے کہ بچّوں کے لئے کھیلنا کُودنا ورزش ہے، لیکن یہ کھیلنا کُودنا اتنا ہونا چاہیئے کہ جسم میں چُستی اور طبیعت میں پُھرتی پیدا ہو جائے جوانوں کا یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ روزانہ کا کام کاج ہی ورزش ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جوانی میں بغیر ورزش کے کھایا پیا آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے اور طبیعت چُست و چالاک رہتی ہے ؎

ہم نے دیکھے ہیں نوجوانی میں
مَے رنگین کے لطف پانی میں

لیکن چند دن کے بعد خود بخود محسوس ہونے لگتا ہے کہ کام کرنے سے تھکان پیدا ہوتی ہے، بڑے بُوڑھوں کا یہ خیال کتنا عجیب ہے

کہ ورزش ان کے وقار کے خلاف ہے، ورزش تو تندرستی قائم رکھنے کا ایک طریقہ ہے، بچّہ بوڑھا جوان اس سے کوئی مستثنےٰ نہیں جب تک انسان زندہ ہے وہ مجبور ہے کہ کوئی نہ کوئی ورزش کرتا رہے تاکہ اس کا جسم توانا اور طبیعت ہشاش بشاش رہے، رنگ میں خون کی سُرخی جھلکے، کھانا ٹھیک ہضم ہو، بڑھاپے میں ہمّت جوان رہے، اور جوانی میں جوانمردی کے جوہر چمکتے رہیں، جو لوگ ورزش کرتے ہیں، وہ دوسروں سے الگ نظر آتے ہیں، رنگ کندن کی طرح چمکتا ہوا، جسم میں پھرتی، اعضا مضبوط، سینہ کشادہ، بھرے بھرے ڈنڑ، ہمّت اور شجاعت قدم قدم پر غمازی کرتی ہوئی، غرض ورزشی آدمی کسی طرح نہیں چھُپتا، ہر کس و ناکس کی نظر اسی پر پڑتی اور مُنہ سے بیساختہ تعریف نکلتی ہے، جو لوگ بچپن سے ورزش کرتے ہیں، اور جوانی کے زمانے میں بھی اس سے غافل نہیں رہتے، ورزش انہیں عصائے پیری کا کام دیتی ہے، وہ بیماریوں سے محفوظ رہتے اور نہایت آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں، ان کا بڑھاپا بیمار اور سُست نوجوانوں سے بدرجہا اچھّا گزرتا ہے، اگرچہ اعضا مضمحل ہو جاتے ہیں، لیکن وہ "یک پیری و صد عیب" کے مصداق نہیں بنتے، برخلاف اس کے غیر کسرتی نوجوان عین جوانی میں بُوڑھے، ڈھیلے ڈھالے، سُست اور کاہل نظر آتے ہیں، وہ ایسا محسوس کرتے ہیں گویا کبھی جوانی آئی ہی نہ تھی، جب تک صحت درست نہ ہو جینے میں کوئی لُطف

نہیں، اسی لئے کہتے ہیں تندرستی ہزار نعمت ہے۔

روحانیت اور جسمانیت زمانۂ حال کے اکثر مفکرین کہتے ہیں کہ روحانی ترقی کے لئے جسمانی صحت کی بے حد ضرورت ہے، ان کا خیال ہے کہ روح جیسی لطیف اور پاکیزہ چیز نحیف و نزار جسم میں نہ خوش رہ سکتی ہے نہ کسی طرح کی ترقی کر سکتی ہے۔

متقدمین کا نظریہ اس کے برعکس ہے یہ لوگ روحانی ترقی کے لئے اپنے جسم کو طرح طرح کے آزار پہنچاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جسم کو کمزور کئے بغیر روح کو طاقتور نہیں بنایا جا سکتا، موجودہ زمانہ کی تحقیقات کا لب لباب یہ ہے کہ روح اور جسم میں بہت قریب کا تعلق ہے۔ اگر بدن کو ذرا بھی تکلیف پہنچتی ہے تو روح کو سب سے پہلے اذیت ہوتی ہے، بلکہ روح اس قدر حساس ہے کہ وہ دوسرے کی تکلیف سے بھی متاثر ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں روح کے ذریعے ہم مدارج کمال تک پہنچتے ہیں، مدارج کمال تک پہنچنے کے لئے عقل سالم کی ضرورت ہے اور عقل سالم جسم سالم میں ہوتی ہے، جب تک جسمانی صحت درست نہ ہو روح اور عقل ٹھیک طرح کام نہیں کرتی، اس لئے ضروری ہے کہ انسان تندرستی کا خیال رکھے، تاکہ اعضائے رئیسہ اپنے فرائض کو صحیح طریقے سے انجام دیں۔

بعض لوگ ورزش پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے عقل کند ہو جاتی ہے، ان کا اعتراض کچھ نہ کچھ وقعت ضرور رکھتا ہے لیکن

اگر احتیاط سے ورزش کی جائے اور ورزش کے ساتھ قوائے عقلی کی بھی تربیت ہو تو خاطر خواہ نتائج مرتب ہو سکتے ہیں جو لوگ محض جسم کی پرورش کرتے ہیں اور قوائے عقلی کو حرکت نہیں دیتے، ان کی عقل آپ سے آپ خراب ہو جاتی ہے، چنانچہ پہلوانوں کو دیکھ لو وہ عقل کے بدھو ہوتے ہیں، لیکن جسمانی طاقت میں ہاتھی سے ٹکر کھاتے ہیں، اگر وہ اپنے قوائے عقلیہ سے کام لیں تو یقیناً وہ عام آدمیوں کی نسبت زیادہ دماغی کام کر سکتے ہیں۔

ورزش کی ایک حد چاہئے

ہمیشہ اپنی قوت برداشت اور ضرورت کے مطابق ورزش کرنی چاہئے، جو لوگ ضرورت سے زیادہ ورزش کرتے ہیں ان کی صحت پر ورزش کا اُلٹا اثر پڑتا ہے، گویا بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا ہے، انسان کا جسم ایک قدرتی مشین ہے تمام اعضا اور قویٰ اس مشین کے پُرزے ہیں، اگر کسی مشین کو بے احتیاطی سے چلایا جائے تو اس کے پُرزے خراب ہو کر وہ بہت جلد بیکار ہو جاتی ہے، جن لوگوں کو مشین سے سابقہ پڑتا ہے، انہیں اندازہ ہے کہ بے احتیاطی سے مشین کتنی جلد خراب ہو جاتی ہے، لیکن جو لوگ اپنی مشینوں کی پوری پوری نگہداشت کرتے ہیں وہ ان سے مدتوں کام لیتے ہیں، ہمارا فرض ہے کہ ہم جسمانی مشین کو نہایت احتیاط کے ساتھ استعمال کریں، اور معمولی سے معمولی خرابی کو بھی رخنہ اندازی کا موقع نہ دیں جس طرح مشین کو نہ چلانے سے پُرزے جم جاتے ہیں، اور پھر جب تک صفائی

نہ ہو چل نہیں سکتے، اسی طرح جسمانی مشین کو اگر بیکار چھوڑ دیا جائے، تو اس کے پرزے بھی کام کرنے سے جواب دے دیتے ہیں۔

ورزش کی مقدار کا تعیّن کرنا نہایت مشکل کام ہے چونکہ ہر شخص کی قوّت اور جسم کی ساخت علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے، اس لئے سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا کسی طرح درست نہیں، بعض لوگ ذرا سی ورزش سے تھک جاتے ہیں، بعض کی جسمانی ساخت زیادہ ورزش طلب کرتی ہے، اس لئے ورزش ہمیشہ اپنی قوّت اور ہمّت کے مطابق کرنی چاہیئے، صحت بحال رکھنے کے لئے اتنی ورزش کافی ہے کہ تمام اعضا کھل جائیں، اور ہلکی سی تھکان محسوس ہونے لگے، سانس جلدی جلدی آئے اور خون کا دَورہ تیز ہو کر جسم کی رگ رگ میں حرارت پیدا ہو جائے، ورزش کی تھکان سے دل و دماغ تازہ ہوتا ہے، بلغم جل جاتا ہے، اگر پسینہ لانے کی حد تک ورزش کی جائے تو مسامات بھی کھل جاتے ہیں، بدن میں ہلکاپن اور طبیعت میں جولانی پیدا ہوتی ہے اور خود بخود کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ہلکی اور بھاری ورزشیں ورزش کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک ہلکی قسم کی، دوسری سخت ورزشیں، ہلکی ورزشیں معمولی طاقت کے آدمیوں کے لئے مفید ہیں، ان ورزشوں سے عام صحت بحال رہ سکتی ہے، بھاری قسم کی ورزشیں ایسے لوگوں کے لئے ہیں جن کی جسمانی ساخت اور طاقت ہلکی ورزش سے اثر پذیر نہیں ہونے دیتی،

آج کل ہلکی ورزشوں کا زیادہ رواج ہے، اور سخت قسم کی ورزشوں کو بہت کم پسند کیا جاتا ہے، جس زمانے میں لوگ فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے اور معاشی کشاکش سے نچنت تھے بھاری ورزشوں کا عام طور پر چرچا تھا، اُس زمانے میں ورزش کو ایک فن کی حیثیّت حاصل تھی، پہلوانوں کی بڑی قدر تھی، روٗسا، نامی گرامی پہلوانوں کو دُور دُور سے بُلا کر ملازم رکھتے تھے، اب ایک تو روپے کی اتنی فراوانی نہیں رہی دوسرے نئی نئی دلچسپیاں اور اخراجات کی مدیں پیدا ہو گئی ہیں، اس لئے پہلوانوں کی سرپرستی کرنے والے اُمرا کی تعداد میں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے۔

مختلف قسم کی ورزشیں موجودہ زمانے میں جہاں اور علوم و فنون نے ترقی کی ہے، وہاں جسمانی ورزش کا فن بھی ترقی سے محروم نہیں رہا، ماہرین نے جسمانی سائنس کے اصولوں کے مطابق ہر عضو کی ورزش الگ الگ مقرر کی ہے، اس سے یہ فائدہ ہے کہ انسان کا جو عضو کمزور ہو اُس کی ورزش کی طرف خاص طور پر توجہ کی جا سکتی ہے، مثلاً ٹانگوں کی طاقت بڑھانے کے لئے دَوڑنا بھاگنا مفید ہے، ڈنٹر پیلنے سے بازو مضبوط اور سینہ کشادہ ہوتا ہے، مگدر ہلانے سے بھی یہی فائدہ ہے، گھوڑے کی سواری سے جسمانی اور دماغی دونوں طاقتیں نشوونما پاتی ہیں، غرض اس قسم کی سینکڑوں ورزشیں ہیں جو مختلف اعضا کی تیاری کے لئے مفید ہیں۔

ہوا خوری سب ورزشوں سے عمدہ ورزش ہوا خوری ہے، ہوا خوری ہر سن وسال کا آدمی کر سکتا ہے، یہ نہایت ہلکی قسم کی خوشگوار ورزش ہے، وہ لوگ جو ورزش کو اپنے وقار کے منافی خیال کرتے ہیں سیر کے ذریعے اپنی صحت بآسانی بحال رکھ سکتے ہیں، بیماروں اور کمزوروں کے لئے ہوا خوری نہایت مفید ہے، اس سے پھیپھڑوں میں تازہ ہوا داخل ہوتی ہے، اعضا کھلتے ہیں، کسل دور ہو کر طبیعت خوش ہوتی ہے، جسم میں چستی آتی ہے، مناظر قدرت دیکھ کر دل باغ باغ ہوتا ہے، طبعی مناظر سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے، غرض عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان اس ورزش سے اپنی جسمانی صحت قائم رکھ سکتے ہیں۔

نوجوان اگر ورزش کے ساتھ ہوا خوری کی عادت بھی ڈالیں تو سیر سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے، یہ اگرچہ ہلکی قسم کی ورزش لیکن رفتار اور فاصلے کو بڑھا کر اسے کسی حد تک سخت قسم کی ورزش بنایا جاسکتا ہے۔

ورزش کا وقت اور مقام ورزش کرنے کے لئے بہترین وقت صبح کا ہے، اس وقت ہوا صاف اور تازہ ہوتی ہے، رات بھر آرام کرنے کے بعد اعضا میں سستی پیدا ہو جاتی ہے، جب تک تمام اعضا کو حرکت دیکر خون کے دوران کو تیز نہ کیا جائے رات کی نیند کا خمار دور نہیں ہوتا، اگر ورزش کے ذریعہ خون کے دورے کو تیز کر دیا جائے تو بدن میں چستی اور طبیعت میں امنگ پیدا ہوتی ہے، اور آپ ہی آپ کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ورزش کے لئے ہمیشہ ایسا مقام مفید ہوتا ہے جہاں گردو غبار نہ ہو اور ہوا بالکل صاف ہو، باغ، جنگل یا دریا کا کنارہ اس کام کے لئے اچھے مقامات ہیں، اگر کسی بند کمرے میں یا تنگ و تاریک جگہ ورزش کی جائے تو طبیعت منغض ہو جاتی ہے، اور بجائے فائدے کے نقصان پہنچتا ہے، اس لئے ورزش کرنے کے لئے نہایت کشادہ صاف ستھرا اور ہوادار مقام تجویز کرنا چاہیے۔

دماغی اور جسمانی تربیت

آج کل عام طور پر اقوام عالم جسمانی انحطاط کی طرف مائل ہیں، اس لئے ورزش کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ رہی ہے، تمام مدرسوں اور کالجوں میں علمی اشغال کے ساتھ جسمانی صحت کو برقرار رکھنے کی طرف باقاعدہ توجہ کی جاتی ہے، عموماً ہر معقول درسگاہ ورزش کے معلموں کی خدمات حاصل کرتی ہے، تاکہ طلبا جسمانی صحت سے غافل نہ ہونے پائیں اور وہ تحصیل علم کی دھن میں اپنی صحت نہ کھو بیٹھیں، جو مدرسے اپنے طلبا کی جسمانی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ وہ ملک اور قوم کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں، ایسے مدرسوں کے طالبعلم سست اور بھدے ہوتے ہیں چاہے وہ ظاہرا طور پر کتنے ہی موٹے تازے نظر آئیں، لیکن طاقت ان میں برائے نام ہوتی ہے، ورزش نہ کرنے اور لگاتار پڑھنے سے ان کی آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں ہر وقت کتاب پر جھکے رہنے سے گردن اور سینہ آگے کو جھک جاتا ہے، یہ لوگ بوڑھے ہو کر آنکھوں سے معذور ہو جاتے ہیں، ورزش ایسے ہی

لوگوں کے لئے اعادۂ شباب کا بیش قیمت نسخہ ہے جو لوگ با قاعدہ ورزش کرنے کے عادی ہیں ان کی اولاد بھی تندرست رہتی اور عمر دراز پاتی ہے بلکہ ترقی کے میدان میں کاہل اور سست لوگوں کی اولاد سے ہمیشہ بازی لے جاتی ہے۔

ورزش کی عورتوں کو بھی ضرورت ہے

ہمارے ملک میں عورتوں کے لئے بہت پابندیاں ہیں، اس لئے عورتوں کو ورزش کا نام سُن کر شرم آتی ہے، حالانکہ عورتوں کے لئے مردوں کی نسبت زیادہ ورزش کی ضرورت ہے کیونکہ وہ شب و روز گھروں کی چاردیواری میں نظربند رہتی ہیں، باہر کی تازہ ہوا نہ کھانے سے ان کی صحت بہت جلد خراب ہو کر وہ اکثر سخت امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں، پردے کا رواج ترک کر دینے کے لئے سب سے بڑی یہی دلیل پیش کی جاتی ہے بہرحال اگر پردہ ترک نہ بھی کیا جائے تب بھی عورتوں میں نہایت ہلکی ہلکی ورزشوں کا رواج دینے کی بے حد ضرورت ہے، یورپ اور آزاد ممالک کی عورتیں ریاضت جسمانی کی دن بدن شوقین ہو رہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ تندرست و توانا اولاد کی مائیں بنتی ہیں، برخلاف اس کے ہمارے ملک کی عورتیں نہایت کمزور اور کم عمر کے بچے پیدا کرتی ہیں، یہ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ ماؤں کے دل اولاد کے صدموں سے ہمیشہ داغ داغ رہتے ہیں، نیز کمزور افراد طویل العمر نہ ہونے کے باعث لاتعداد بیوائیں اور یتیم چھوڑ کر عدم آباد کو آباد کرتے ہیں، اگرچہ لڑکیوں کے مدرسوں میں جسمانی تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، لیکن ضرورت اس بات کی

ہے کہ اس شوق کو مدّت العمر جاری رکھا جائے تاکہ تمام زندگی عیش و آرام سے گذرے، اور تندرست اولاد پیدا ہو۔

ورزش زندگی ہے

جو قومیں زندہ رہنا پسند کرتی ہیں اور اپنی زندگی سے دُنیا کو فائدہ پہنچانا چاہتی ہیں اُن کا فرض ہے کہ زندگی کے فرائض میں ریاضت جسمانی کو بھی شامل کریں، ورنہ جسمانی انحطاط آہستہ آہستہ ان کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیگا، جو اقوام جسمانی طاقت کھو بیٹھتی ہیں، وہ غلامی کی زندگی بسر کرتی ہیں، برخلاف اس کے وہ قومیں جن میں جسمانی قوّت ہوتی ہے کبھی کسی کی غلامی میں رہنا پسند نہیں کرتیں، وہ ہمیشہ حکومت کرتی اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی زندگی کا ثبوت دیتی ہیں، اگر ہمیں عزّت آبرو کی زندگی بسر کرنی منظور ہے تو ہمارا فرض ہونا چاہئے کہ ہم ورزش کی اہمیّت اور ضرورت کو محسوس تاکہ سستی اور کاہلی ہمارے قریب نہ پھٹکنے پائے، بیماریوں سے محفوظ رہیں، اپنی امداد آپ کریں، اور اپنی طاقت سے اوروں کو مدد دیں، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اب رستم و اسفندیار کا زمانہ نہیں رہا، آج کل علم کی قدر ہے لیکن اگر جسمانی طاقتیں جواب دیدینگی تو علم کس طرح حاصل ہوگا، اگر بالفرض حاصل بھی کرلیا تو اس پر عمل کرنے کے لئے ہمّت کہاں سے آئیگی، اِس لئے ضروری ہے کہ ریاضت جسمانی کو تحصیل علم کے برابر کا درجہ دیا جائے، تاکہ فرزندانِ مُلک صاحب علم بھی بنیں اور صاحب قلم بھی، کشاکش حیات کا مقابلہ بھی کرسکیں اور قوی تریں دشمن کا بھی۔

محنت

محنت زندگی کا ماحصل ہے | قُدرت بھی عجیب کرشمہ ساز ہے، اس نے دُنیا کو پیدا کیا اور اس میں انسان کے آرام اور آسائش کے تمام سامان مہیّا کر دیئے، لیکن اس نے یہ بات انسان کی عقل اور ہمّت پر چھوڑ دی کہ وہ اس کی نعمتوں سے اپنی ہمّت اور عقل کے مطابق استفادہ کرے، اس عمل کا نام جہد للبقار رکھ دیا، گویا اپنے انعامات کو استعمال میں لانے کا نام محنت قرار دیا، اب جتنی جس شخص میں ہمّت یا محنت کی قابلیّت ہے وہ اس کے مطابق دُنیاوی نعمتوںکے دسترخوان سے جو چاہے اُٹھالے، اسے کوئی اعتراض نہیں، ہاں بے ہمّت اور کام چور افراد کے لیئے اس کا خوانِ نعمت سمٹا ہوا ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے (اقبال)

محنت اور دولت | یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ محنت کے بغیر کوئی شخص ترقی نہیں کر سکتا، اگر کوئی محنت نہ کرے تو عقل و ذہانت سب دھری رہ جاتی ہیں، ہاں وہ لوگ جو محنت کے عادی ہیں ان نام نہاد عاقلوں سے ہمیشہ آگے بڑھ جاتے ہیں، جو محنت کی نسبت عقل

پر تکیہ کیئے بیٹھے رہتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل اور ذہانت
سے ترقی میں بہت مدد ملتی ہے لیکن جب تک ان پر محنت جلا نہ کی جائے
اس وقت تک یہ جوہر اجاگر نہیں ہوتے، اس لئے جن لوگوں کو
خداوند تعالےٰ نے یہ خوبیاں دی ہیں انہیں ان خوبیوں کو کام میں لاکر
اس کے انعامات سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کے لئے کوشش
کرنی چاہیئے، ورنہ کیا عجب ہے کہ ذہین اور عقیل اپنی عقل اور ذہن کے
بھروسہ پر خواب غفلت میں پڑے رہیں اور کُند ذہن مگر محنتی اپنی
محنت اور استقلال کی بدولت ان سے بازی لے جائیں، افسوس
ہے کہ ہم لوگ محنت کی نسبت دولت پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں،
دولت تو ایک آنی جانی چیز ہے اس پر اعتماد کرنا سخت غلطی ہے،
یہ درست ہے کہ دولت سے دُنیا میں بہت کچھ حاصل ہوسکتا ہے،
لیکن دیکھنا یہ چاہیئے کہ دولت کیونکر حاصل ہوتی ہے، ظاہر ہے
کہ دولت بغیر محنت کے حاصل نہیں ہوسکتی، اس لئے خُدا نے
دولت دی ہے تو اس کی مدد سے کوئی اعلےٰ ہُنر سیکھنے پر محنت
صرف کرنی چاہیئے کیونکہ دولت کو زوال ہوسکتا ہے لیکن ہُنر اور
علم زوال پذیر نہیں ہوسکتا، پس معلوم ہوا کہ اصل چیز محنت
ہے اور دولت اس کا ثمرہ۔

محنت امیر و غریب کے لئے یکساں ضروری ہے،

ہم جتنے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کا مطالعہ
کریں گے ہمیں ان کی ترقی اور عروج کی عمارتیں

ان کی محنت کی استوار بنیادوں پر متمکن نظر آئیں گی، برخلاف اس کے دولتمند خاندانوں میں اکثر خاک ہی اُڑتی دکھائی دیگی، اسلاف کے مقابلے میں اولاد بے ہمّت، عیش پرست اور پست خیالات کی مالک ہوگی، کیونکہ دولت کی فراوانی بیکار اور بے ہمّت بنا دیتی ہے، اور ان کے قواتے عقلی کام نہ کرنے کی وجہ سے بیکار ہو جاتے ہیں، یہ اثر ان تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ آیندہ نسلیں بھی اس بیکاری سے اثر پذیر ہوتی ہیں اور نتیجے کے طور پر اسلاف کی فارغ البالی سے ترقی معکوس کی بنیاد پڑ جاتی ہے، اسی طرح بہت سے ہنر پیشہ اور علمی، ادبی دولت سے مالا مال خاندان اکثر مزدور پیشہ خاندانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، ان کو دوبارہ اپنے بزرگوں کے معیار پر پہنچنے کے لئے کئی صدیوں کی محنت اور جانفشانی درکار ہوتی ہے، ان نتائج سے ظاہر ہے کہ محنت صرف غریب لوگوں ہی کے لئے ضروری نہیں، بلکہ جو لوگ دولتمند ہیں ان کو اپنا خاندانی وقار اور موجودہ حالت برقرار رکھنے کے لئے زیادہ محنت کی ضرورت ہے تاکہ جو کچھ ان کو ورثہ میں ملا ہے وہ قائم رہے اور وہ اپنے زور بازو سے مزید وقار اور اعتبار پیدا کریں۔

ناکامی کامیابی کی نشانی ہے

بعض لوگ محنت کے بعد ناکام ہونے سے محنت سے دل چُراتے اور مایوس ہو جاتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مایوسی بہت بڑا گناہ ہے، مایوسی انسان کی قوّتِ عمل کو فنا کر دیتی ہے

ناکامی سے بددل ہونے کی بجائے اسباب ناکامی پر غور کر کے ان کو دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے، اور پہلے سے زیادہ استقلال اور ہمّت کے ساتھ مطلب کو حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہونا چاہیئے کسی نے کیا خوب کہا ہے، ناکامی کامیابی کی نشانی ہے، ناکامیابی سے ہر مشکل مسئلے کو حل کرنے کی زیادہ استعداد پیدا ہوتی ہے اور ہمت بڑھتی ہے، کیونکہ انسان مسلسل کوشش کرنے کا عادی ہو جاتا ہے اور اپنی مشکلات کے ہر پہلو پر پہلے سے زیادہ عمدگی کے ساتھ غور و فکر کر سکتا ہے، جس سے اس کی مشکلیں آپ ہی آپ حل ہو جاتی ہیں۔

محنت کے حدود محنت ہمیشہ اتنی کرنی چاہیئے جس کا دماغ اور جسم متحمل ہو سکے، اگر کسی کام پر اتنی زیادہ محنت صرف کی جائے کہ صحت اور دماغ جواب دیں تو ایسی محنت سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے، محنت کرنے میں ہمیشہ یہ خیال رکھنا لازم ہے، کہ انسان اعتدال کی حد سے آگے نہ بڑھے، اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بعض لوگ انتہائی کوشش صرف کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنا مدعا حاصل کر لیتے ہیں، لیکن مسلسل اور غیر محدود محنت سے ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے، اس لئے وہ اس کے نتائج سے پورا پورا حظ نہیں اُٹھا سکتے۔

بعض طالب علم امتحان کے آخری دنوں میں دن رات کام میں لگے رہتے ہیں، اور کہا یہ جاتا ہے کہ وہ سخت محنت کر رہے ہیں، ایسی محنت نہ صرف صحت کے لئے بہت مضر ہے، بلکہ اکثر اس سے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد نہیں ہوتے، محنت کا قاعدہ یہ ہے کہ انسان شروع ہی سے ایک جیسی محنت کرے، جو لوگ اس اصول کے ماتحت، باقاعدہ محنت کرتے رہتے ہیں، ان کو اپنی کامیابی کا پورا یقین ہوتا ہے، اور امتحان کا قرب ان کو پریشان نہیں کرتا، آخری وقت میں محنت کرنے والوں کی نسبت باقاعدہ محنت کرنے والے زیادہ مستقل مزاج اور بشاش نظر آتے ہیں اور ان کو امتحان اتنا مشکل معلوم نہیں ہوتا جتنا بے قاعدہ محنت کرنے والے اور کام چور طلبا کو دکھائی دیتا ہے، یہی طالب علم ہیں جن کی محنت سے علم و ہنر ترقی پاتے ہیں، ان کی جدوجہد سے ملک کا اعزاز اور اقتدار بڑھتا ہے، اور وہ آسمان شہرت پر چاند اور ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔

بہتر صورت اور زیادہ محنت

محنت کی ضد کاہلی اور سستی ہے جو لوگ سست اور کاہل ہوتے ہیں وہ محنت نہیں کر سکتے، محنت نہ کر سکنا قوائے انسانی کی کمزوری کی دلیل ہے، جس شخص کا جسم کمزور ہوگا، ضروری ہے کہ اس کی عقل بھی کمزور ہو، اس لئے ہر وہ شخص جو محنت کر کے ترقی کرنی چاہتا ہے اس کو اپنے جسم کی نگہداشت کرنی چاہیے

انسان کے واسطے کاہلی اور سستی عیب ہو سکتی ہے لیکن محنت اس کے لیئے ہمیشہ باعث فخر ہے، کاہلی انسان کی صحت اور عقل کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح لوہے کو زنگ یا لکڑی کو گھن، اس کے علاوہ کاہلی سے ترقی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں، کاہل اور سست انسان کے دماغ میں اعلیٰ خیالات کی جگہ ذلیل اور پست خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں جو ان کی اعلیٰ صفات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں، کسی نے کیا خوب کہا ہے، جو لوگ ہر وقت کسی کام میں مصروف رہتے ہیں انکو شیطان بھی نہیں بہکا سکتا۔

محنت فطرت کا قانون ہے

جو لوگ محنت سے گریز کرتے ہیں آہستہ آہستہ ان کے اعضا اس قدر سست ہو جاتے ہیں کہ معمولی سے معمولی محنت طلب کام بھی ان پر گراں گزرتا ہے، دُنیا کی زیادہ سے زیادہ نعمتیں ان کو خوش نہیں کر سکتیں، ان کی زندگی باوجود فارغ البالی کے آرام سے نہیں گزرتی، بلکہ آئے دن وہ نئی نئی قسم کی رُوحانی اور جسمانی پریشانیوں اور مرضوں میں مبتلا رہتے ہیں، یہ ان کو اس بات کی سزا ملتی ہے کہ وہ فطرت کے قانون کے خلاف زندہ رہنا چاہتے ہیں، فطرت کا تقاضا تو یہ ہے محنت کرو، محنت کر کے کھاؤ اور محنت کر کے عزّت اور آرام پاؤ، اوّل خُدا بغیر محنت کے کچھ دیتا نہیں، اگر انقلابات ایّام اور حادثات زمانہ کسی کو بغیر محنت کے مالا مال کر دیتے ہیں، تو قدرت ایسی دولت کو

چند ہی دنوں میں ختم کروا دیتی ہے، اور اس قسم کے دولتمندوں کو دُنیا کے سامنے عبرت کا نمونہ بنا کر پیش کرتی ہے، وہ اقوام اور خاندان جو کبھی ہر قسم کی دولت سے مالامال تھے آج ان کی حالت دیکھو، جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس انحطاط کا مُوجب محض آرام طلبی اور سہل انگاری ہے۔

وہ لوگ جو قدرت کے گراں بہا عطیّوں سے فائدہ اُٹھاتے اور محنت کے اصولوں کو مدِّ نظر رکھ کر ہاتھ پاؤں بدستور مارتے رہتے ہیں، ان کی دولت میں افزونی ہوتی ہے، ہر مشکل مہم پر قدرت موافق اسباب پیدا کر کے ان کی مدد کرتی ہے، ان کے بعد اگر ان کے جانشین محنت سے دل چُراتے اور باپ دادا کی امارت پر بھروسہ کرتے ہیں تو موافق اسباب مخالف بن جاتے ہیں، اسی لئے کہتے ہیں کہ دولت آنی جانی ہے، اسے ہاتھ کا میل سمجھنا اور اپنی قوّتوں اور قابلیتّوں پر بھروسہ کرنا چاہیے کیونکہ فطرت اور قدرت اسی کا ساتھ دیتی ہے جو محنت کرتا اور اپنی محنت پر اعتماد رکھتا ہے۔

جو لوگ اپنی ہمّت اور محنت پر تکیہ رکھتے ہیں اُن کو کسی حال میں بھی تکلیف نہیں ہوتی، انقلاباتِ ایّام ان کی دولت چھین لیں انہیں کوئی غم نہیں، گردشِ زمانہ انہیں تخت سے تختہ کر دے انہیں کوئی فکر نہیں، فکر تو جب ہو جب کوئی ان کا علم و ہُنر چھین لے، جہاں بھی جائیں گے، جس حال میں بھی ہوں گے ان کی ہمّت اور ہُنر ان کے

ساتھ ہے، جب تک محنت پسند فطرت ان کی دستگیر ہے، انہیں کیا غم ہے، دولت اور عزت ہر حال میں ان کے قدم لے گی اور ان کا وجود ہر جگہ تعظیم و تکریم کا مرجع ہوگا۔

محنت کرو، محنت کرو | غرض محنت انسان کی زندگی کا اصل اصول ہے، محنت خدا کو مرغوب ہے، محنت سے دُنیا کے ہر شعبے میں ترقی ہوتی ہے، محنت سے اقوام بنتی اور اس کے فقدان سے بگڑتی ہیں، محنت سے قُدرت کے مخفی خزانوں کا پتہ چلتا ہے، محنت سے تحقیق و تفتیش ہوتی ہے، محنت سے حکومت، عزت اور دولت ملتی ہے، اور محنت سے انسان انسانِ کامل بنتا اور اشرف المخلوقات کہلانے کا حقدار ہوتا ہے، جو لوگ محنت سے جی چراتے ہیں، وہ محض اپنے آپ ہی کو نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ اپنی سُستی اور کاہلی سے وہ تمام دنیا کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا کر مقصد تخلیقِ عالم پر ضرب کاری لگاتے ہیں۔

اِستقلال

کسی کام کے کرنے میں متواتر اور مسلسل کوشش کرنے کا نام استقلال ہے، دُنیا کا کوئی کام اچھا ہو یا بُرا بغیر کوشش کے نہیں ہوتا، اگر تاریخِ انسانی پر نظر ڈالیں تو ہر جگہ ہمّت اور استقلال کی کامیاب مثالیں بکثرت ملیں گی، جس شخص میں استقلال نہیں ہوتا وہ کوئی ایک کام بھی کامیابی کے ساتھ نہیں کر سکتا، مثل مشہور ہے کہ مشاہیر ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئے، ہماری طرح وہ بھی معمولی انسان تھے، جس چیز نے ان کو دُنیا میں کامیاب بنایا وہ ان کی ہمّت اور استقلال ہے، ان جیسا دل و دماغ ہمارے پاس بھی موجود ہے لیکن ہم ان سے پُورا فائدہ نہیں اُٹھاتے، ہمارے پست ارادے تذبذب اور بد دلی ہمیں کامیابی کی سعادت حاصل کرنے نہیں دیتی، ورنہ دُنیا میں کونسا ایسا کام ہے جو نہیں ہو سکتا ہمّت اور استقلال شرط ہے۔

استقلال کم و بیش ہر شخص میں فطرتاً موجود ہے، اور اگر انسان میں استقلال نہ ہوتا تو دُنیا میں ترقی کرنا یا کوئی کام سیکھنا یا کرنا بالکل محال ہو جاتا، حقیقت امر یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ارادوں کی دل و جان سے پیروی کرتا ہے اور کوئی اپنے کسی

ایک ارادے پر بھی مستحکم نہیں رہتا، معمولی سے تغیرات اس کے ارادے اور طبیعت کو متزلزل کر دیتے ہیں، بس یہی وہ لوگ ہیں (جو غیر مستقل مزاج ہیں اگر یہ غیر مستقل مزاجی زیادہ بڑھ جائے تو ان لوگوں کو ہم پاگل اور دیوانہ کہنے لگتے ہیں، یہ پاگل یا غیر مستقل مزاج لوگ ابھی ایک چیز پوری طرح حاصل نہیں کرنے پاتے کہ کوئی اور چیز ان کی توجہ جذب کر لیتی ہے اسی طرح ان کے ارادے ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں جو چیز ان کو نظر آتی ہے وہ اس کی طرف فوراً متوجہ ہو جاتے اور پہلی چیز کو بھول جاتے ہیں پس ثابت ہوا کہ استقلال عاقل و بالغ ہونے کی نشانی اور غیر مستقل مزاجی پاگل پن کی دلیل ہے۔)

دُنیا بھی کچھ عجیب کارگاہ ہے، اس میں رہنے والوں کو کسی پہلو چین نہیں، اگر یہ لوگ ایک طرف اس شخص کو دیوانہ کہتے ہیں جس کے خیالات اور افعال میں استقلال نہیں ہوتا تو دوسری طرف ان لوگوں کو پاگل اور سڑی کہنے میں دریغ نہیں کرتے جو اپنے ارادوں میں سخت چٹانوں اور سنگین پہاڑوں سے ٹکر کھاتے ہیں، ان کی جان جاتی ہے مگر بات نہیں جاتی، قسم قسم کی مخالفتیں، بات بات پر آویزشیں جانی اور مالی نقصانات ان کو اپنے ارادوں کے پورا کرنے سے باز نہیں رکھتے، جب وقت گزر جاتا ہے اور استقلال ان کے سروں پر کامیابی کا سہرا باندھتا ہے تو یہی لوگ ان کو پُر استقلال اور باعظمت

شخصیّت قرار دیتے ہیں۔

(ایسے لوگ جو اپنے استقلال کی وجہ سے دیوانے اور پاگل کہلاتے ہیں، ہمارے ملک میں بکثرت ہیں، کسی کو مذہبی دیوانہ کہا جاتا ہے، کوئی سیاسی پاگل کہلاتا ہے، کسی پر سرکار پرست کا فقرہ کسا جاتا ہے، اور کوئی بیوقوف کا لقب پاتا ہے، کسی پر غدّاری کا الزام اور کفر کا فتویٰ لگتا ہے، غرض جیتے جی ان مستقل مزاج لوگوں پر گالیوں کی بھرمار اور اعتراضات کی بوچھاڑ رہتی ہے، لیکن مرنے کے بعد جب ان کے کارناموں کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے تو ان پر ارادت اور عقیدت کے پھول برسائے جاتے ہیں۔)

۲ ناکامیاں استقلال سکھاتی ہیں (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پے در پے ناکامیاں پیش آنے سے استقلال کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، ہمّت پست ہو جاتی ہے، مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے، ہم کہتے ہیں، یہ سب کچھ صحیح نہیں ہے لیکن ناکامیابی ہی کامیابی کی دلیل ہے، یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ انسان جو کام کرے اس میں پہلی مرتبہ ہی کامیاب ہو جائے، ممکن ہے کبھی ایسا بھی ہو، لیکن ہر مرتبہ ویسے کامیاب ہونے کی امید نہیں ہو سکتی اسی طرح ہر بار ناکامیاب ہونے کی توقع بھی نہیں ہونی چاہیئے، نپولین اعظم کہا کرتا تھا دُنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں، کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ناکامیابی ہماری ہمّت شکنی کرے جس کام کو ہم کرتے ہیں ان میں ناکامیابی سب سے پہلے اور کامیابی

سب سے پیچھے ہے۔ اگر ہمیں قطب مینار کی چوٹی پر پہنچنا ہے تو ہم بغیر بیچ کی منزلیں طے کئے سب سے اُوپر کی منزل پر نہیں پہنچ سکتے ہم کو بتدریج ایک ایک سیڑھی کر کے اُوپر چڑھنا پڑے گا، آخری منزل پر پہنچنے تک کبھی ہمارا سانس پھُولے گا، کبھی ہم تھک جائینگے کہیں ہمیں دم لینا پڑے گا، غرض ہم بہزار دقّت منزل مقصود پر پہنچیں گے، بس یہی دِقّتیں ناکامیابیاں ہیں جو ہماری ترقّی کے راستوں میں حائل ہیں، انہیں عبور کرنے کے لئے ہمیں ہمّت اور استقلال کی ضرورت ہے، اگر یہ رُکاوٹیں بیچ میں حائل نہ ہوتیں تو بامِ مُراد تک پہنچنا کسی کے لئے بھی دُشوار نہ ہوتا، ظاہر ہے ایسا ہونے سے زندگی میں کچھ بھی لطف نہ رہتا، ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خالقِ مطلق نے دُنیا میں ہر چیز ممکن بنائی ہے، اور اس کے اسباب فراہم کرنے کا کام ہماری ہمّت پر چھوڑا ہے، گویا ہمارے سامنے ایک بہت ہی وسیع دسترخوان بچھا دیا ہے جس میں جتنی ہمّت ہے اتنا اُٹھا لے اور اپنی ضرورتوں کو پُورا کر لے، جن لوگوں میں ہمّت نہیں وہ بیٹھے مُنہ دیکھا کریں یا اپنے آپ کو ناکامیاب اور نامراد کہا کریں، اور اپنی ناکامیابی کو تقدیر اور منشائے خداوندی پر محمول کرتے رہیں۔

استقلال کامیابی کی نشانی ہے

مستقل مزاج شخص اپنی ناکامی سے بددل نہیں ہوتا، بلکہ ناکامی سے اس کی واقفیت اور تجربے میں اور زیادہ

اضافہ ہوتا ہے)، ناگوار اور دقّت طلب امور کو سلجھا کر اس کے دل کو بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے، (جوں جوں مشکلیں حل ہوتی ہیں اس کی ہمّت بڑھتی جاتی ہے، وہ اپنے مقصد کی دُھن میں شب و روز منہمک رہتا ہے، دیوانی دُنیا اس کو دیوانہ کہتی ہے، لیکن وُہ کسی کی پروا نہیں کرتا، نا امیدی کبھی اُس کے پاس پھٹکنے نہیں پاتی، یہاں تک کہ ایک دن وہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے،) (دُنیا میں جس قدر بڑی بڑی ایجادیں اور حیرت انگیز اختراعیں ہُوئی ہیں وہ محض استقلال کا نتیجہ ہیں، برسوں ناکامیاں ہمّت شکنی کے درپے رہی ہیں، لیکن ان ہمّت والوں نے کبھی اپنا ارادہ تبدیل نہیں کیا جس کام کی لو انہیں لگ گئی تھی آخر اسے ایک دن پُورا کر کے چھوڑا۔)

(دُنیا کا کوئی کام ایسا نہیں جس میں استقلال کی ضرورت نہ ہو،) جتنے پیشے اور کسب ہیں سب میں ترقی استقلال سے اور تنزل بے ہمتی سے ہوتا ہے، خدا کسی کی محنت رائگاں نہیں جانے دیتا، ہاں جلد بازی سے اکثر کاموں کے نتیجے ضرور خراب ہو جاتے ہیں کسی کام کا ارادہ کرنے سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ اس کی اُونچ نیچ اور بھلائی بُرائی پر اچھی طرح غور کر لیا جائے پھر مقصد کی تلاش میں صحیح راستہ پر نہایت استقلال سے چلا جائے۔

استقلال غریب کی جان ہے (غریبوں اور مفلسوں کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، ان کی ہمّت ٹوٹنے کے نت نئے اسباب پیدا

ہوتے رہتے ہیں، لیکن استقلال کی بدولت وہ کشادہ پیشانی سے مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں اور مصیبتوں کے منجدھار میں سے ایک ہوشیار تیراک کی طرح بچ کر نکل جاتے ہیں، غریب میں اگر استقلال نہ ہو تو اس کو ایک ایک سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے، استقلال غریب اور مسکین مخلوق کی مخصوص دولت ہے، مصائب اور رکاوٹیں اسکی ہمّت بندھاتی ہیں، نہیں! ان کی ہمّت کو بلند کرتی ہیں، استقلال کی بدولت مشکلات کو برداشت کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے اور سخت سے سخت کام آسان معلوم ہوتا ہے ؂

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں (غالبؔ)

محنت، دیانتداری، خودداری اور قناعت کا نام ایسے ہی لوگوں کی ہمّت سے باقی ہے، بلکہ یوں کہنا بجا ہے کہ استقلال انکو بُری باتوں سے بچاتا اور آزمائش کے وقت ان کے کیریکٹر اور چال چلن کو اور زیادہ چمکاتا ہے، کندن کی طرح وہ جتنی زیادہ مرتبہ بھٹی میں تپتے ہیں اتنے ہی زیادہ چمکتے دمکتے نکلتے ہیں۔

استقلال کیونکر پیدا ہو سکتا ہے | استقلال پیدا کرنے کے لئے عزم بالجزم کی اشد ضرورت ہے، جو شخص ارادے کا مضبوط نہیں وہ استقلال سے معرّا ہو گا، ارادے میں پختگی پیدا کرنے کے لئے عقل سالم کی ضرورت ہے تاکہ بُرے اور بھلے میں تمیز ہو سکے، اگر بے عقل آدمی کسی غلط بات

پر اڑ جاتے تو اس کو بیوقوف کہا جاتا ہے، چونکہ تعلیم عقل انسانی پر جلا کرتی ہے اس لئے صحیح النظر بننے کے لئے تعلیم و تجربہ لازم ہے، اس کے بعد استقلال درکار ہے کہ اپنے نکالے ہوئے نتیجے اور کئے ہوئے ارادے کی مستقل مزاجی سے پیروی کر سکے، جن لوگوں کا ارادہ ضعیف ہوتا ہے وہ واقعات اور حالات کی رو میں تنکوں کی طرح بہہ جاتے ہیں، ہر وہ شخص جو ان کے سامنے ذرا سی چرب زبانی اور استقلال سے تقریر کرتا ہے، ان کو اپنا ہم خیال بنا لیتا ہے، اگر کوئی اس سے زیادہ ہوشیار آدمی آجاتا ہے تو وہ اسی کے پیچھے لگ جاتے ہیں، گویا غیر مستقل مزاج لوگ ہمیشہ دوسروں کی رائے کے تابع رہتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کی بدولت ملکوں میں فسادات اور انقلابات رونما ہوتے ہیں۔

استقلال ہندوستانی عورت سے سیکھو

غالباً یہ بات دلچسپی کا موجب ہوگی کہ ہمارے ملک کی عورتوں میں استقلال اور برداشت کی قوت بہت زیادہ ہے، اس کے دو وجوہ ہیں، اول تو لڑکیاں بُردباری اور استقلال میں اپنی ماؤں کا چربہ ہوتی ہیں، دوسرے رخصت کرتے وقت والدین صاف الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ بیٹی ہم نے تجھے اپنی سمجھ کے مطابق اچھے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا، اب تیری قسمت رہی اچھا نکلے یا بُرا ثابت ہو تیرا فرض ہے کہ تو مرتے دم تک اس کا ساتھ دے، ہندوستانی عورت کے بھی

کیا کہنے ہیں، مرے گی بھرے گی، دُکھ اُٹھائے گی تکلیفیں سہیگی، لیکن اپنے ماں باپ کی لاج رکھے گی، جس گھر میں گئی ہے اُس سے مرکر ہی نکلے گی، یہی سبب ہے کہ عورت کے استقلال سے بہتر مثال ہندوستانی سوسائٹی میں نہیں مل سکتی۔

پُر استقلال عورتوں کی تربیت بچّوں میں استقلال کی قوّت پیدا کرتی ہے، اور اپنی نہج کی زندگی سے عزم و استقلال کا سبق دیتی ہے ماہرین تعلیم کا متفقّہ فیصلہ ہے کہ مردوں کی نسبت عورتوں کی تربیت کا اثر بچوں کی طبیعت پر زیادہ بہتر ہوتا ہے، اس لئے اگر بچّوں کی ابتدائی تعلیم کلیتاً عورتوں کے سپرد کر دی جائے، تو ان کی تربیت اور پُر استقلال طبیعتوں سے نئی نسلوں پر نہایت خوشگوار اثر پڑ سکتا ہے۔

استقلال کا صحیح استعمال استقلال کو ہمیشہ نیک ارادوں میں استعمال کرنا چاہیئے، جن لوگوں میں استقلال ہوتا ہے مگر تربیت صحیح نہیں ہوتی ان کا استقلال بجائے فائدے کے سوسائٹی کو نقصان پہنچاتا ہے، مثال کے طور پر چوروں اور بدمعاشوں کو دیکھو، ان کے بُرے اور ضرر رساں ارادوں میں اس قدر استقلال ہوتا ہے کہ سخت سے سخت سزائیں عرصہ ہائے دراز کی بامشقّت قیدیں ان کو چوری چکاری اور ارتکاب جرائم سے نہیں روک سکتیں، ہر مرتبہ جب وہ جیل سے سزائیں بھگت کر نکلتے ہیں زیادہ ہوشیاری کے ساتھ

جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، پھر پکڑے جاتے ہیں اور پہلے سے بھی زیادہ سخت سزائیں پاتے ہیں، لیکن پھر بھی باز نہیں آتے یہ استقلال نہیں تو کیا ہے، جو ان کو اپنے ارادوں پر ہمیشہ قائم رکھتا ہے۔

استقلال کیوں چاہیئے؟ استقلال ایک نہایت محمود صفت ہے یہ ہر عاقل و بالغ انسان میں ہونا چاہیئے، دُنیا میں کوئی کام بھی بغیر استقلال کے نہیں ہو سکتا پھر بڑے کام تو بڑے ہی ہیں ان کے لئے تو اور بھی زیادہ استقلال اور استقامت کی ضرورت ہے، مستقل مزاج اور پُر استقلال لوگ ہی دُنیا کے رہنما، سوسائٹی کے مصلح اور فخر ملک و ملّت ہوتے ہیں، استقلال سے مصائب کا مقابلہ ہو سکتا ہے، استقلال سے نئی نئی ایجادیں ہوتی ہیں، استقلال سے اپنے مُلک کو حملہ آوروں اور غنیموں کی دست برد سے بچایا جا سکتا ہے، اور استقلال ہی کی بدولت انسان کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے، اس لئے ہمیں اپنی طبیعتوں میں استقلال پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے تاکہ ہم اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں اور ایسی بامراد زندگی بسر کریں، جو آیندہ نسلوں کے سامنے مثال کے طور پر پیش کی جا سکے۔

خودداری

خودداری؟ | خودداری ایک شریف صفت ہے جو بہت سی صفات حسنہ کا مجموعہ ہے، انگریزی میں اس کے مفہوم کو سیلف ریسپکٹ کے لفظ سے ادا کرتے ہیں جس کے لفظی معنی ہیں اپنی عزّت کی آپ نگہداشت کرنا یعنی ایسے افعال سے گریز کرنا جن سے اپنی عزّت میں فرق آجائے۔

خودداری کا تجزیہ | اگر ہم "خودداری" کا تجزیہ کردیں تو اس کی وسعت کا اندازہ بخوبی ہو جائیگا، بلند نظری، شجاعت، سخاوت، رحمدلی، ہمدردی، دیانتداری، صبر استقلال، عدالت، پرہیزگاری وغیرہ تمام صفات حسنہ خودداری میں شامل ہیں، بعض کا خیال ہے کہ یہ صفات خودداری کی نشو و نما کا باعث ہیں، اور بعض کہتے ہیں خودداری کی بدولت یہ صفات شاخ در شاخ پھیلی ہیں، گویا خودداری کو اگر ایک تناور درخت تصوّر کرلیا جائے تو یہ صفات اس کے پھل پھول اور پتّوں کی مثل ہیں، چاہے کوئی اپنی پسند کے مطابق ان سے گلدستہ تیار کرلے یا کسی پھول یا غنچہ ناشگفتہ کو طرّہ بنا کر اپنی شان و شوکت میں اضافہ کرے، لیکن اس عمل سے خودداری کے درخت کی قدر و وقعت

ہیں کسی قسم کا نقصان واقع نہیں ہوتا، بلکہ اس کی خوشبو اور مہک
دُور دُور پھیلتی ہے، جو لوگ اس خیال کے مدعی ہیں کہ خودداری متعدد
صفات حسنہ سے مل کر پیدا ہوتی ہے، وہ قانون فطرت کے خلاف
دعوے کرتے ہیں، کیونکہ قدرت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ایک چیز سے
بہت سی صفات کی مختلف چیزیں پیدا کرتی ہے، بہت سی چیزوں کو
ملا کر ایک چیز پیدا نہیں کرتی، اس لئے یہ کہنا زیادہ انسب ہے
کہ خودداری ایک نہایت شریف وصف ہے، اور مختلف صفات
حسنہ جو انسانوں کو حیوانات سے میز کرتی ہیں اس کی مختلف شاخیں
اور پھول پھل پتے وغیرہ ہیں جن کی مہک سے سارا زمانہ معطر ہے۔

خودداری کا پہلا سبق | خودداری کا سب سے پہلا سبق یہ ہے کہ اپنی عزت
آپ کرو، جو لوگ اپنی عزت آپ نہیں کرتے اور لوگ بھی ان کی عزت نہیں
کرتے، وہ لوگ جو خودداری کی صفت سے موصوف ہوتے ہیں اپنے
حلقہ اثر میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں، یہی
وہ لوگ ہیں جو ترقی کے مدارج نہایت آسانی اور عمدگی سے طے کرتے چلے
جاتے ہیں، برخلاف اس کے جن لوگوں میں خودداری کا مادہ نہیں ہوتا نہ تو
وہ خود ترقی کرتے ہیں اور نہ ان لوگوں کو ترقی کرنے دیتے ہیں جن سے ان کا
بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق ہوتا ہے، ان کی بدولت سوسائٹی کی حالت
دن بدن پست اور ذلیل ہوتی چلی جاتی ہے ؎

چو از قومے یکے بیدانشی کرد   نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

خوددار انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنی عزّت آپ کرے، بالفاظ دیگر اوروں کو اس بات پر بلاواسطہ مجبور کرے کہ وہ بھی اس کی عزّت کا خیال رکھیں، پس خوددار انسان جہاں اپنے احترام کا خیال رکھ کر اوروں کا ادب کرتا ہے اور اس کے بدلے میں اپنی عزّت کراتا ہے وہاں وہ یہ بھی سبق دیتا ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو ذلیل و حقیر سمجھتا ہے، وہ دوسروں سے اپنی عزّت کرانے کا طلبگار نہیں ہو سکتا۔

عزّت آبرو کی زندگی بسر کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ پہلے اپنے مرتبہ کا خیال رکھا جائے، اس کے بعد دوسروں کا احترام کرنے میں تساہل نہ ہو، نیز ہر ایسے فعل سے اجتناب کیا جائے جس سے دوسروں کی نظروں میں ذلیل ہونا پڑے، خوددار انسان ان احتیاطوں کے ساتھ ساتھ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ان کی عزّت و وقعت اپنی نگاہوں میں کم ہو جائے، اگر کوئی شخص کشتی میں ذرا سا سوراخ کر دے تو اس کی معمولی سی غلطی سے کشتی میں پانی بھر آئیگا، اور تمام سواریوں کی جان خطرے میں پڑ جائے گی، بعینہٖ یہی کیفیّت ان لوگوں کی ہے جو خودداری کی پاسداری نہیں کرتے اور اپنی معمولی سی بے احتیاطیوں سے اوروں کو بھی قعر ذلت میں ڈبو دیتے ہیں۔

جھوٹی خودداری | آج کل ترقی کا زمانہ ہے، ہر طرف مصنوعات کی بھرمار ہے،

آج ایک چیز اصلی تیار ہوتی ہے۔ دوسرے دن اس قسم کی سینکڑوں چیزیں مصنوعی تیار ہو جاتی ہیں، گویا اصل اور نقل میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ چیزیں تو چیزیں آدمی بھی مصنوعی بن جاتے ہیں اور ان میں مصنوعی صفات بھی پیدا کر دی جاتی ہیں۔ جس طرح دنیا کی کوئی چیز تصنّع سے خالی نہیں رہی اسی طرح خودداری بھی صنّاعی کی دست برد سے نہیں بچی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ خودداری مصنوعی بھی اچھی ہے لیکن اگر اسکے چہرے سے تصنّع کا پردہ اُٹھا دیا جائے تو اصلی جوہر نظر آجاتے ہیں۔ موجودہ تہذیب کی برکت سے آج کل ہر مقام پر بلکہ ہر قدم پر لاتعداد نام نہاد خوددار نظر آتے ہیں، اگر ان کے اندرونی حالات کو دیکھنے کا موقع ملے تو معلوم ہو گا کہ ان کے وجود خودداری کے دامن پر بدنما دھبوں سے کم نہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو صفاتِ حسنہ کی جڑیں نامعلوم طریقے پر کھوکھلی کر رہے ہیں، مگر سوسائٹی میں بڑے خوددار کہلاتے ہیں، بہت سے لوگ ظاہری خودداری سے عوام میں عزّت حاصل کر لیتے ہیں لیکن ان کی عزّت کاغذ کی ناؤ اور کاٹھ کی ہنڈیا سے زیادہ پائیدار نہیں ہوتی۔ جونہی ان کا بھرم کھلتا ہے سب بنی بنائی عزّت خاک میں مل جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پردہ اُٹھ جانے کے بعد ایسے لوگوں کو بے حد ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ اس قسم کی حرکات سے خودداری کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ ہر خوددار انسان پر دھوکے باز

کا گمان گزرتا ہے۔ ضروری ہے کہ خودداری سے متعلقہ صفات کی تربیت میں بھی کوشش کی جائے اور اپنے آپ کو ہمہ صفت موصوف بنایا جائے تاکہ جس پہلو سے پردہ اُٹھے کوئی اچھی چیز ہی نظر آئے۔ اور یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے کہ خوبصورت بُرقعے نے بدنمائی اور بدصورتی کو چھپا رکھا ہے۔

تکبّر اور خودداری

بعض لوگ بغیر سوچے سمجھے خوددار شخص کو متکبّر کہہ دیتے ہیں۔ خودداری اور تکبّر میں زمین آسمان کا فرق ہے، خودداری تو ایسی محمود صفت ہے کہ اس کو شرط انسانیّت کہنا بجا ہے۔ ہاں تکبّر خود پسندی، خود بینی وغیرہ بُری صفات ہیں اور انکو ننگ انسانیّت کہنا درست ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ ان کی سرحد ایک دوسرے سے اتنی قریب ہے کہ ان میں امتیاز کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ اسی لئے ان کے جانچنے میں عام طور پر غلطی ہو جاتی ہے۔ اور ہماری ذراسی کج فہمی ایک عمدہ فضیلت کو رذیلت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ضروری ہے کہ ایسے نتائج کے استنباط میں مکمل حزم و احتیاط سے کام لیا جائے، تاکہ غلطی ہونے کا امکان پیدا نہ ہو۔

تکبّر اور خودداری کا معمولی سا فرق یہ ہے کہ متکبّر شخص انسانی کمزوریوں اور خامیوں کو بھول جاتا ہے، وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہمچو ما دیگرے نیست۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ اکملیّت کا دعوئے خدا ہی کو سزاوار ہے۔ دُنیا کی ہر چیز فانی اور غیر مکمل ہے جس چیز کو ہم آج

مکمّل خیال کرتے ہیں کل وہی چیز نامکمل ثابت ہوجاتی ہے۔ اِس لئے کسی بات پر تکبّر کرنا پوری پوری حماقت ہے۔ خدا نے ایک سے ایک بڑھ کر انسان پیدا کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خود دار شخص کسی بات پر غرور نہیں کرتا۔ ہاں وہ ایسی باتوں سے احتراز ضرور کرتا ہے جس سے اس کی عزّت میں فرق آتا ہے، اس حزم و احتیاط کی بنا پر اس کو متکبّر کہنا سخت ناانصافی ہے۔ وُہ تو غرور اور تکبّر سے کوسوں دُور ہے۔ وہ صرف اپنی عزّت کی حفاظت کرتا ہے اور یہ اس کا پیدائشی حق ہے۔

اسی طرح خود پسندی کا الزام خود دار شخص پر لگانا بڑا سخت اخلاقی جُرم ہے۔ جو لوگ خود پسند ہوتے ہیں وہ اپنی خوبیوں کے اظہار میں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح اِن کی خُوبیوں کے مقابلے میں دوسروں کی خُوبیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔ خود دار شخص یہ اخلاقی ظلم کبھی روا نہیں رکھتا۔ نہ وہ اپنے کم خُوبیوں والے شخص کی عزّت میں کمی کرتا۔ اور نہ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے تو اس کی عزّت کون کرے۔ اس کا مسلک تو یہ ہے۔ کہ پہلے وہ دوسروں کی عزّت کرے پھر اپنی عزّت کرے۔

خود داری افعال رذیلہ سے روکتی ہے

جب کوئی شخص اپنے نفس کی نگہداری کرتا ہے۔ تو اس میں بڑی بڑی محمودہ صفات

پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ مصیبتوں کو ہنسی خوشی برداشت کرتا چلا جاتا ہے اور اپنے وقار میں فرق نہیں آنے دیتا۔ جب اس کی عزت خطرے میں پڑ جاتی ہے تو جان پر کھیل جاتا ہے۔ وہ ذلت کی زندگی پہ بہادری کی موت کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی جان پر بن جاتی ہے لیکن اپنی خودداری کو فروخت نہیں کرتا۔ اگر وہ غلامی بھی کرتا ہے تو خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ انقلابات ایّام اگر اس کو محتاج کر دیں تو وہ اپنے جیسے انسان کے سامنے دست سوال نہیں پھیلاتا، ناکامیاں اور نامرادیاں اس کی ہمّت کو نہیں توڑ سکتیں۔ وہ مصیبتوں کے طوفانوں کا سخت چٹان کی طرح مقابلہ برابر کیے جاتا ہے اور اپنے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دیتا۔ نہایت نازک اور امتحان کے موقعوں پر خودداری اس کا ساتھ دیتی اور افعال رذیلہ کے ارتکاب سے روکتی ہے۔ خودداری اس کو انسانیت کے رُتبے سے گرنے نہیں دیتی، ورنہ مصیبتیں انسان سے وہ کچھ کروا دیتی ہیں، جو عام حالات میں وہ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھتا۔ خودداری ایسے ہی اوقات میں اس کی دستگیری کرتی اور اشرف المخلوقات کے لقب کی لاج قائم رکھنے کی ہمّت پیدا کرتی ہے۔

خودداری میں عروج و زوال مضمر ہے | جن اقوام و افراد میں خودداری نہیں ہوتی۔ وہ دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتے، حادثات اور انقلابات

ان کے وجود کو حرف غلط کی طرح صفحۂ عالم سے مٹا دیتے ہیں،
خودداری قوموں کے عروج اور زوال کی نشانی اور تہذیب وتمدّن
کا نچوڑ ہے۔ خودداری ہی وہ صفت ہے جو ہم کو تعزّز۔ استقلال،
پیش بینی۔ شجاعت اور حزم و احتیاط سکھاتی ہے۔ خودداری
غلامی کی زنجیریں کاٹنے اور ناانصافی کا خاتمہ کرنے والی ہے۔
خودداری ہر مذہب و ملّت کا ماحصل ہے اور اقوام و افراد کو
پرکھنے کا صحیح معیار ہے۔ غرض خودداری اکتسابِ فضائل کی تائید
اور ارتکاب رذائل کی تردید ہے۔

فرض

جس قدر ہمارے قوائے عقلیہ پرورش پاتے ہیں احساسِ فرض ہمارے دل پر بڑھتا چلا جاتا ہے قدرتی طور پر ہمارا ضمیر ہر فرض پر ہمیں آگاہ کر کے ادائے فرض کی طرف متوجّہ کرتا رہتا ہے، یہ خصوصیّت اگرچہ حیوانوں میں بھی موجود ہے۔ لیکن جتنی ان کی عقل ہوتی ہے اتنا ہی ان کو اپنے فرائض کا احساس ہوتا ہے۔

عام طور پر فرائض اپنی ذات سے شروع ہوتے اور ہماری وسعت نظر اور تعلقات کی گہرائی کے ساتھ ساتھ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں بعض اوقات محض انسان ہونے کی وجہ سے کچھ فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں اور ہم ان کو بہت کافی اہمیّت دیتے ہیں۔

فرائض کی بجاآوری انسان کے مرتبہ کو بلند کرتی اور قلب و دماغ کو ایک مستقل اور غیر فانی تقویت اور مسرّت بخشتی ہے۔ ان کیفیتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے انسان شدید ترین خطرات میں بھی ادائے فرض سے باز نہیں رہ سکتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان کی عقل خطا کھا جاتی ہے۔ اور وہ کسی غلط کام کو اپنا فرض خیال کر لیتا ہے۔ چنانچہ اس غلط مگر بزعم خود صحیح فرض

کی بجا آوری میں وہ پوری پوری قوت صرف کرتا ہے۔ اور اس کے بجا لانے سے اسے ویسی ہی روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے جیسی کسی صحیح فرض کو ادا کرنے سے ہوسکتی ہے۔ ماننا پڑے گا کہ ایسے معصوم لوگوں کی غلط فرض انگاریاں ضرور قابلِ عفو ہیں اور ان کی ہمت اور استقلال یقیناً قابل تعریف کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر ادائے فرض میں کوتاہی نہیں کرتے اور اس روحانی خوشی کے حاصل کرنے میں ہر ممکن جد و جہد کرتے ہیں جو ادائے فرض کا نتیجہ ہے۔

پیدائشی آزادی فرض سے آزاد نہیں کرتی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسان دنیا میں مطلق العنان اور آزاد پیدا ہوا ہے اور اپنے فرائض کے حدود خود مقرر کرتا ہے۔ گویا فطرت کی طرف سے اس پر کسی قسم کے فرائض عائد نہیں ہوتے، بلکہ جس ماحول اور فضا میں وہ تربیت پاتا ہے۔ اس کے مخصوص اثرات سے وہ اپنے لئے مختلف قسم کی ذمہ داریاں اور فرائض اپنی خوشی سے پیدا کر لیتا ہے اس لئے اگر وہ چاہے تو اپنی پیدائشی آزادی اور مطلق العنانی کو برقرار رکھ سکتا ہے، ہمارے نزدیک یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ انسان علائق دنیا اور فطرتی بندشوں سے کسی صورت آزاد نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لئے انسان کے متعلق یہ رائے قائم کرنا کہ وہ مطلق العنان یا آزاد پیدا ہوتا ہے کسی طرح درست نہیں۔

اگر ہم سب اپنے آپ کو مطلق العنان سمجھ کر یہ خیال کر لیں کہ ہم پر

کوئی فرض عائد نہیں ہوتا اور ہم ہر معاملے میں بالکل آزاد ہیں تو دُنیا کا امن و سکون غارت ہو جائے۔ اور تمام کاروبار زندگی بند ہو جائیں کیونکہ دُنیا کے کام انفرادی کوششوں سے انجام نہیں پاتے، بلکہ ہر کام کی تکمیل کے لئے کسی نہ کسی قسم کی بیرونی امداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ تعاونی ضرورت پُوری نہ ہو تو دُنیا کے کارخانے کا نظام درہم برہم ہو جائے، ہمارے کام تو محض اس طرح حل ہو سکتے ہیں کہ ہر شخص اپنے فرائض کو محسوس کرے، اور ان کی ادائیگی میں پُوری دیانتداری سے کام لے۔

ادائے فرض سعادت دارین ہے

اس میں شک نہیں کہ انسان آزادی کو پسند کرتا اور فرائض کے بوجھ سے گھبراتا ہے۔ لیکن اس کا علاج ہی کیا ہے کہ فطرت نے اسے مجبور و معذور بنایا اور لاتعداد فرائض کا بوجھ اس پر لاد دیا ہے۔ اس پر لازم آتا ہے کہ وہ ان فرائض کو نہایت خوش اسلوبی اور کشادہ پیشانی سے ادا کرتا رہے۔ اگر وہ اپنے مخصوص فرائض کی بجاآوری میں تساہل سے کام لیتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ اس گروہ انسانی کو شدید نقصان پہنچاتا ہے جس کے ساتھ قدرت نے اسے وابستہ کیا ہے اگر کسی گروہ یا جماعت کا ہر ممبر یہ خیال کرے کہ مجھ پر کوئی فرض نہیں تو گزر اوقات اور ترقی کے راستے مسدود ہو جائیں۔ تمام کاروبار زندگی چلتے یکدم تھم جائیں، نیز ہر فرد سکون قلب کی دولت سے محروم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے

فرائض کو عمدگی اور دیانتداری سے ادا کرنے والے ان لوگوں سے برتر ہیں جو اپنے فرائض کا احساس نہیں رکھتے یا ان کی بجاآوری میں پوری کوشش نہیں کرتے۔

ادائے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہر فرد بشر کو یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے فرائض کیا کیا ہیں۔ اور وہ کونسے وسائل ہیں۔ جن کے ذریعے وہ اپنے فرائض حسن و خوبی کے ساتھ ادا کر سکتا ہے۔ اس قسم کی سوچ بچار سے فرائض کی ادائیگی میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ فرائض کی انجام دہی سے انسان کی استعداد اور قابلیت بڑھتی ہے۔ اور اس کا مرتبہ حیوانوں سے بلند ہوتا ہے۔ احساس اور ادائے فرض ہی وہ خصوصیت ہے جو حیوانوں کو انسانیت کے درجے کے قریب تر لاتی ہے۔ اس کے علاوہ ادائے فرض سے ایک قسم کی روحانی خوشی اور اطمینان قلب کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ اگر سوء اتفاق سے کوئی فرض صحیح وقت پر ادا نہیں ہو سکتا تو قدرتاً دماغی توازن اور سکون قلب میں فرق آجاتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات غیر منتہی تفکرات اور پریشانیاں قلب و دماغ پر مسلط ہو جاتی ہیں۔

فرض اور خود غرضی بعض فلاسفروں کا خیال ہے کہ انسان سرتاسر خود غرض واقع ہوا ہے اور وہ جتنے فرائض ادا کرتا یا اپنے ذمہ لیتا ہے ان سب کی تہ میں ہمیشہ خود غرضی پوشیدہ ہوتی ہے۔

ممکن ہے یہ خیال کسی حد تک درست ہو لیکن فرض کو سراسر خود غرضی سے وابستہ سمجھنا فرض کی رُوحانی عظمت کو بٹہ لگانا ہے۔

خیال کرو ایک اجنبی شخص کسی سخت تکلیف میں مبتلا ہے تمہیں اس کی زار حالی کا پتہ چلتا ہے نہ تمہاری اس سے کوئی سابقہ واقفیت اور راہ و رسم ہے اور نہ اس کے ساتھ کسی قسم کی ذاتی اغراض وابستہ ہیں۔ پھر تم کیوں اس کے دُکھ درد میں شریک ہو جاتے اور حتی الامکان اس کی اعانت کرتے ہو۔

اس ہمدردی کا اصلی سبب یہ ہے کہ تمہارا ضمیر تمہیں ادائے فرض پر اُکساتا ہے۔ اگر تم اس کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے تو آپ ہی آپ تمہاری رُوح کو اذیت اور قلب کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اور تم محسوس کرتے ہو کہ تمہارے ذمہ ایک فرض تھا جو تم نے ادا کیا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ انسان خود غرضی سے مبرّا ہے، وہ خود غرض ہے اور ضرور ہے لیکن یہ کہدینا یقیناً بہت سخت ظلم ہے کہ اس کے تمام افعال کی تہ میں خود غرضی کارفرما ہوتی ہے۔ اس الزام میں حقیقت صرف اتنی ہے کہ ہماری اکثر اغراض ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، اس لئے ہمارے ہر کام میں خود غرضی کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن جب بحیثیت انسان کوئی فرض ہم پر عائد ہوتا ہے تو خود غرضی اس سے کوسوں دُور ہوتی ہے۔ ہم ایسے فرض کو مجبوراً ادا نہیں کرتے بلکہ خوشی خوشی اور بغیر کسی غرض کے

بجا لاتے ہیں اور اُس کی ادائیگی عین انسانیت سمجھتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ہمارا ضمیر ادائے فرض کی طرف توجہ دلاتا ہے اگر ہم اس کی آواز پر لبّیک نہیں کہتے تو سمجھ لو کہ کسی لالچ یا کمزوری نے ادائے فرض کے سچّے جوش کو ٹھنڈا کر دیا، ورنہ ہم ضرور اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر لازوال روحانی مسرّت حاصل کرنے اور خود غرض ہونے کا الزام اپنے اُوپر نہ لیتے۔

فرائض تبدیل کیوں ہوتے رہتے ہیں،

ہمارے جتنے فرائض ہیں وہ سب ہمارے ہی بنائے ہوئے ہیں اور ہم ہی ان میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ تبدیلیاں کیوں عمل میں آتی ہیں۔ اس کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ فرائض کی منشا کے مطابق نہیں ہوتے۔ تجربہ ان کو بیکار ثابت کر دیتا ہے۔ پھر انسان ان پر غور و فکر کرتا اور ان میں جزوی یا کُلّی تبدیلیاں اس وقت تک جاری رکھتا ہے۔ جب تک فرائض انسانی منشائے فطرت کے ساتھ بالکل منطبق نہیں ہو جاتے۔

اسی طرح انقلابات اور تغیّرات کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے، گردش ایّام پرانی اور از کار رفتہ تہذیب و تمدّن کو تبدیل کرتی رہتی ہے۔ نئے نئے اصول اور قوانین پرانے اور فرسودہ قاعدوں اور رسموں کی جگہ لے لیتے ہیں، لیکن نظام فطرت کے قوانین میں کوئی انقلاب یا تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

ادائے فرض زندگی کا نصب العین ہے

فطرت نے فرائض کا سُنہری جال کچھ اس طرح بچھایا ہے کہ ہماری ناقص عقل اس کی اُلجھنوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس جال میں انسان کو اس طرح جکڑ بند کیا گیا ہے کہ کسی کی تدبیر سے جیتے جی چھٹکارا نہیں۔ لطف یہ ہے کہ جو شخص اس [illegible] سے نکلنا چاہتا ہے اور زیادہ اُلجھتا چلا جاتا ہے۔ وہ دُنیا کو چھوڑتا [illegible] دُنیا اس کو نہیں چھوڑتی۔ گویا قطع علائق کا حربہ بھی کچھ کام نہیں دیتا۔ ہاں اگر اس سے نجات مل سکتی ہے تو محض موت کے ذریعے، مگر موت ایسی بلا ہے کہ ہر انسان اس سے ڈرتا اور لرزتا ہے۔ کوئی لاکھ کہے اس زندگی سے موت بہتر ہے لیکن جب موت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، تو حقیقت معلوم ہوجاتی ہے۔ اس نظریہ سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو کسی فرض کو ادا کرنے میں موت کی پروا نہیں کرتے، ایسے لوگوں کے لئے موت زندگی کا ماحصل ہے۔ لیکن وہ لوگ جو فرائض انسانی سے بچنے کے لئے موت طلب کرتے ہیں۔ اکثر حالت نزع یا سخت بیماری کے عالم میں اپنے گناہوں اور خطاؤں کی بار بار معافیاں مانگتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ فطرت نے ان کے ذمہ خالق و مخلوق کے کچھ فرائض عائد کئے تھے جن کو وہ ادا کرنے سے گریز کرتے رہے اور اگر ادا بھی کئے تو نہایت بد دلی اور مجبوری سے اس قسم کے احساسات سے ثابت ہوتا ہے کہ قدرت نے ادائے فرض کو زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ادائے

فرض کی آواز ہر وقت ہمارے ضمیر سے نکلتی اور ہمیں اپنے فرائض سے آگاہ کرتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ تن آسانی اور کاہلی کی وجہ سے ہم گُم سُم ہو کر بیٹھے رہیں اور اس آواز پر لبیک نہ کہیں۔

تقسیم فرائض

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فطرت تخلیق انسان میں معیار مساوات کو قائم نہیں رکھتی اور مختلف درجوں اور طبیعتوں کے انسان پیدا کر دیتی ہے۔ عدم مساوات کی بدولت بنی نوع انسان میں کبھی یکجہتی اور اتفاق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس نظریہ پر اعتراض یہ ہے کہ اگر فطرت ایک جیسی قابلیتوں اور ایک طرح کی خصوصیتوں کے انسان پیدا کر دیتی تو پھر نظام عالم میں اور بھی زیادہ انتشارات پیدا ہوتے رہتے۔ اس تخلیقی مساوات کا سب سے زیادہ نقصان یہ ہوتا کہ زندگی اجیرن ہو جاتی کیونکہ اس کے لطف کا راز کشمکش حیات میں مضمر ہے، نیز دُنیا داری کے فرائض لاتعداد ہیں۔ ان کی تعمیل کے لئے مختلف قسم کی طبیعتوں اور قابلیتوں کے افراد کی ضرورت ہے اگر فطرت کارگاہ تخلیق سے سب کو ایک قسم کی قابلیت اور مزاج کا بنا کر نکالتی تو دُنیا کے اَن گِنت اعلےٰ وادنےٰ فرائض کیونکر ادا ہو سکتے۔ بس اسی مقصد کو مدّنظر رکھ کر کہ دُنیا کے کاروبار میں کسی قسم کی رکاوٹ اور انتشار پیدا نہ ہو قدرت نے مختلف قسم کے انسان پیدا کئے۔

تقسیم فرائض اور ادائے فرض کے قضیہ کو یوں سمجھنا چاہئے کہ دُنیا ایک بہت بڑی مشین ہے اور ہر ایک انسان اس مشین کا

ایک پرزہ ہے، جو پُرزہ اپنا فرض پوری طرح ادا نہیں کرتا اس کو ٹھیک کرتے ہیں یا بدل ڈالتے ہیں، اگر اس کی خرابی کو درست نہیں کیا جاتا تو تمام مشین پر اس کا اثر پڑتا ہے، یہاں تک کہ ایک پُرزے کی خرابی سے پوری مشین میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اور ایک ایسا وقت آجاتا ہے جب پوری مشین بیکار ہو جاتی ہے، پھر ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ مشین کے تمام نظام کو از سرِ نو درست کیا جائے اور تغیرّ تبدّل کے عمل سے اس کی خرابیوں کو دُور کر کے اُسے چلتا کر دیا جائے۔

بجنسہٖ یہی حالت نظامِ عالم کی ہے، اس لئے تقسیمِ فرائض اور ادائیگی فرض کی طرف متوجہ ہونا نہایت ضروری ہے، جس حکومت یا ادارے کے اراکین اپنے اپنے فرائض پوری طرح ادا نہیں کرتے وہ کبھی اپنے نظام کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس کے کاروبار میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور آخر کار ان کو دُور کرنے کے لئے مختلف قسم کے ردّ و بدل عمل میں لانے پڑتے ہیں۔

قسامِ فرائض کا فرض ہے کہ وہ ہر شخص کی قابلیّت اور ہمّت کے مطابق فرائض کی تقسیم کرے۔ گویا فطرت نے جس شخص کو جس قابل بنایا ہے اس کے سپرد ویسا ہی کام کرے تاکہ ہر کام ضرورت کے مطابق نہایت خوش اسلوبی اور عمدگی سے انجام پذیر ہو، اور کسی قسم کا رخنہ یا خلل رونما نہ ہونے پائے۔

ہر کام میں تقسیم فرائض کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں رو رعایت سے گریز کرنا ازبس ضروری ہے، ورنہ شدید نقصان اور خلل کے امکان پیدا ہو جاتے ہیں، انقلابات اور بغاوتیں اکثر اسی سقم سے رونما ہوا کرتی ہیں، خاندان ادارے، حکومت، تجارت زراعت، صنعت و حرفت، علم و ادب، غرض کاروبار دنیا کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو فرائض کی غلط تقسیم سے تنزل پذیر ہو کر نظام عالم میں خلل انداز نہیں ہوتا۔

احساس فرض بامراد اور کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے ادائے فرض کی تعلیم از حد ضروری ہے، جس انسان کو ادائے فرض کا احساس نہیں ہوتا نہ وہ دنیا میں ترقی کر سکتا اور نہ کامیابی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکتا ہے، اس لئے زندگی کے ابتدائی مراحل ہی میں اس بات کا احساس پیدا کر لینا چاہیئے کہ خداوند تعالےٰ نے انسان کو بیکار پیدا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے ذمہ بہت سے فرائض لگائے ہیں جن کو ادا کرنا دنیا اور آخرت کی آسودگی کا سرمایہ بہم پہنچاتا ہے، کسی نے کیسی بھلی بات کہی ہے کہ ہمارا چھوٹے سے چھوٹا گھر ادائے فرض کی تعلیم کا مدرسہ ہے، جس گھر کی تربیت میں ادائے فرض کی تعلیم شامل نہیں ہوتی اُس کا نظام ہمیشہ درہم برہم رہتا ہے، اس کے برعکس جن گھروں میں احساس فرض اور ادائے فرض کی پوری تعلیم دی جاتی ہے، ان گھروں کی

عورتیں مرد اور لڑکے لڑکیاں بلکہ ملازمین تک سلیقہ شعار اور فرض شناس ہوتے ہیں، ایسے ہی خاندان پھُولتے پھلتے اور ترقی کرتے ہیں، ان کا ہر فرد اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر سوسائٹی اور مُلکی حکومت کے قوانین اور قواعد کی پابندی کرتا ہے، ایسے ہی افراد اچھے شہری اور امن پسند رعیّت کہلانے کے مستحق ہیں، اور حق یہ ہے کہ انھی کی بدولت تہذیب و تمدّن اور زندگی کے ہر شعبے میں ترقی ہوتی ہے۔

انسان کے فرائض لاتعداد ہیں، اور ان کی کُلّی ادائیگی بہت مشکل کام ہے، لیکن ہمارا فرض ہے کہ جس قدر فرائض ادا کرنے کی ہم میں ہمّت موجود ہے ہم ان کو ادا کر کے سعادت دارین حاصل کریں۔

سب سے پہلے ہم پر پروردگار کے فرائض ہیں کہ اس نے ہم کو پیدا کیا اور اشرف المخلوقات کا لقب دیا ہے، چونکہ انسان صنعت کردگار کا نقش نادر ہے اس لئے اسے اپنی ہستی کو خاک میں نہیں ملانا چاہیے بلکہ اپنی مختصر زندگی میں اسے ایسے ایسے فرض ادا کرنے چاہئیں جن کی ادائیگی سے انسانیت کو عروج حاصل ہو۔

حقوق خالق کو ادا کرنے کے بعد فرائض انسانی کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے اور اس میں ماں باپ، بھائی بہن، بیوی شوہر اور دُور

و نزدیک کے رشتے شامل ہیں۔ ان کے بعد حقوق ہمسایہ اور دیگر متعلقین کی باری آتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ دائرہ اس قدر بڑھتا ہے کہ اپنے وطن اور ملک پر محیط ہو کر تمام دُنیا کا محاصرہ کر لیتا ہے اور فرائض انسانی اس قدر لاتعداد اور غیر محدود ہو جاتے ہیں کہ ایک طویل العمر انسان بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ بہر حال کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اپنی مختصر سی زندگی میں اپنے گھر کے دائرے سے نکل کر مُلک و قوم بلکہ ساری دُنیا کو ادائے فرض سے فائدہ پہنچاتے اور خداوند تعالےٰ کے اس مقصد عظیم کو پُورا کرتے ہیں، جس کی تکمیل کے لئے اس نے انہیں پیدا کیا ہے۔

پابندیٔ وقت

کسی کا مقولہ ہے کہ "وقت ہی زندگی ہے، اس لئے اگر تمہیں زندگی پیاری ہے تو وقت ضائع نہ کرو۔" ایک اور صاحب کہتے ہیں اگر تمہیں اپنے مستقبل یعنی آیندہ زندگی کا خیال ہے تو وقت کی قدر کرو۔ کیونکہ گزرا ہوا وقت پھر ہاتھ نہیں آسکتا اور کل کا پتہ نہیں کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہونے والا ہے، گویا جو کچھ ہے موجودہ وقت ہی ہے، اگر اس وقت سے فائدہ نہ اُٹھایا، تو سمجھ لو کہ سراسر نقصان پایا۔ کسی عقلمند کا قول ہے ہمیں ماضی کی پروا نہیں کرنی چاہیے، مستقبل کے لئے پریشان ہونا عقلمندوں کا شیوہ نہیں، بس اتنا ہی سمجھنا کافی ہے کہ آج کا ایک اور کل کے دو برابر ہیں۔

ایک وقت کے قدردان کا نظریۂ وقت اس سے بھی زیادہ پُر لطف ہے وہ کہتے ہیں۔" یہ تو ہر شخص تسلیم کرتا ہے، کہ زندگی بہت تھوڑی ہے، لیکن اس بات پر بہت کم لوگ غور کرتے ہیں کہ اگر وقت ضائع کیا جائے تو وہ اور بھی تھوڑی رہ جاتی ہے۔

ایک فلسفی لکھتا ہے اگر ہم وقت پر حاوی نہ ہوں، تو وقت

ہم پر غالب آجاتا ہے اور ہمیں اپنی رو میں گھاس پھونس کی طرح بہا لیجاتا ہے، یہ بات بالکل درست ہے، جو لوگ وقت کے ساتھ مُرغ بادنما کی طرح اپنا رُخ بدلتے رہتے ہیں اور واقعات کے ہاتھوں کٹھ پتلی کی طرح ناچتے ہیں، ان کی بے بسی اور بیکسی پر واقعی ہنسی آتی ہے۔

وقت کی وقعت | حقیقت امر یہ ہے کہ حضرت انسان وقت کی قدر کرنی ہی نہیں جانتے لیکن جب وقت گزر جاتا ہے تو ضرور محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے کیسی انمول اور بیش بہا چیز غفلت میں ضائع کر دی، مگر پھر پچھتائے کیا ہوتا ہے، کتنی عجیب بات ہے کہ ہم سب کچھ سمجھتے ہیں، دن رات ان گنت عبرتناک مثالیں ہماری آنکھوں کے سامنے رہتی ہیں ہم دوسروں کو بڑے بوڑھوں کی طرح نصیحتیں کرتے ہیں، لیکن اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ ہم اپنے عزیز وقت یا پیاری زندگی پر کس بیدردی اور بے رحمی کے ساتھ کُند چھُری چلاتے ہیں۔

پابندیٔ وقت تضیع اوقات سے بچاتی ہے | عموماً ہم لوگ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ لغو اور بیہودہ باتوں میں بغیر محسوس کئے ضائع کر دیتے ہیں، بلکہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے اوقات بھی تلخ کرتے ہیں، اگر کوئی شخص یہ کوشش کرے کہ اپنے اوقات کو منضبط کرلے یا اپنی روزانہ کی مصروفیتوں کا ایک ٹائم ٹیبل بنا کر سامنے رکھ لے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرے تو کتنے ہی لیجئے

صاحب یہ تو مشین بن گئے ، ہر کام مخصوص وقت پر انجام دیتے ہیں، کھانا پینا، سونا جاگنا، پڑھنا لکھنا، ملنا جلنا، کھیلنا کودنا غرض ہر کام مشین کی طرح کرتے ہیں۔ ہم ان سے ملنے جلنے سے بھی گئے، پہلے تو جب فرصت ہوتی تھی ان کے پاس جا بیٹھتے تھے اور گھنٹوں باتیں رہتی تھیں، اب جس وقت جاؤ مصروف ہیں، کوئی نہ کوئی کام کر رہے ہیں، اچھا ٹائم ٹیبل بنا ہے کہ دوستوں سے ملنے کی بھی فرصت نہیں نئی تعلیم نے مروّت ہی باقی نہیں رکھی، صاحب لوگ بن گئے ہیں، صاحب! صاف بات یہ ہے کہ ہمیں ملنے کے قابل نہیں سمجھتے، دو لفظ انگریزی کے بولنے کیا آ گئے ہیں کہ آپے سے باہر ہو گئے ہیں۔

یہ خیالات ان لوگوں کے ہیں جو وقت کی قدر نہیں کرتے، نہ ان کو اپنا وقت عزیز ہے نہ دوسروں کا۔ ان کی منشا یہ ہے کہ جس طرح وہ اپنے اوقات کی تضیع کرتے ہیں اسی طرح دوسرے بھی کریں، ذرا غور کرو ایسے حضرات کہاں تک حق بجانب ہیں، اور یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی وقت میں تو اپنے کام میں مصروف ہوں اور میرے دوست صاحب کا دل گھبرایا، وہ سب بے تکان اُٹھے اور سیدھے آ کر انہوں نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا، اب میں مجبور ہوں یا تو اپنا کام چھوڑ دوں یا کورا جواب دے دوں کہ اس وقت مجھے فرصت نہیں، مہربانی فرما کر معاف فرمائیے

اور کسی اور دوست کو تلاش کر لیجئے، یہ آسانیاں تو اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہیں، جب میرے اور میرے دوستوں کے اوقات بھی میری طرح منضبط ہوں، مجھے معلوم ہو کہ وہ کب فارغ ہوں گے اور ان کو علم ہو کہ مجھے کس وقت فرصت ہو گی ورنہ یقیناً ایک دوسرے کا وقت ضائع ہو گا، اور طرفین میں سے کوئی بھی دلجمعی سے کام نہ کر سکے گا کیونکہ کیا پتہ، کون صاحب کس وقت آن دھمکیں اور ضروری سے ضروری کام کا سلسلہ ایک دم منقطع ہو جائے۔

فطرت بھی پابندِ اوقات ہے

کتنا غلط خیال ہے کہ باقاعدگی اور انضباط سے انسان مشین بن جاتا ہے، تجربہ ثابت کرتا ہے کہ باقاعدگی کام کے بوجھ کو ہلکا اور زندگی کو پُر لطف بناتی ہے، چونکہ قدرت کے تمام کام وقت پر انجام پاتے اور اہل دُنیا کی راحت کا موجب ہوتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے اوقات بھی منضبط ہوں تاکہ ہم دوسرے لوگوں کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنیں، سوچنے کی بات ہے، اگر سُورج ایک دن بجائے مشرق کے مغرب سے نکلے، دوسرے دن کسی اور طرف سے طلوع ہو یا کئی کئی دن تک دکھائی نہ دے تو دُنیا کی حالت کیا ہو، اگر موسم کی تبدیلی میں باقاعدگی نہ ہو تو ہم لوگوں کی زندگی پر اس کا کیا اثر پڑے، اگر بوئے ہوئے بیج ایک ساتھ نہ بڑھیں تو ہم لوگ کیا

کریں۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ پابندیٔ وقت عین منشائے فطرت ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اصول فطرت کے مطابق بسر کر کے اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے باعث راحت بنیں، اور اس خیال کو اپنے پاس بھی نہ پھٹکنے دیں کہ پابندیٔ اوقات انسان کو مشین بنا کر زندگی بے مزہ کر دیتی ہے۔

والدین کی تربیت کا اثر

والدین کی عادات اور اخلاق اولاد پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ مرتے دم تک ان کے نقوش مٹائے نہیں مٹتے۔ ایک مشہور مقولہ ہے اگر کوئی شخص تم سے یہ کہے کہ فلاں شخص نے اپنی کوئی عادت چھوڑ دی تو کبھی یقین نہ کرو مگر برخلاف اسکے اگر تمہیں یہ بتلایا جائے کہ ایک بہت بڑا پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا تو بلا تامل مان لو۔ بعینہٖ یہی حالت والدین کی تربیت کی ہے جو باتیں بچّوں کی گھٹی میں پڑ جاتی ہیں وہ طبیعت ثانیہ بن جاتی ہیں۔ پابندیٔ وقت کی عادت اگر والدین میں موجود ہو اور اس پر وہ پوری طرح عامل ہو تو اس کا عکس اولاد پر بھی ضرور پڑتا ہے، اگر بچّہ کو پیدا ہوتے ہی پابندیٔ وقت کا عادی بنایا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مدّت العمر پابندیٔ وقت کا خیال نہ رکھے۔

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ پابند اوقات بنانا ماں اور باپ کے فرائض میں داخل ہے۔ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ غیر تعلیم یافتہ ماں باپ وقت کی قدر کا احساس اتنا پیدا نہیں کر سکتے جتنا پڑھے لکھے والدین،

غیر بچپن کا زمانہ جوں توں کر کے گزر جاتا ہے، پھر پڑھنے لکھنے کا وقت آتا ہے۔ وہ بچے جو اپنے والدین سے پابندیٔ وقت کی عادت نہیں سیکھتے اکثر مدرسوں کی پابندی سے بیزار ہو جاتے ہیں، بیشتر امتحان کے خوف سے چھپتے پھرتے ہیں۔ اگر شروع ہی سے باقاعدہ پڑھا جاتا تو امتحان کا خوف ان کے چہروں کو زرد اور اعضا کو ڈھیلا اور دل کو غیر مطمئن نہ کرتا، وہ ہنستے کھیلتے امتحان میں شریک ہوتے اور کامیاب ہو کر نکلتے، ایسے بچے جب بڑے ہو کر خود مختارانہ زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو اس وقت بھی وقت کی قدر و قیمت کو نہیں پہچانتے وہ اپنے فرائض کو آج سے کل، کل سے پرسوں اور پرسوں سے برسوں پر ٹالتے چلے جاتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کی زندگی کا بیشتر حصّہ پریشانیوں میں گزرتا ہے اور ان کی کامیابیاں ان کے ارادوں کی طرح ہمیشہ مشکوک رہتی ہیں برخلاف اس کے جو لوگ آنے والے وقت اور مہموں کی شروع ہی سے باقاعدہ تیاری کرتے ہیں، ہمیشہ مطمئن رہتے ہیں۔ ان کو اپنی کامیابی کا ایک اور ایک دو کی طرح یقین ہوتا ہے، زندگی کے امتحانات ان کے دل کو کبھی بےچین اور پریشان نہیں کرتے، وہ نتائج کو خدا کے سپرد کر کے اپنی کوششیں متواتر مسلسل اور باقاعدہ جاری رکھتے ہیں۔

اساتذہ اور مدارس کا اثر | خانگی تربیت کے بعد بچوں پر اساتذہ اور تعلیمی اداروں کا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات ماننی پڑے گی کہ اساتذہ سے

زیادہ والدین کی تربیت بچّوں پر اثر انداز ہوتی ہے کیونکہ درسگاہوں میں اُستادوں کی زیر نگرانی بچّے زیادہ سے زیادہ پانچ چھ گھنٹے رہتے ہیں اور باقی وقت والدین کی سرپرستی میں صرف کرتے ہیں، اس لئے والدین ہی بچّوں کی تربیت کے زیادہ تر ذمّہ دار قرار دیئے جاسکتے ہیں، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بچّے اپنے والدین کا چربہ ہوتے ہیں، اگر والدین کی زندگی با اصول ہو تو بچّے بے اصول ہرگز نہیں اُٹھتے۔

جن مدارس میں تقسیم اوقات کے ساتھ انضباط اوقات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے ان کے طلبا زیادہ پابند اوقات ہوتے ہیں اگر والدین بھی اساتذہ کے ساتھ تعاون کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ بچّوں پر ان کی نگہداری کا خاطر خواہ اثر نہ پڑے مگر فطرتاً بچّے پابندی شکن ہوتے ہیں اور بے راہ روی ان کو مرغوب ہوتی ہے اس لئے والدین کی کمزوری اور ان کی بیجا شفقت کا وہ ہمیشہ ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اگر مدرسے کا سا نظم گھروں میں بھی قائم رہے تو انضباط طبیعتوں میں راسخ ہو جائے اور بچوں کی زندگی ایسی باقاعدگی اختیار کرلے کہ غیر منضبط ہونا طبیعتوں پر ناگوار گزرے۔

یورپ میں پابندیٔ اوقات کی شروع ہی سے عادت ڈالی جاتی ہے، گویا پیدائش کے بعد سے اس وقت تک جبکہ بچّے تعلیم سے فارغ ہوکر خود مختار نہیں بن جاتے ان کو اس عادت سے منحرف نہیں ہونے دیا جاتا۔ اس قسم کی تربیت سے بچوں کی عادات

اس قدر مستحکم اور باقاعدہ ہو جاتی ہیں کہ وہ عمر بھر باقاعدگی کی زندگی بسر کرتے ہیں، یورپ میں ایسے مدرسے بکثرت موجود ہیں جن میں ہوش سنبھالتے ہی بچوں کو داخل کر دیا جاتا ہے اور گھر کی زندگی سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ دن رات وہیں رہتے ہیں اور اپنے روزانہ کے پروگرام سے انچ بھر اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے، ہمارے ملک میں اول تو ایسے مدارس ہی نہیں اگر ہیں تو بہت ہی کم ، دہلی میں ایک مدرسہ موجود ہے جس میں لڑکے صبح آٹھ بجے حاضر ہوتے ہیں، اور رات کے آٹھ بجے واپس آتے ہیں، ظاہر ہے ایسے مدرسوں کے اخراجات ناقابل برداشت ہیں، اس لئے فقط دولتمند لوگوں کی اولاد ہی ان سے مستفید ہو سکتی ہے، اگر ایسے مدارس کے اخراجات کم کر دیئے جائیں اور اوسط درجے کے لوگوں کی اولاد کو ان سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دیا جائے تو اس قسم کے مدارس سے ملک میں تعلیم کا صحیح مذاق اور پابند اوقات بننے کی عادات نہایت آسانی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔

ہوسٹل کی تربیت | ہمارے مُلک میں ہر معقول مدرسے کے ساتھ دارالاقامت بھی ہوتا ہے، لیکن اس کو پردیسیوں اور بے گھروں کی جائے قیام تصوّر کیا جاتا ہے، والدین پدری شفقت کے جوش میں اولاد کو اپنے سے علیحدہ کرنا گوارا نہیں کرتے، ہم لوگوں کو گھر کے ہوتے ہوتے بورڈنگ ہاؤس اور ہوسٹل میں رہنا عجیب سی

بات معلوم ہوتی ہے، عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ ہوسٹل کی تربیت طلبا کو رنگروٹ اور بیفکرا بنا دیتی ہے، اس لئے ہم لوگ اس وقت بچوں کو ہوسٹل میں داخل کرتے ہیں جب گھر میں رہنے کا کوئی خاطر خواہ یا تسلی بخش انتظام نہ ہو سکے یا کوئی ایسی مجبوری آن پڑے جس کا کوئی اور علاج نہ ہو سکتا ہو، برخلاف ان خیالات کے ماہرین تعلیم کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ تعلیم کا حقیقی مقصد اُسی وقت پُورا ہو سکتا ہے جب طالب علم خاص علمی ماحول میں رہے ہوسٹل کی زندگی اس مقصد کو بطریق احسن پورا کرتی ہے، کیونکہ وہاں کی فضا میں ہر وقت علمی کیفیت طاری رہتی ہے اور ہر کام بغیر قصور کے وقت پر انجام پاتا ہے۔ جو طلبا ہوسٹل کے قوانین کی پابندی نہیں کرتے تکلیف اُٹھاتے ہیں، آخر کار وہ خود بخود راہ راست پر آجاتے ہیں، اور مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہوسٹل کی پُر نظم زندگی میں توازن قائم رکھیں۔ وقت پر کھانا۔ وقت پر کھیلنا، غرض پڑھنا لکھنا، پھرنا چلنا، اُٹھنا بیٹھنا گویا ہر کام اوقات کا پابند ہو جاتا ہے، یہ ایسی باتیں ہیں جو گھر پر میسّر نہیں، طلبا کے لئے گھروں کا ماحول زہر قاتل ہے، بچّے شور مچا رہے ہیں، خیالات کو مجتمع کر کے مطالعہ کرنے بیٹھے کہ ادھر سے آواز آئی فلاں چیز نہیں ہے ذرا لپک کر بازار سے لے آنا مدرسے کا کام دلچسپی اور انہماک سے کر رہے ہیں اور کوئی بن بلائے مہمان آدھمکے، مروّت اور شرم نے مجبور کر دیا کہ ان سے باتیں کریں،

ہوسٹل میں رہ کر یہی باتیں نہیں ہوتیں، جو والدین ان خصوصیات کو جانتے ہیں وہ ہوسٹل کی زندگی کو گھر کی زندگی پر ضرور ترجیح دیتے ہیں اور اپنے بچوں کی اصلاح اور ان کے اوقات کو منضبط کرنے کے لئے ہوسٹل میں داخل کر دیتے ہیں، دیکھنے میں آیا ہے اور تجربے سے ثابت ہے، کہ جو لوگ شروع میں باقاعدہ اور منظم زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں وہ مدت العمر اوقات کی پابندگی کا خیال رکھتے اور بڑے مزے کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

پابند اوقات نہ ہونے کے تلخ نتائج

پابند اوقات نہ ہونے کے تلخ نتائج سے کم وبیش ہر شخص واقف ہے، مگر ان لوگوں کو اس کا کچھ زیادہ تجربہ ہے جو خود تو پابند اوقات ہیں لیکن ماحول بے ضابطہ اور بیقاعدہ ہے جو لوگ اپنے اوقات کی قدر نہیں کرتے بھلا وہ دوسرے کے وقت کی کیا قدر کرینگے۔ ایسے لوگ خود بھی تکلیف اُٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی تکلیف پہنچاتے ہیں، بات یہ ہے کہ عدم تعلیم اور خاص طور پر تعلیم نسواں کے فقدان کی وجہ سے ہم لوگوں میں پابندیٔ وقت کا احساس بہت ہی کم ہے، اکثر بیاہ شادیوں اور دعوتوں کے موقعہ پر جس قدر بے ضابطگی کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، ایک شخص کے انتظار میں سینکڑوں آدمی بیٹھے رہتے ہیں باوجود انتہائی تاکید کے سمجھا یہی جاتا ہے کہ مجوزہ پروگرام کئی گھنٹے دیر سے شروع ہوگا اس لئے جتنی دیر میں جائیں اچھا ہے، اگر ایسے مواقع

پر شدت کے ساتھ وقت کی پابندی کی جائے، اور دیر میں آنے والوں کا انتظار نہ کیا جائے، تو ان کو اچھا خاصہ سبق دیا جا سکتا ہے۔

اس میں کلام نہیں اچھی بُری عادتیں سبھی میں ہوتی ہیں، لیکن ایسی بُری عادتیں بہت ہی بُری ہیں جن کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔ چنانچہ پابندیٔ وقت کا خیال نہ رکھنے کی عادت بھی ان بہت ہی بُری عادتوں میں سے ہے، کیونکہ اس کا اثر اپنی ذات پر بھی اچھا نہیں پڑتا اور دوسروں کو بھی اس سے خواہ مخواہ تکلیف پہنچتی ہے۔

سنیما

فلم سازی | مشکل سے اُنیس بیس سال کا عرصہ ہوا کہ فلم سازی کی صنعت یوُرپ سے ہندوستان میں آئی ، تھوڑی سی مُدّت میں اس صنعت نے اس قدر ترقی کی کہ لاتعداد فلم ساز کمپنیاں ہمارے مُلک میں جاری ہوگئیں ، یہ کمپنیاں نہ صرف بیکاروں اور بیروزگاروں کے لئے مفید ثابت ہوئیں بلکہ ملکی سرمایہ کو اپنے ہی ملک میں استعمال کرنے کا مستقل ذریعہ بن گئیں ، فلم سازی کی صنعت سے جہاں ملک کو فائدے پہنچے وہاں ناتجربہ کار اور نااہل کارکنوں کی بدولت شدید مالی نقصانات اُٹھانے پڑے کیونکہ ہر کس وناکس ذرا سے تجربہ کی بنا پر اپنے آپ کو فلم سازی کا ماہر سمجھ بیٹھا اور چند احباب کو جمع کر کے ایک فلم کمپنی کی بُنیاد ڈال دی ، فلم کمپنیوں کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر کمپنیاں کام شروع کرنے سے پہلے اور بعض پہلا فلم تیار کرنے کے دوران میں دیوالیہ ہو جاتی ہیں ، منتظمین بہت تیر مارتے ہیں تو ایک آدھ فلم تیار کر کے حصّے داروں کو ہاتھ جھاڑ کر دکھا دیتے ہیں ، غرض ایسی کمپنیاں چند ہیں جن کو ایک سے دوسرا فلم تیار کرنے کا موقع ملتا ہے لیکن

لطف یہ ہے کہ ان بے اعتدالیوں کے باوجود صنعت فلم سازی تابناک ماضی اور درخشندہ مستقبل کی مالک ہے۔

سینما کی مقبولیت کے اسباب | عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ صنعت فلم سازی کی ترقی کا راز اس کی تفریحی خصوصیات میں مضمر ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ سینما دیکھنے سے تفریح کیوں ہوتی ہے، ایک مزدور جو دن بھر محنت کرتا ہے، یا وہ لوگ جو تمام دن دماغی کام کرنے کے عادی ہیں شام کے وقت اپنی پریشانی اور خستگی دور کرنے کے لئے سینما ہالوں کی طرف جاتے ہوئے کیوں نظر آتے ہیں، اور زن و مرد بچے اور بوڑھے سینما کے اس قدر کیوں دلدادہ ہیں۔

فلسفیانہ زاویۂ نظر سے اس عقدہ کی تشریح یہ ہے کہ انسان کو نقل و تقلید کرنے میں ایک خاص قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے، اس لئے وہ جس چیز سے متاثر ہوتا ہے اس کی خود بخود نقل کرنے لگتا ہے، اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے وہ خود اس کی نقل نہیں کر سکتا تو دوسروں کو نقالی کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے، سچ پوچھئے تو انسان کی ترقی کا دارومدار اسی تقلیدی مادہ پر ہے، اگر اس کی طبیعت میں سے اس قوت کو نکال ڈالا جائے تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، ڈرامہ نگار اور فلم کار انسان کی اسی خصوصیت سے فائدہ اٹھا کر ان باتوں کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کی نقالی سے ہر انسان کا دل متاثر ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ انسان کی طبیعت میں ایک اور ایسا مادہ موجود ہے، جس کی بدولت بعض مخصوص حالات میں اس پر خود فراموشی اور نیم بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، عام طور پر کسی افسانے کو پڑھنے یا فلم کو دیکھنے میں اکثر یہ کیفیت ہم پر طاری ہوا کرتی ہے، اس مخصوص کیفیت کے طاری ہونے کا سبب یہ ہے کہ ہم افسانے یا تصویر کے کسی خاص کردار کے ساتھ شخصی مطابقت یا ذاتی یکسانیت پیدا کر کے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بذات خود اس کردار کے فرائض منصبی انجام دے رہے ہیں، اس لئے جب وہ ہنستا ہے تو ہم ہنستے ہیں، وہ روتا ہے تو ہم بھی رو دیتے ہیں، غرض اس کی ہر حرکت کے ساتھ ہماری رگ و پے میں بھی جنبش اور حرکت پیدا ہوتی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں بندر بندریا کا تماشہ دیکھ رہا تھا، میرے برابر ایک لڑکا بھی کھڑا تھا، وہ بندریا کے تماشے میں اس قدر محو ہوا کہ اپنے آپ کو بھول گیا، گویا اس محویت کے عالم میں اس نے بندریا سے ذاتی مطابقت پیدا کر لی، اتفاق سے بندریا نے بندر کے کاٹا اور اس لڑکے نے عالم محویت میں بے تکلف میرے بازو پر کاٹ لیا۔

ناولوں کے پڑھنے اور فلموں کے دیکھنے سے اور قسم کی خوشیاں بھی ہوتی ہیں، لیکن کسی کردار سے ذاتی یکسانیت اور شخصی مطابقت پیدا کر لینے سے جتنی زیادہ مسرت حاصل ہوتی ہے اس کے مقابلے میں

اور قسم کی خوشیاں اور کیفیتیں کوئی وقعت نہیں رکھتیں، اکثر اوقات
سننے میں آتا ہے کہ فلاں فلم کو دیکھ کر یا اس افسانے کو شروع کر کے
ہم ایسے محو ہوئے کہ اپنے آپ کو بھول گئے، دیکھنا یہ ہے کہ آخر
اس قسم کی محویت یا استغراق پیدا ہونے کا اصلی سبب کیا ہے، اس
اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہماری بیشتر آرزوئیں اور خواہشیں عملی
زندگی میں بعض مجبوریوں اور پابندیوں کی وجہ سے پوری نہیں
ہو سکتیں، اور اگر پوری ہوتی ہیں تو اس طرح نہیں ہوتیں جس طرح
ہمارا دل چاہتا ہے، اس لئے ان سے پوری خوشی نہیں ہوتی، جب
ہمارے یہ دبے ہوئے ارمان اور نیم بسمل آرزوئیں کسی افسانے یا
پردے پر پورے ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو ہم بیحد مسرور
ہوتے ہیں، اور سرور انبساط میں اس مخصوص کردار سے خیالی ہم آہنگی
اور ذاتی مطابقت پیدا کر کے من و تو کے فرق کو بھول جاتے ہیں، گویا
ہم ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں جیسے یہ ہماری ہی دیرینہ حسرتیں نکل
رہی ہیں، اور ہم ہی فائز المرام ہو رہے ہیں۔

حقیقتاً انسان کا دل لاتعداد حسرتوں اور بے قیاس آرزوؤں کا
گہوارہ ہے، اس لئے عملی زندگی میں ان تمام دلی ارمانوں کا نکلنا
امر محال ہے۔ غالبؔ ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

تمام آرزوؤں کے پورا نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہماری بیشتر آرزوئیں ایک دوسرے کی ضد ہوتی ہیں اگر ان سے ایک پوری ہوتی ہے تو دوسری کی حسرت لازماً اٹھانی پڑتی ہے، فلاسفہ نے اس قسم کی متضاد آرزوؤں کے پورا کرنے کا حل یہ پیش کیا ہے کہ عملی زندگی میں ان آرزوؤں کو پورا کیا جائے جن کا حصول ممکنات سے ہے اور وہ آرزوئیں جن کی تکمیل عملی طور پر ممکن نہیں ان کے لئے ایسے افسانوں اور ڈراموں سے مدد لی جائے جن میں فرضی کردار اس قسم کی مخصوص تمنائیں پوری کرتے ہیں۔

فرض کیجئے ہم امن و سکون کے خواہشمند ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں ولولہ خیز اور جوش انگیز زندگی کی بھی آرزو ہے، ظاہر ہے کہ یہ دونوں حسرتیں متضاد ہیں، اس لئے عملی زندگی میں ان کا بیک وقت پورا ہونا محال ہے، فلاسفہ کی ترکیب کے مطابق ان دونوں حسرتوں کے نکالنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ عملی زندگی میں ہم امن و سکون کی آرزو کو پورا کریں اور ناولوں اور فلموں کو دیکھ کر ہنگامہ خیزی کی بھڑاس نکالیں۔

مذاحیہ ڈراموں کی پسندیدگی کے اسباب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم و تربیت کا اثر، رائے عامہ کا دباؤ اور تہذیب و تمدن کی مجبوریاں ہمیں غیر فطری حد تک مؤدب اور مہذب بنا دیتی ہیں مگر حقیقتاً ہماری فطری آزادی ان بندشوں کو پسند نہیں کرتی، اس لئے مجبور ہو کر ہمیں مذاحیہ ڈراموں کی طرف

رجوع کرنا پڑتا ہے۔

اسی طرح جن لوگوں کے دلوں میں مہمات سر کرنے اور مشکل کام انجام دینے کی تمنّا ہوتی ہے، وہ روزانہ کی پُرسکون زندگی سے دل تنگ ہوکر مہمّاتی افسانوں کو بہت زیادہ دلچسپی اور شوق سے دیکھتے ہیں۔ بعض لوگ سماج میں چمکنے کے دلدادہ ہوتے ہیں، لیکن حالات ان کی دلی آرزو پوری نہیں ہونے دیتے ایسے افراد اِن فلموں اور ناولوں کو فخرِ انتخاب بخشتے ہیں جن میں سوسائٹی کے درخشندہ ستاروں کے کارنامے پیش کئے جاتے ہیں، اس کے علاوہ ہزاروں اور لاکھوں آدمی ایسے ہیں جنہیں عاشقانہ زندگی بسر کرنے کا شوق ہے مگر سماج کی پابندیاں اور تہذیب کی مجبوریاں انہیں عشق و محبّت میں وارفتہ ہونے کی اجازت نہیں دیتیں، یہ لوگ ان فلموں سے دلبستگی رکھتے ہیں، جن میں حُسن و عشق کے ہنگامے دکھا کر نامُرادی کی زندگی کو شادمانی اور کامرانی کی ابتدا پر ختم کیا جاتا ہے، ڈراموں اور افسانوں وغیرہ کی پسندیدگی میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ہر شخص کی پسند اس کے دلی معاملات کی غمّاضی کرتی ہے۔ غالب ؎

کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اخلاق و عادات پر اثر | چونکہ سنیما دل و دماغ پر گہرا اثر کرتا ہے اس لئے دیکھنے والوں کے اخلاق و عادات پر بھی اس کا عکس پڑنا ضروری ہے،

اس کے علاوہ قدرت نے نقل و تقلید کا مادہ انسان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، وہ جس چیز کو پسند کرتا ہے خود بخود اس کی نقالی کرنے لگتا ہے، افسوس ہے کہ ہمارے فلم ساز انسان کی اس فطری خصوصیّت سے پورا پورا فائدہ نہیں اُٹھاتے وہ عموماً سطحی دلچسپی اور ظاہری نظر فریبی ہی کو اپنا مقصد آخر سمجھ لیتے ہیں، اگر ہماری فلم کمپنیاں اصلاحی نقطۂ نظر سے فلم تیار کرنے کی کوشش کریں اور سنجیدہ مذاق اور برگزیدہ اخلاق کو نمایاں اہمیت دیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ فلموں سے اخلاقی فوائد مرتب نہ ہوں، اور مُلک کی تہذیب کو اس سے حسب دلخواہ فائدہ نہ پہنچے۔

یورپ کی اکثر فلم ساز کمپنیاں ان عیوب سے پاک ہیں، وہ فلموں کی مدد سے اپنے مُلک کی حالت کو بہتر بنانے کی کوششیں ہمیشہ جاری رکھتی ہیں، ان کے فلموں کو دیکھ کر نوجوانوں کے ارادے مضبوط اور ہمتیں بلند ہوتی ہیں، برخلاف اس کے ہماری فلم کمپنیاں اخلاق کو پست اور جذبات رذیلہ کو بھڑکا کر شہرت حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ہمارے ملک کے اکثر نوجوان جن سے مُلک و ملّت کی بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں مخرب الاخلاق تصاویر کی بدولت جرائم پیشہ اور اوباش بن گئے ہیں اور بہت سے باعزت خاندانوں کے دل اس صنعت کے فیض سے داغ داغ ہیں۔

سنیما کے ان اثرات کو دیکھتے ہوئے پیشینگوئی کی جا سکتی ہے

کہ ایک نہ ایک دن وہ زمانہ ضرور آئیگا جب دُنیا کی طرز معاشرت اور اخلاق و عادات ایک جیسے ہو جائیں گے، ممکن ہے قدامت پسند لوگ اس پیشینگوئی کو سنکر کانپ اُٹھیں، اُنہیں یقین رکھنا چاہئیے کہ ان کی تہذیب واقعی قابلِ قدر ہے تو ہر نئی تہذیب سر جھکا کر اس کے لئے جگہ خالی کر دے گی۔ اور اگر وہ اس قابل نہیں تو ان کو ابھی سے اس کی فاتحہ پڑھ لینی چاہئیے۔

پُرانی تہذیب کو سراہنا اور نئی تہذیب کو بُرا کہنا بڑے بوڑھوں کی عادت میں شامل ہے، لیکن باوجود اس مخالفت کے دُنیا بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے اور بڑھتی چلی جائیگی، آخر کار افرادِ عالم ایک تہذیب پر متفق ہو جائیں گے اور سنیما کے اس کارنمایاں کو بنظر استحسان دیکھیں گے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کے ہر ضلعے میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، علیحدہ علیحدہ زبانوں اور گوناگوں رسم و رواج کے باعث ہر خطے کے لوگ دوسرے خطوں کے باشندوں سے غیر مانوس اور بے خبر ہیں، سنیما کی مقبولیت سے ہمیں یہ بھی توقع ہے کہ ہمارے سارے مُلک میں ایک زبان بولنے اور سمجھنے کی قابلیت بہت کم مدّت میں پیدا ہو جائیگی، اور بیشتر اختلافات خود بخود دُور ہو جائینگے، ہمیں افسوس ہے کہ ہماری فلم ساز کمپنیاں اس اہم قومی مقصد کو بالکل بھول گئی ہیں اگر وہ اس طرف توجّہ کریں تو ملک کی ایک بہت

بڑی ضرورت نہایت آسانی سے پوری ہو سکتی ہے۔

سینما کے ذریعہ تعلیم سینما کی اثر اندازی کو دیکھتے ہوئے ماہرین تعلیم متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سینما کے ذریعہ تعلیم دینا بہت دلچسپ اور زود اثر ہوگا۔ بعض لوگ فلمی طریقۂ تعلیم پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ طریقۂ تعلیم بہت زیادہ صرف طلب ہے، نیز طلبا کے دلوں میں وہ شوق اور ولولہ پیدا نہیں کر سکتا جو ایک معلّم اپنی حرکات و سکنات، ذاتی اثر اور علمی قابلیت سے پیدا کرتا ہے، علاوہ ازیں اس خطرے کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ فلم اُستاد کی جگہ لے لیگا۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ پبلک کا بہت سا روپیہ اکثر ایسے مقاصد پر صرف ہوتا ہے جن سے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوتا، اگر اس رقم خطیر کا عشر عشیر اس مفید کام پر صرف کیا جائے تو اس سے بہت زیادہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اُستاد کی جگہ چھین لینے کا خطرہ بھی بے بنیاد ہے، کیونکہ فلمی تعلیم محض کتابی تعلیم کی مُرادف ہے گویا اُستاد کی ضرورت اس کے باوجود باقی رہتی ہے پھر بھی اگر کوئی تعلیمی فلم اُستاد کی جگہ پر قبضہ کرنے کی جسارت کرتا ہے تو وہ اچھی قسم کا فلم کہلانے کا ہرگز سزاوار نہیں، اچھے علمی فلم کا مطلب یہ ہے کہ وہ معلّم کے لئے آسانیاں پیدا کرے، اور اس کی مشکلات کو حل کرتے ہوئے مزید علمی مواد بہم پہنچائے۔

فلمی تعلیم پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اس کے استعمال سے

طلباء میں مجہولیت پیدا ہو جانے کا امکان ہے یہ خطرہ اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب علمی فلموں کی نمائش طلباء کو سست اور مجہول بنا دے، چونکہ فلم کی نمائش ہمیشہ حیرت اور دلچسپی پیدا کرتی ہے اس لئے مجہولیت پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سنیما کا سب سے نمایاں تعلیمی پہلو یہ ہے کہ ہم دوسرے ملکوں کا طرز معاشرت اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، نیز وہ کیفیتیں جن کا نقشہ کھینچنے سے الفاظ عاجز اور ان کی خیالی تصاویر قوت بیانیہ پیش کرنے سے قاصر ہے سنیما فلم ان کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے جیسے ہم اسی ماحول میں چل پھر رہے ہیں، اس کے علاوہ ایک تعلیم یافتہ شخص کسی نہ کسی حد تک کتابیں وغیرہ پڑھ کر غیر ملکی تمدن اور حالات سے واقف ہو سکتا ہے، لیکن ایک ان پڑھ یا جاہل اپنے گھر کی چاردیواری میں کوئیں کے مینڈک کی طرح گردوپیش کے حالات سے بالکل بے خبر رہتا ہے، سنیما فلم ایسے لوگوں کی واقفیت بڑھانے اور زاویۂ نظر کو وسیع کرنے میں نہایت قابل معلّم کا کام دیتا ہے، نیز وہ باتیں جو سمجھانے سمجھ میں نہیں آتیں سنیما کے پردے پر دیکھ کر ہر قسم کی قابلیت کا انسان آسانی سے اخذ کر لیتا ہے۔

فلم اور سائنس | سائنس کی ترقی اور علم کی روز افزوں روشنی سے پرانے نظریوں میں انقلابات رونما ہو رہے ہیں، لیکن باوجود ان تبدیلیوں کے ہمارے اہل ملک سائنس کے فوائد اور اس کے کارناموں سے

پوری طرح واقف نہیں، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم وہ ذرائع اختیار کریں جن سے سائنس کی روشنی دُور دُور تک پھیلے اور ہر شخص اس کے عملی فوائد سے اچھی طرح واقف ہو جائے، ظاہر ہے یہ کام محض فلموں ہی سے لیا جا سکتا ہے کیونکہ قدرت نے ان کو دلچسپی اور ایپنی کی صفات بخشی ہیں۔

افسوس ہے ہمارے ماہرینِ تعلیم ابھی تک اس طرف متوجہ نہیں ہوئے ورنہ فلموں کے ذریعہ وہ محیّر العقول کرشمے اور دلچسپ تجربات بہت آسانی سے دکھائے جا سکتے ہیں جن کو عملی طور پر دکھانے میں مختلف قسم کی دقّتیں پیش آتی ہیں اور کتابی تفسیریں ان کو سمجھنے میں مشکل کفایت کرتی ہیں۔

ریاضیات | ریاضیات اور سائنس کے اِن شعبوں میں جن کا انحصار ریاضیات پر ہے، بعض اوقات بڑی دقّتوں کا سامنا ہوتا ہے اکثر مسئلوں کو فرضی اشکال سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور جو کچھ کامیابی ہوتی ہے وہ محض فرضی کہلاتی ہے سنیما اس فرضی خلا کو نہایت آسانی سے پُر کر کے ان لوگوں کی پوری پوری رہنمائی کر سکتا ہے جن کی بصارت متخیلہ نسبتاً کمزور واقع ہوئی ہے۔

ریاضیات کے بعض مسائل ایسے ہیں جنہیں نظر فریبی اور زیادہ پیچیدہ بنا کر طالب علم کے دماغ کو معطّل کر دیتی ہے عموماً ان مسائل کو سمجھانے کے لیے اُستاد کو ماڈل تیار کرنا پڑتا ہے، اگر ماڈل بنانا

ممکن نہ ہو تو پھر ہر بات فرض کر لی جاتی ہے، گویا نتائج بھی فرضی ہی برآمد ہوتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ طالب علم مشکل سے مشکل سوالات فرضی طور پر صحیح حل کر لیتا ہے، لیکن جب کسی مسئلے سے عملاً سابقہ پڑتا ہے تو اس کا قیافہ اور عقل مدد کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔

اس کے علاوہ ریاضیات سے متعلق بعض قدرتی مسائل ایسے ہیں جن میں محض زبانی جمع خرچ سے کام لیا جاتا ہے اور طالب علم کسی بات کی اصلیت سے واقف نہیں ہوتا ویسے وہ جانتا سب کچھ ہے مثلاً رات اور دن کے برابر ہونے کا عمل، کسی سیارے کی ارضی اور سماوی ہم درجگی، اور اس کے معلق لٹکنے کے اسباب وغیرہ ایسے مباحث ہیں جن کی محض نظری تعلیم دی جاتی ہے، اگر فلم کو اس مفید کام میں صرف کیا جائے تو یہ مسئلے ایک اور ایک دو کی طرح سمجھائے جا سکتے ہیں۔

علم الحیات | جس طرح ریاضیات کے بہت سے ٹیڑھے مسئلے فلم کے ذریعہ بہت آسانی سے حل ہو سکتے ہیں، اسی طرح علم الحیات کی تعلیم میں بھی فلم سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، علم الحیات کے متعلق فلموں میں ایسے مسائل کو محفوظ کر سکتے ہیں جن کو ہر شخص آلات کی مدد کے بغیر ہرگز دیکھ نہیں سکتا، علم الحیات کا مطالعہ کرنے کے لئے دور دراز کے ممالک میں جانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اور اگر پہنچ بھی جائے تو مطالعہ اور مشاہدہ کے لئے ایک طویل مدت تک

سرگردانی اور کاوش کرنی پڑتی ہے، اگر فلموں سے یہ کام لیا جائے، تو گھر بیٹھے علم الحیات کی تکمیل ہو سکتی ہے، بیشک یہ بہت مشکل کام ہے لیکن ماہرین کی نگرانی میں منتشر اور بکھرے ہوئے حالات کو مرتب کر کے چلتی پھرتی تصویروں کی ایک مکمّل کتاب تیار کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔

علم الحیات سے متعلق فلم طلباء کو چھوڑ کر عوام کے لئے بھی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں، کیونکہ کوئی شخص چاہے وہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے کسی حیوان کی زندگی سے پوری طرح پر واقف نہیں ہو سکتا یہ فلم عدم واقفیّت کے خلاؤں کو پُر کر کے ان مقامات پر جہاں قوّت بیانیہ اظہار حقیقت کا ساتھ نہیں دیتی اصلیّت کو دکھا سکتے ہیں۔

علم الحیات کے تمام شعبوں میں نشو و نما کا مطالعہ بہت زیادہ اہمیّت رکھتا ہے لیکن انسان اس کو پوری طرح نہیں دیکھ سکتا۔ فلم ایسی مشکلات کا بہترین حل ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کیمرہ ہر موقعہ پر کام نہیں دے سکتا، یہ بالکل ٹھیک ہے جہاں کیمرہ کام نہ دے وہاں ہاتھ کی تصویریں خلا کو پورا کر سکتی ہیں، مثلاً آج سے چند سال پہلے کسی شخص کو یہ معلوم نہ تھا کہ ماں کے پیٹ میں بچّے پر کیا گزرتی ہے، اور اب بھی بچّے کی کیفیّتیں اکثر افراد کو معلوم نہیں، اگر بچّے کی نشو و نما کے فلم تیار کر لئے جائیں تو ہر شخص

انسانی زندگی کے ابتدائی مراحل سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے۔

بعض عملوں کو اصل کی نسبت فلم پر زیادہ وضاحت سے دکھایا جاسکتا ہے، کیونکہ زیادہ طاقت کے شیشے معملوں میں عام طور پر بلا تسر نہیں آسکتے۔ معملوں کے تجربوں میں ہمیشہ یہ کمی رہتی ہے کہ طلبا بحیثیت مجموعی کسی عمل کا مطالعہ نہیں کر سکتے سنیما فلم اس کوتاہی کا بہترین علاج ہے، جراحی کے مشکل اور پیچیدہ عمل بھی فلم کی امداد سے بہت آسان ہو سکتے ہیں اور نہ صرف طلبا بلکہ عوام کی دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں۔

علم طبیعات | علم الطبیعات کی تعلیم میں بھی سنیما فلم کے استعمال سے بہت امداد مل سکتی ہے۔ مثلاً اگر طبیعاتی فلم تیار کر لئے جائیں، تو معملوں میں بہت سے قیمتی کمیاب اور مخصوص آلات اور سازو سامان کی ضرورت باقی نہیں رہتی، گویا اس قسم کے فلموں کے رواج سے معملوں کے اخراجات میں بہت کمی ہو سکتی ہے۔ علم طبیعیات کے بعض تجربات کی نمائش میں معلمین اور طلبا کا بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے، اور پھر بھی وہ سو فیصدی کامیاب نہیں ہوتے بعض ایسے تجربات ہیں جن کو معملوں میں نہیں دکھایا جاسکتا، اس لئے کتابی معلومات پر قناعت کرنی پڑتی ہے، یہ تو عام طور پر شکایت ہے کہ اکثر تجربات محض ایک ہی مرتبہ دکھائے جاتے ہیں، طبیعیاتی تجربات کے فلم ایسی دقتوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دینگے، اور طلبا کو ضروری

تجربات بار بار دیکھنے کا موقع مل سکے گا، اس کے علاوہ بہت سے تجربات ہر طالب علم کو فرداً فرداً دکھانے پڑتے ہیں، سنیما فلم اس دقت کا بہترین علاج ثابت ہونگے، ظاہر ہے فلمی طریقۂ تعلیم کو اختیار کرنے سے بہت کافی روپیہ، محنت اور وقت بچ سکتا ہے جو یقیناً کسی دوسرے مفید مقصد کے لئے کام آسکتا ہے۔

فلم کے ذریعہ ارضیاتی طبیعیات کے تجربوں میں غیر مرئی مناظر کو بھی ایک اور ایک دو کی طرح دکھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً وائرلیس کے عمل کو ہم آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے لیکن فلم اس غیر مرئی عمل کو ہمیں اچھی طرح دکھا سکتا ہے، اس کے علاوہ بعض ایسے قدرتی مناظر کو بھی دکھایا جا سکتا ہے، جو عام طور پر ہماری حد نظر سے پرے واقع ہوتے ہیں، اور ان کو دیکھنے کے لئے بڑے بڑے قیمتی آلات کی ضرورت پڑتی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ تعلیمی فلم نہ صرف طلبا کے شوق تعلیم کو مشتعل کرینگے بلکہ ان کے دل و دماغ پر زیادہ گہرے اور پائیدار نقوش ثبت کر دینگے۔

زراعت ہر پڑھا لکھا شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ فن زراعت میں بہت سے فنون اور سائنس کی مختلف شاخوں سے مدد لی جاتی ہے، ہمارے اَن پڑھ کاشتکار اگرچہ زراعت سے متعلق تمام عملوں کو جانتے ہیں لیکن ان کی حقیقت سے واقف نہیں، اس لئے طرح

طرح کے توہمات انکے دلوں میں پیدا ہو گئے ہیں، اگر زرعیات کی فلم کے ذریعہ تعلیم دی جائے تو بہت سے مفید مسئلے کاشتکاروں کے ذہن نشین کرلئے جاسکتے ہیں، اس کے علاوہ ہندوستان کی زرعی پیداوار روز افزوں آبادی کی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر ہے۔ اور ہماری صنعت و حرفت ابھی پوری طرح ترقی نہیں کر سکی، اس لئے ضرورت ہے کہ زمین کی طاقت کو بڑھایا جائے اور کمزور زمین کی قوت کو بحال رکھنے کی کوشش کی جائے، ظاہر ہے یہ کام سائنس ہی کی مدد سے انجام پا سکتا ہے، اگر ہم زراعت کو فروغ دینے کے لئے ایسے فلم تیار کرلیں جو کاشتکاری کے نئے طریقے، پودوں کی نشو و نما کی مخصوص اندرونی اور بیرونی کیفیتیں دکھائیں تو کاشتکاروں اور زمینداروں کو زرعی تعلیم بہت آسانی سے دی جاسکتی ہے۔

ٹیلی ویژن اور سینما ٹیلی ویژن ہندوستان والوں کے لئے ابھی ایک عجوبہ چیز ہے، لیکن انگلستان میں اس حیرت انگیز ایجاد کے متعلق حیرت کا خاتمہ ہو چکا ہے، وہاں ٹیلی ویژن تقریباً اسی طرح عمومیت اور مقبولیت اختیار کر رہا ہے جیسے ہمارے ملک میں ریڈیو، اہلِ یورپ کا خیال ہے کہ ترقی کی دوڑ میں ٹیلی ویژن سینما سے آگے نکل جائیگا، ہر سینما ہال میں فلموں کی بجائے ٹیلی ویژن کے پروگرام دکھائے جائینگے اور بیسویں صدی کی یہ محیر العقول ایجاد تفریحی دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیگی، یقین کیا جاتا ہے کہ ٹیلی ویژن کی

ترقی سے سنیما کی حیثیت بالکل ایسی رہ جائیگی جیسی ریڈیو کی مقبولیت سے گراموفون کی ہوگئی ہے بلکہ کوئی تعجب نہیں کہ فلم غیر دلچسپ قرار دیدیئے جائیں اور ٹیلی ویژن ان کی نمائش گاہوں پر قبضہ کرلے۔

آج کل سنیما ہالوں میں خبروں کے فلم، کارٹون فلم اور کوئی عشقیہ افسانہ دکھاکر شائقین کو خوش کیا جاتا ہے، ٹیلی ویژن کی ترویج سے یہ پرانی عادت بدل کر تفریحی شوق کہیں سے کہیں پہنچ جائیگا. کیونکہ واقعات حاضرہ کے دکھانے میں فلم ٹیلی ویژن سے بہتر کام نہیں دے سکتا، اس کا صحیح اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنہیں گھر بیٹھے بعض اہم واقعات بچشم خود دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، یہ مسلمہ امر ہے کہ ریڈیو کے ذریعہ بعض واقعات کی رپورٹ سننے، سنیما ہالوں میں فلم گزٹ دیکھنے اور اخباروں کے نمایندوں کی خیال آرائیوں کے پڑھنے سے وہ مزہ ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا جو ٹیلی ویژن سے بچشم خود دیکھنے اور بگوش خود سننے میں آسکتا ہے، نیز فلم کے ذریعہ واقعات سابقہ معلومات کی روشنی میں ان اہم تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں جو احاطہ تحریر میں نہیں آسکتیں، لیکن ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہم پورے واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں، گویا ٹیلی ویژن شخصی بعد اور عدم واقفیت کو کماحقہ دور کرتا ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھے ہوتے ہیں کہ سنیما اور ٹیلی ویژن آپس میں حریف

اور مدّ مقابل ہیں، حقیقت میں یہ دونوں دَور حاضر کی تفریحات کے دو مختلف شعبے ہیں، ان کی ترقی اور دلچسپی کی مخصوص راہیں ایکدوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں، اس لئے قوی امید ہے کہ ان میں سے ایک صنعت کی ترقی دوسری صنعت کو نقصان نہیں پہنچاتے گی، ہاں ٹیلی ویژن کی توسیع و ترقی سے تفریحی دُنیا میں کچھ انقلابات ضرور رونما ہوں گے، مثلاً تھیٹروں اور سنیما ہالوں میں محض ٹیلی ویژن پروگرام عوام کی تفریح اور دلچسپی کا ذریعہ بن جائیں گے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ فلم بالکل مسترد کر دیئے جائیں گے، فلم والوں کو اپنے لئے دلچسپی اور تفریح کے ایسے نئے سامان مہیّا کرنے پڑینگے جو ٹیلی ویژن کی دسترس سے باہر ہونگے، مفکرین کا اندازہ ہے کہ ٹیلی ویژن کی مقبولیّت سے تھیٹروں پر بھی کوئی بُرا اثر نہیں پڑیگا، اداکاروں کی شخصی کشش اور ان کی اداکاری کے کمالات شائقین کو بدستور اپنی طرف متوجہ رکھینگے، بلکہ امید ہے کہ تھیٹروں کی کھوئی ہوئی عظمت اور دلچسپی ازسرنو پیدا ہو جائیگی

کتنا غلط خیال ہے کہ ٹیلی ویژن کا عروج فلم کی صنعت کا بالکل خاتمہ کر دیگا، انگلستان میں فلم کمپنیوں کے ذہین ڈائرکٹر، ڈرامہ نویس اور اداکار ٹیلی ویژن کے پروگراموں کا بغور مطالعہ کر کے اپنی نظر کو وسعت اور فنّی قابلیّت کو ترقی دینے میں مشغول ہیں، اس طرح سے انہیں کوئی نہ کوئی صاحب جوہر اداکار، کسی عمدہ کہانی کا مواد اور دیگر مفید معلومات بغیر کسی صرف اور دقّت کے حاصل ہوتی رہتی

ہیں، ورنہ معمولی معمولی تجربے کرنے میں تضییع اوقات کے علاوہ بیحد و حساب روپیہ صرف ہو جاتا تھا۔

بعض بے بنیاد خطرات کے باعث لندن کے سنیما والوں نے براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس عدم تعاون سے ٹیلی ویژن کو نقصان بھی پہنچتا ہے یا نہیں، ظاہر ہے ٹیلی ویژن کے لیئے سنیما فلم لوازمات میں سے نہیں ہیں، فلموں کی امداد کے بغیر بھی ٹیلی ویژن پروگرام نہایت دلچسپ اور دلکش بنائے جا سکتے ہیں، اس لیئے ہمارا فرض ہے کہ فلم اور ٹیلی ویژن میں اتحاد اور تعاون پیدا کرنے کی کوشش کریں تاکہ یہ دونوں مفید صنعتیں جو تفریحات کے دو علیحدہ علیحدہ شعبے ہونے کے باوجود ایک ہیں، ایک دوسرے کے مدمقابل اور حریف نہ بن جائیں۔

ریڈیو

سائنس کی ہر نئی ایجاد کے بعد یہی گمان گزرتا ہے کہ اس کے بعد کسی اور محیرّ العقول ایجاد کی گنجائش نہیں رہی، لیکن چند دن گزرنے نہیں پاتے کہ اس سے بھی حیرت افزا ایجاد نظروں کو خیرہ اور دماغوں پر حیرت کا عالم طاری کر دیتی ہے۔

ٹیلی فون، ہوائی جہاز، موٹر کاریں اور وائر لیس وغیرہ ہماری بیسویں صدی کی اسی قسم کی ایجادات ہیں جن سے عقل انسانی دنگ ہے، ان سب میں وائر لیس کو بہت زیادہ اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے۔

وائر لیس کا موجد

وائر لیس موجد "مارکونی" اٹلی کا باشندہ تھا، اس کا انتقال تقریباً ۶۳ سال کی عمر میں جولائی ۱۹۳۷ء میں ہوا ہے، کہتے ہیں مارکونی کی ابتدائی تعلیم نہایت معمولی تھی، لیکن شروع ہی سے بجلی کے کام سے بہت دلچسپی تھی، یورپ کے بڑے بڑے سائنسدان مدّتوں سے تجربے اور کوششیں کر رہے تھے کہ برقی لہروں سے پیغام رسانی کا کام لیں اور اقلیم سائنس کے تاجدار کہلائیں، مگر قدرت نے یہ فخر مارکونی کے لئے محفوظ رکھا تھا، چنانچہ وہ پہلا شخص ہے جس نے برقی لہروں کے ذریعے پیغام رسانی کی، شروع میں مارکونی کو

محض نو میل تک پیغام رسانی کرنے میں کامیابی ہوئی مگر آہستہ آہستہ اس فاصلے میں اضافہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کا بُعد محض برائے نام باقی رہ گیا۔

اٹلی کی حکومت نے مارکونی کی بہت زیادہ عزت افزائی کی، کیوں نہ ہو وہ سائنسدانوں کا تاجدار اور بیسویں صدی کے لئے باعثِ فخر تھا۔ ۱۹۰۹ء میں اسے فزکس کا نوبل پرائیز دیا گیا۔

ریڈیو | وائرلیس کی مزید ترقی ریڈیو کی تخلیق کا باعث ہوئی، ریڈیو کے ذریعہ ہم دُور دراز فاصلوں سے اس طرح بات چیت کر سکتے ہیں جس طرح آمنے سامنے بیٹھے ہیں، اس ایجاد سے تمام دُنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا اور حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی، جب ہم لوگ ریڈیو سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو معاً دل میں یہی خیال آتا ہے کہ ہم بہت ہی خوش قسمت ہیں، ہمارے دورِ زندگی میں ایک ایسی انوکھی ایجاد ہوئی ہے جو کبھی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی، لیکن ہمیں کیا پتہ کہ سائنسدان اس سے بھی زیادہ انوکھی اور حیرت افزا ایجاد کی فکر میں ہیں، خیال کیا جاتا ہے کہ ٹیلی ویژن وائرلیس کا آخری کارنامہ ہوگا، بالکل ممکن ہے کہ سائنس کے اتھاہ سمندر سے کوئی اور پیراک اس سے بھی زیادہ بے مثل موتی نکال لائے۔

بہر حال یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سنہ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں انگلستان سے موسیقی کا سب سے پہلا پروگرام نشر ہوا،

اور ۱۹۲۲ء میں باقاعدہ طور پر برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کا قیام عمل میں آیا۔

ہندوستان میں سب سے پہلے کلکتہ، بمبئی، مدراس، رنگون اور کراچی میں ریڈیو کلب قائم کئے گئے، ان ہندوستانی سٹیشنوں کی قوّتِ نشر بہت کم تھی اس لئے دُور دراز شہروں کے باشندے ان کے پروگرام سے لطف اندوز نہ ہو سکتے تھے، اس کے علاوہ ریڈیو سٹوں کی قیمتیں بھی بہت زیادہ تھیں، یعنی یہ تفریح اوسط درجے کے آدمیوں کے لئے نہ تھی محض اُمراء اور رؤساء ہی اس سے لطف اُٹھا سکتے تھے، ان کلبوں کو حکومت بطور امداد کچھ رقم سالانہ دیا کرتی تھی، بعض ریاستیں بھی ان کی مالی امداد کرتی تھیں، گویا ان کلبوں کا قیام اور نظام عام طور پر پبلک کے ہاتھ میں تھا۔

بمبئی ریڈیو سٹیشن سے اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں پروگرام نشر ہوتے تھے، اس کلب کی مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے ۱۹۳۰ء میں اس کا خاتمہ ہو گیا، اس ناکامیابی کے بعد کسی اور کمپنی کو حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ اس کام کو دوبارہ سنبھالنے کا بیڑا اُٹھائے، آخر کار حکومتِ ہند نے یہ فرض اپنے ذمہ لیا لیکن تھوڑی مُدّت کے بعد حکومت نے کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ بمبئی سٹیشن بند کر دیا جائے کیونکہ مالی حالت بہت ہی ہمّت شکن تھی، اور حکومت اپنے اندازے سے زیادہ روپیہ صرف کرنے کو تیار نہ تھی۔

یہ ایک بالکل اتفاقی بات تھی کہ ریڈیو ہمارے ملک میں آپ ہی آپ مقبول ہونے لگا۔ ایک دم وائرلیس سیٹوں کی درآمد بڑھ گئی اور اس طرح سے حکومت ہند کے ہاتھ میں براڈکاسٹنگ کی ترقی اور توسیع کے لئے ایک معقول رقم آگئی، حکومت کے مردہ ارادے پھر سے زندہ ہو گئے، آخرکار غور و خوض کے بعد ۱۹۳۶ء جنوری میں تقریباً چالیس لاکھ کے سرمایہ سے دہلی میں ایک زیادہ طاقت کا سٹیشن جاری کیا گیا۔

ظاہر ہے ہندوستان جیسے طویل و عریض ملک میں ریڈیو کو مقبول بنانے کے لئے یہ رقم بہت ہی کم تھی، لیکن حکومت نے اس ہمت شکن مہم کو نہایت ہی قلیل مدت میں بہت زیادہ کامیابی کے ساتھ سر کرلیا، چنانچہ اس وقت ریڈیو کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ دہلی کے علاوہ پشاور، لکھنؤ، لاہور، کلکتہ، مدراس، بمبئی وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں ریڈیو سٹیشن جاری ہو چکے ہیں، اور دیگر مشہور و معروف مقامات پر مزید سٹیشن جاری کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، اُمید کی جاتی ہے کہ آئندہ چند سالوں میں سرزمین ہندوستان پر ریڈیو سٹیشنوں کا جال بچھ جائیگا۔

ریڈیو کی زبان | ہمارے ملک میں ریڈیو کی فنی اور صنعتی مشکلات کو چھوڑ کر سب سے زیادہ ٹیڑھا مسئلہ ریڈیو کی زبان کا ہے، ہندوستان کے ہر صوبے میں کئی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ زبان

کا مسئلہ ریڈیو کی ترقی میں سب سے زیادہ حائل ہے، ماننا پڑیگا کہ اس میں حقیقت اور صداقت دونوں شامل ہیں، اگر ہندوستان میں ایک زبان بولی اور سمجھی جاتی تو بہت کم ریڈیو سٹیشنوں اور قلیل سرمایہ سے کام چل سکتا تھا، لیکن زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے ہر صوبے میں ریڈیو سٹیشن قائم کرنا ضروری ہوگیا ہے کیونکہ یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ریڈیو سے ہر صوبے کو برابر کا فائدہ نہ پہنچے۔

مدت دراز سے ہندوستان کے مفکرین اسی فکر میں ہیں کہ ہندوستان میں ایک ایسی زبان رائج ہو جائے جو ہر صوبے میں بولی اور سمجھی جاسکے، اور قومی زبان کہلائے، قومی زبان کی ترویج کے ساتھ ہمارے ملک کی بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں، اُمید کی جاتی ہے کہ قومی زبان سے باہمی نااتفاقیاں اور آئے دن کے جھگڑے فساد دُور ہو جائیں گے، تجارت اور صنعت و حرفت میں مزید ترقیاں ہونگی اور ہندوستان کے دامن سے یہ دھبّہ دُور ہو جائیگا کہ یہاں کوئی قومی زبان نہیں، ریڈیو اسی خواب شیریں کی تعبیر ہے، اس کی مقبولیت سے ملکی زبان پیدا ہونے کے امکانات بڑھ گئے ہیں اور اُمید ہے کہ نہایت قلیل عرصے میں ریڈیو کی توسیع کے ساتھ ساتھ ایک ایسی زبان خود بخود پیدا ہوتی چلی جائیگی جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جائیگی اور ہندوستانی کہلائے گی، مختلف قومی زبانوں کے لئے ہر مرکزی مقام پر ریڈیو سٹیشن جاری کرنے سے یقیناً یہ مدعا ذرا دیر میں

حاصل ہوگا کیونکہ مادری زبان کو دلچسپی اور شوق سے سُننے کا مادہ انسان کی طبیعت میں فطری طور پر موجود ہے، بہر حال مایوسی گناہ ہے، اُمید کہتی ہے کہ ریڈیو کی امداد سے وہ دن قریب تر آرہا ہے جب سارے ہندوستان میں ایک قومی زبان ہو گی، ایک تمدّن ہو گا، نیز تفرقہ پردازی اور آویزشیں ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائیں گی۔

سیاسیات اور ریڈیو شروع شروع میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ حکومت ریڈیو کے ذریعہ اپنا پروپاگنڈہ کیا کرے گی، یا جو سیاسی پارٹی برسر اقتدار ہو گی وہ ریڈیو سے حسب دلخواہ فائدہ اُٹھائے گی، اِس قسم کی چیرہ دستیوں اور ان کے نتائج بد کو محسوس کرتے ہوئے حکومت نے یہ فیصلہ کر کے کمال دانشمندی کا ثبوت دیا کہ ریڈیو کسی حالت میں بھی سیاسی پروپگنڈے کے لئے استعمال نہیں کیا جائیگا۔ بلکہ حکومتِ ہند بھی اس سے سرکاری پروپگنڈے کا کام نہیں لے گی، ظاہر ہے اگر ریڈیو سٹیشنوں کو سیاسیات کا اکھاڑا بنا دیا جاتا تو ہندوستان میں اب تک کئی مرتبہ سیاسی انقلابات رُونما ہو چکتے اور ریڈیو سے بجائے فائدہ پہنچنے کے مُلک کو اتنا شدید نقصان پہنچتا کہ صدیوں تک اس کی تلافی ممکن نہ ہو سکتی۔

سر دست سیاسیات میں ریڈیو کے محکمے کی پالیسی یہ ہے کہ

ہر سیاسی اور اختلافی مسئلے کے متعلق مختلف پارٹیوں کے خیالات کا اظہار کر دیا جاتا ہے اور اپنی طرف سے کسی قسم رائے زنی اور نکتہ چینی نہیں کی جاتی، گویا سیاسی معاملات میں محکمہ ریڈیو کا مسلک بالکل غیر جانبدارانہ اور صلح کل ہے اور یہی اس کی ترقی اور مقبولیت کی دلیل ہے۔

ریڈیو پروگرام | جب سے ریڈیو کا محکمہ حکومت ہند کی سرپرستی میں جاری ہوا ہے، اُس وقت سے لے کر اب تک ریڈیو کے پروگرام پر مسلسل نکتہ چینی ہو رہی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے نے بہت زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے، محکمہ ریڈیو کے ذمہ دار کارکن سخت مخمصے میں پڑ گئے ہیں اور حیران ہیں کہ یہ مسئلہ کیونکر حل کیا جائے تاکہ ان کے پروگرام پسندیدگی کے کانوں سے سُنے جائیں، افسوس یہ ہے کہ باوجود انتہائی کوششوں کے اس بارے میں عشر عشیر کامیابی بھی نہیں ہوئی اور نہ ہونے کی توقع ہو سکتی ہے کیونکہ اوّل تو سب کو خوش کرنا ہی ناممکن ہے، دوسرے کارکنوں کی ناتجربہ کاری، سہل انگاری اور کسی حد تک خود غرضی اعلےٰ معیار تک پہنچنے میں سدراہ ہے، بہرحال مسلسل اعتراضات سے بچنے کے لئے اب مختلف ریڈیو سٹیشنوں کے پروگراموں کو اس طرح مرتب کیا جاتا ہے کہ اگر کسی ایک سٹیشن کا پروگرام طبع سلیم پر ناگوار گزرے، تو کسی دوسرے سٹیشن کا پروگرام سُن لیا جائے اور اگر وہ بھی ناپسند ہو تو

اور سٹیشنوں کو ٹٹولا جائے، سخت افسوس ہے کہ اکثر اوقات کسی ایک سٹیشن سے بھی دلپذیر آواز نہیں سُنائی دیتی، اور آخرکار مایوس ہوکر ریڈیو سٹ کو بند کر دینا پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ صبح شام کے پروگرام کی نسبت دوپہر کے ریکارڈوں کا پروگرام زیادہ پسند کرتے ہیں، لیکن بسا اوقات وہ بھی مایوس کن ہوتا ہے حقیقت امر یہ ہے کہ پروگرام کا سلسلہ بہت ٹیڑھا ہے، اور ریڈیو والوں کا یہ جواب ماننا ہی پڑتا ہے کہ پروگرام مرتب کرتے وقت انہیں عمدہ گانے والوں کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے مذاق اور مذہبی نمائندگی کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے، جس سے پروگرام باوجود انتہائی کوششوں کے خراب ہو جاتا ہے، ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں عوام کی چیخ پکار کا خاطرخواہ نتیجہ برآمد ہو اور ہندوستان کے ہر ریڈیو سٹیشن کے پروگرام اس قدر دلچسپ مرتب ہونے لگیں کہ جائز شکایات دُور ہو جائیں۔

ریڈیو اور موسیقی | ہمارے ملک کے تمام ریڈیو سٹیشن عام طور پر اپنی توجہ موسیقی پر مرکوز رکھتے ہیں، تعلیم و تربیت اور اصلاح و فلاح کے مفید کاموں پر بہت کم وقت صرف کیا جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ موسیقی رُوح کی غذا ہے بلکہ دُنیا خود ساز فطرت کا ایک دلکش نغمہ ہے، لیکن عملی دُنیا میں موسیقی کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی آٹے میں نمک کی، مگر یہاں حال یہ ہے کہ تین گھنٹے صبح کو دو گھنٹے دوپہر کو

اور پانچ گھنٹے شام کو گانا ہی گانا ہوتا رہتا ہے، مفکّرین کے نزدیک ریڈیو پروگرام کا یہ بد ترین پہلو ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ریڈیو کو محض لہو ولعب کے لئے استعمال نہ کیا جائے بلکہ اس سے تعلیم و تعلّم اور فلاح و بہبود کا کام بھی لیا جائے۔ جو لوگ تجارت اور زراعت پیشہ ہیں ان کے لئے مفید مطلب پروگرام بنائے جائیں تفریح طبع کے پروگرام الگ ہوں۔ عورتوں کی تہذیب و تربیت اور دلچسپی کے لئے ایک خاص وقت مقرر ہو، بچّوں کے ذہنی ارتقاء اور واقفیّت عامہ بڑھانے کے علیحدہ پروگرام ہوں، غرض ریڈیو پروگرام ہر حیثیّت سے اس قدر مرغوب، دلچسپ اور کار آمد ہو کہ ہر شخص ریڈیو کے بغیر اپنے آپ کو بہرا خیال کرنے لگے۔

ٹیلی ویژن | بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ ریڈیو بیسویں صدی کی بہترین اور آخری ایجاد ہے لیکن ٹیلی ویژن نے ثابت کر دیا کہ ابھی ترقی کا بہت وسیع میدان ہمارے سامنے موجود ہے۔ یورپ اور امریکہ کے سائنسدان اس کوشش میں ہیں کہ ٹیلی ویژن کو بھی ریڈیو کی طرح مقبول بنائیں، اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت صرف سو میل تک ٹیلی ویژن کام دے سکتا ہے، مسلسل اور ان تھک کوششیں جاری ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ٹیلی ویژن تمام روئے زمین پر جاری و ساری ہو جائے اور ٹیلی ویژن کے سٹوڈیو میں کام کرنے والے ہزاروں میل کے فصل سے متحرک تصاویر کی طرح چلتے پھرتے نظر آئیں۔

ظاہر ہے کہ یہ ایجاد بیسویں صدی کی بہترین ایجادوں میں سے ہوگی، سائنس کی ترقی کو دیکھتے ہوئے ہم اس ایجاد کو آخری ایجاد کہتے ہوئے ڈرتے ہیں، بالکل ممکن ہے کہ اس سے بھی بہتر کوئی چیز ایجاد ہو جائے جو بیسویں صدی کی سب سے بہتر ایجاد کہلائے اور ہمارے دعوے کو غلط ثابت کر دے۔

ٹیلی ویژن کے رواج سے زندگی کا ایک نیا دور شروع ہونے کی امید ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دَور زندگی کی گوناگوں دلچسپیوں سے مملو ہوگا، بعض کا خیال ہے کہ ٹیلی ویژن سے صنعت فلم سازی کو سخت خطرات درپیش ہیں کیونکہ فلم سازی کی صنعت ہمارے ملک میں ابھی اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے اور ملک کا بیشمار روپیہ اس میں لگا ہوا ہے اس لئے اگر ٹیلی ویژن نے فلم کے میدان پر قبضہ کر لیا تو فلم سازی کا خاتمہ ہو جائیگا، اور ملکی سرمایہ کو شدید نقصان پہنچے گا، فلم ساز کمپنیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قبل از وقت اپنے لئے نیا میدانِ عمل تلاش کریں تاکہ عین وقت پر بغلیں نہ جھانکنی پڑیں، کیونکہ اگر صنعت فلم سازی ٹیلی ویژن سے مرعوب ہو گئی تو ہزاروں آدمی بیکار ہو جائینگے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیلی ویژن کی ترویج روزی پیدا کرنے کے لئے نئے نئے راستے کھول دے گی، لیکن پھر بھی ایک دم اتنے زیادہ افراد کو اس نئی صنعت سے مفید ہونے کے لئے ایک مدت درکار ہوگی۔

ریڈیو سازی | ہمارے ملک میں ابھی تک ریڈیو سٹ بنانیکی فیکٹریاں
جاری نہیں کی گئیں، عام طور پر ریڈیو سٹ یورپ اور امریکہ سے
آکر بہت گراں قیمت پر فروخت ہوتے ہیں، سُنا ہے صوبۂ مدراس
میں ایک فیکٹری جاری ہوئی ہے جو ریڈیو سٹ کے پُرزے
منگا کر اپنے کارخانے میں ریڈیو سٹ تیار کرتی ہے، اس طرح
سے بہت ہی کم قیمت پر ریڈیو سٹ تیار ہو جاتا ہے، ابتدائی
حالات میں یہ بات بھی بہت غنیمت ہے، بالکل ممکن ہے کہ آیندہ
سالوں میں پُرزے بھی اپنے ملک میں تیار ہونے لگیں اور ریڈیو کی
صنعت پر ہمارا ملک اس طرح قابض ہو جائے جس طرح گراموفون
اور ہارمونیم وغیرہ کی صنعتوں پر ہے، اس وقت نہایت ضروری ہے
کہ ریڈیو انجینیری سیکھنے کے لئے قابل اور ہوشیار طالب علموں کو یورپ
اور امریکہ بھیجا جائے تاکہ وہاں کام سیکھ کر وہ اپنے ملک میں ریڈیو سازی
کی فیکٹریاں کھولیں اور روزگار کے نئے راستے پیدا کریں، ریڈیو کی
مقبولیت زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ عنقریب ریڈیو ہر شخص کے لئے
ناگزیر ہو جائیگا، اس لئے ریڈیو سازی کی طرف تعلیم یافتہ نوجوانوں اور
سرمایہ داروں کو بہت جلد متوجہ ہونا چاہیے۔

ریڈیو کے فوائد | افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ملک میں ریڈیو کا تعارف
بہت ہی غلط طریقے سے کرایا گیا ہے، عوام اسے محض دفع الوقتی
اور اوقات گذرانی کا آلہ سمجھتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ریڈیو کے

ساتھ تمام دُنیا کی ترقی اور اصلاح کی اُمیدیں وابستہ ہیں، اِس
کے ذریعے نہایت مفید اور اہم اصلاحیں بہت قلیل مُدّت
میں ہوسکتی ہیں، واقفیّت عامہ بڑھانے کے لئے ریڈیو بہترین
معلّم ہے، نشر و اشاعت کا بہترین ذریعہ ہے، ہر ضروری
اطلاع آناً فاناً میں ملک کے گوشے گوشے میں پہنچائی جا سکتی
ہے، بمبئی کی حکومت نے ہندو مُسلم فسادات کے مواقع پر
ریڈیو سے پولیس کو ہدایات دینے کا تجربہ کیا اور ثابت کر دیا کہ انتظامی
معاملات میں بھی ریڈیو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ریڈیو ایک ایسی ایجاد ہے جس سے نیم مُردہ لوگوں کے جسموں میں
زندگی کی نئی رُوح دوڑ گئی ہے یہی وجہ اس کی مقبولیّت کی ہے
ورنہ ہندوستان کے قدامت پرست لوگ ہر نئی چیز کو بڑی دِقّت
اور دقت سے قبول کرتے ہیں، اس کے علاوہ ریڈیو نے بیروزگاروں
کے لئے روزی پیدا کرنے کے نئے شعبے کھول دیئے ہیں۔

ریڈیو کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دُور دراز ملکوں کے بڑے
بڑے اہم واقعات اور حادثات کی اطلاع فوراً تمام دُنیا میں پہنچ
جاتی ہے، چنانچہ شاہ ایڈورڈ ہشتم کی تخت سے دست برداری
اور اس کے بعد جارج ششم کی تخت نشینی کے واقعات کل
دُنیا نے ریڈیو کے ذریعہ اپنے کانوں سے سُنے اور ایسا محسوس کیا
جیسے یہ تمام کارروائی آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے اور ہر شخص،

بذات خود اس میں شریک ہے، وہ ضروری خبریں جو کئی کئی دن بعد معلوم ہوا کرتی تھیں اب بلا تاخیر ہمارے کانوں تک پہنچ جاتی ہیں۔
کلکتہ اور بمبئی جیسے تجارتی مرکزوں سے مختلف چیزوں اور کمپنیوں کے حصّوں کا بھاؤ، گھڑ دوڑوں اور میچوں کے نتیجے ہم روزانہ عین وقت پر سُن سکتے ہیں، اس کی قدر اور اہمیت کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ریڈیو کے رواج سے پہلے ٹیلی گرام کے انتظار میں دیوانہ وار پھرتے یا ٹیلیفون پر کان لگائے بیٹھے رہتے تھے، اور اگر یہ دونوں ذرائع ان کے مقدور سے باہر ہوتے تو صبح اُٹھ کر سب سے پہلے اخبارات کا مطالعہ کرتے، اس کے علاوہ بڑے بڑے جلسوں جلوسوں اور ہنگاموں کی کارروائیوں سے ہم گھر بیٹھے محظوظ ہوتے ہیں اور ہزاروں میل کا فاصلہ ہمیں بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے، ریڈیو کے ذریعے ہمارے مذہبی سیاسی لیڈروں اور مشہور و معروف ادیبوں وغیرہ کی آوازیں اور ان کے گرانقدر خیالات ہمیں اس طرح سُنائی دیتے ہیں جیسے وہ ہمارے روبرو بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، اب کوئی دن کی بات ہے کہ ٹیلی ویژن آتا ہے، اس نئی ایجاد سے فصل حقیقتاً وصل میں تبدیل ہو جائیگا، وہ لوگ جن کے دیکھنے کو دل بیقرار اور آنکھیں مشتاق ہیں، ریڈیو کے سٹوڈیوں میں اس طرح بات چیت کرتے نظر آئیں گے گویا ہمارے ہی گھر میں مہمان ہیں، سُبحان اللہ دیدہ و دل فرش راہ کیجئے اور وصل کے لطف اُٹھائیے۔

دیہاتی طبقے پر ریڈیو والوں کی خاص مہربانی ہے، روزانہ تقریباً ایک گھنٹہ ان کے ڈھب اور مطلب کی باتیں نہایت پُرلطف انداز میں سُنائی جاتی ہیں، بڑے بڑے گانووں میں سرکاری ریڈیو عین وقت پر کھول دیئے جاتے ہیں جن سے دیہاتی اور دیہات سے دلچسپی رکھنے والے ہر روز لطف اُٹھاتے ہیں۔

اس کے علاوہ جن گھروں میں ریڈیو سٹ موجود ہیں، وہاں بُوڑھوں اور بچّوں کے لئے ایک نیا ماحول پیدا ہوگیا ہے، جو آنے والے خوشگوار دور کی ایک دھندلی سی تصویر ہے۔

ٹیلی ویژن

سائنس کی ترقی انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی ربع میں جس قدر ترقی سائنس کے مختلف شعبوں میں ہوئی ہے کسی اور صدی میں نہیں ہوئی، ہوائی جہاز، تحت البحر کشتیاں، ٹیلیفون، موٹر کاریں، ٹیلیگرافی، وائرلیس وغیرہ اسی دور کے قابل فخر کارنامے ہیں، ان سب ایجادوں میں وائرلیس کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی، اور کہا جاتا تھا کہ اس سے بہتر کوئی اور ایجاد بیسویں صدی میں نہیں ہو سکتی، لیکن سائنسدانوں کے دماغ وائرلیس کی مدد سے عکس کے نشر کرنے کی ترکیب سوچ رہے تھے آواز کو نشر کرنے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہی ایک بات باقی رہ گئی تھی، شروع شروع میں یہ خیالات خواب کی حیثیت رکھتے تھے، اور لوگ ہنس ہنس کر ان کا ذکر مذاق کے طور پر کیا کرتے تھے، مگر سائنسدان نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ اپنے اپنے معملوں میں شب و روز نئے سے نئے تجربے کرکے ترقی اور تحقیق کے قدم آگے بڑھا رہے تھے۔

ایک پیشینگوئی کوئی پچاس سال کا ذکر ہے جب ٹیلیفون ایجاد ہوا اُس

وقت سکاٹ لینڈ کے ایک بڈھے نے مذاق کے طور پہ کہا تھا، اب
دُور دُور کی چیزیں بھی بجلی کی مدد سے دکھائی دینگی۔ کون کہہ سکتا تھا،
کہ یہ مذاق بھی صحیح ثابت ہو جائیگا، اتفاق کی بات ہے کہ یہ پیشینگوئی
لفظ بہ لفظ پوری ہو گئی، اگر وہ سکاٹش زندہ ہوتا تو یقیناً اپنے آپ کو
پیغمبر سمجھتا اور کیا تعجب ہے کہ اس حیرت انگیز ایجاد کو دیکھکر
شادی مرگ ہو جاتا، آج ہم اس مذاقیہ پیشینگوئی کو پورا ہوتے دیکھکر
اس کی دُور بین عقل پر عقیدت کے پھول چڑھا رہے ہیں اور خوش ہیں
کہ ہم ایسے دور میں پیدا ہوئے ہیں جس کے ایجادات انسان کے
تصور میں بھی نہ آسکتی تھیں۔

ٹیلی ویژن کا پہلا تجربہ چند سال ہوتے سکاٹ لینڈ کے ایک نوجوان
انجنیر مسٹر جون بیرڈ نے اپنے معمل میں ٹیلی ویژن میں ایک ابتدائی تجربہ
دکھایا تھا اگرچہ یہ تجربہ کسی طرح بھی کامیاب تجربہ نہیں کہلایا جا سکتا،
لیکن ٹیلی ویژن کی دریافت میں پہلا اور کامیاب قدم ضرور تھا،
اس کو دیکھ کر یہ امید قوی تر ہوتی تھی کہ عنقریب وہ دن آنے والا ہے
جب آواز کی طرح تصاویر بھی نشر ہوا کرینگی، مسٹر بیرڈ نے اپنی
تحقیق کے نتائج دکھانے کے لئے کم و بیش چالیس افراد کو مدعو کیا،
اور یہ تجربہ ایسی تنگ و تاریک جگہ میں دکھلایا کہ بیک وقت چھ
آدمیوں سے زیادہ وہاں سما نہ سکتے تھے، اس وقت اس نوجوان
انجنیر کو صرف اتنی کامیابی ہوئی تھی کہ انسانی شکل ایک کمرے سے

دوسرے کمرے میں نشر ہو سکتی تھی مگر وہ بھی صاف نظر نہ آتی تھی، اگرچہ یہ تجربہ ہمت شکن تھا لیکن امید اور کامیابی کے فرشتے کان میں کہہ رہے تھے ہمت نہ ہارو کوئی دن میں ٹیلی ویژن تمام دنیا میں محیط ہو جائے گا۔

ٹیلی ویژن | عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ بے تار برقی کے ذریعے دُور افتادہ اجسام و اشیاء کو دیکھنے کا نام ٹیلی ویژن ہے، یاد رہے وائرلیس کی مدد سے ساکن تصاویر کئی سال سے نشر ہو رہی ہیں، اور یہ تجربے ہندوستان اور یورپ کے درمیان بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن ٹیلی ویژن اس سے کچھ مختلف چیز ہے، اس کی مدد سے ان اجسام کو متحرک حالت میں پردے پر دیکھا جا سکتا ہے جو آلہ نشر کے سامنے مختلف حرکات کرتے ہیں، اخبارات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تقریباً سو میل تک آلہ نشر صورت ہائے انسانی کو پردے پر نشر کر سکتا ہے، ابھی تک صرف کالا اور سفید رنگ نشر ہوتا ہے باقی رنگ پردے پر نہیں آتے، بالکل ممکن ہے کہ آگے چل کر تمام رنگ نشر ہونے لگیں، بہر حال ٹیلی ویژن کو فوٹو ٹیلی گرافی سے علیحدہ چیز سمجھنا چاہیے، فوٹو ٹیلی گرافی میں تار برقی یا بے تار برقی کے ذریعہ غیر متحرک تصاویر نشر کی جاتی ہیں اور ٹیلی ویژن سینما فلم کی طرح متحرک تصاویر پیش کرتا ہے۔

بعض لوگ خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ ٹیلی ویژن کی ایجاد انسان سے تخلیہ کی دولت چھین لے گی۔ گویا جس مقام پر

آلات ٹیلی ویژن کو منطبق کر دیا جائے گا وہاں کی ہر چیز باوجود در و دیوار کی موجودگی کے پردے پر نظر آجائے گی، ممکن ہے ایک زمانہ ایسا بھی آئے کہ یہ خیال پورا ہو جائے لیکن ابھی تک ریڈیو کی طرح ٹیلی ویژن بھی انہی چیزوں کو نشر کر سکتا ہے جو آلہ نشر کے حلقۂ اثر کے اندر ہوتی ہیں۔

ریڈیو سے محض ہمارے کان لطف اندوز ہوتے ہیں، گویا براڈکاسٹنگ حواس خمسہ میں سے محض ایک حس کو محظوظ کرتا ہے، اسی طرح بولنے والے فلموں کے رواج سے پہلے ہم پردے پر اداکاروں کی اداکاری سے پورا پورا حظ اٹھاتے تھے لیکن ان کی آواز نہیں سن سکتے تھے، ادھر بولنے والی تصاویر نے یہ کمی پوری کر دی، اُدھر ریڈیو میں جو کمی رہ گئی ہے اُسے ٹیلی ویژن پورا کر رہا ہے۔

آج کل ہم اپنے کمرے میں بیٹھ کر ریڈیو کے ڈرامے محض کانوں سے سُنتے ہیں اور اپنی قوتِ متخیّلہ کی مدد سے ان خلاؤں کو پُر کر لیتے ہیں جو مناظر کی عدم موجودگی سے پیدا ہوتے ہیں، کوئی دن میں ٹیلی ویژن کا رواج ہماری قوتِ متخیّلہ کو بھی آزاد کر دیگا۔

چار پانچ سال کا ذکر ہے مارکونی نے ہمیں یہ مژدہ سُنایا تھا کہ عنقریب ٹیلی ویژن میں عملی کامیابی حاصل ہوگی اور ہم دُور دراز کے فاصلوں سے آواز اور اشکال کو نشر کر سکیں گے، اس وقت یہ بات محض مذاق اور ناممکن معلوم ہوتی تھی لیکن اب وائرلیس کے

ذریعہ ہزاروں میل کی بات چیت سُننا ہمارے لئے معمولی بات ہے، ہمارے لئے ٹیلی ویژن ایک اعجوبہ چیز ہے لیکن اس کا رواج اس طلسم حیرت کو توڑ دیگا اور وہ باتیں جو اخبارات اور رسائل میں پڑھ پڑھ کر ہم حیران ہوتے ہیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور کانوں سے سُنیں گے۔

ہم میں سے اکثر لوگ ٹیلیفون سے کسی نہ کسی حد تک ضرور واقف ہونگے، ٹیلیفون میں آواز کو بجلی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، اور برقی تار یا بے تار برقی کے ذریعہ اس کو نشر کیا جاتا ہے، مخصوص آلات اس برقی تحرک کو جذب کرکے دوبارہ اُسے آواز میں تبدیل کر دیتے ہیں، ٹیلی ویژن میں بھی تقریباً اسی اصول سے کام لیا گیا ہے، جب کوئی چیز آلہ نشر کے حلقہ اثر میں آتی ہے تو اس کا عکس آلہ نشر پر اثر کرتا ہے بجلی کی ایک مخصوص رو پیدا ہو جاتی ہے، یہ رو جب تار برقی یا بے تار برقی کے ذریعے زیادہ طاقت حاصل کرکے ریسیور تک پہنچتی ہے تو دوبارہ روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور عکس بن کر پردے پر نمودار ہوتی ہے گویا ٹیلیفون اور ٹیلی ویژن میں بجلی کی رو کا تحرک ہی اصلی چیز ہے جو آواز اور شکل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ٹیلی ویژن میں تیز سی رفتار کو بہت اہمیت حاصل ہے، اگر صورتی تسلسل ذرا سی دیر کے لئے منقطع ہو جائے تو اصل مقصد

فوت ہو جاتا ہے، ٹیلی ویژن کی کامیابی اس بات میں مضمر ہے کہ سینما فلم کی طرح ہر شے اصلی حالت میں برابر نظر آتی رہے، کہا جاتا ہے اگر ٹیلی ویژن آلات کے سامنے فی سیکنڈ دس یا اس سے زیادہ عکس مرتب کئے جائیں تو پردے پر اشکال میں تسلسل قائم ہو سکتا ہے۔

ٹیلی ویژن کے رواج کے ساتھ ساتھ ہمارے اداکاروں کو بھی اپنے فن میں مخصوص تبدیلیاں کرنی پڑیں گی، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، جب اداکاری سٹیج تک محدود تھی تو اداکاروں کی حالت کچھ اور تھی جب خاموش فلم آئے تو اداکاری میں بعض اہم تبدیلیاں پیدا ہوئیں، اور بولنے والے فلموں نے تو بالکل کایا ہی پلٹ دی، بجنسہٖ یہی حالت ریڈیو کے رواج سے ہوئی، ماہرین کا خیال ہے کہ ٹیلی ویژن کے آلات کے سامنے جلدی جلدی حرکت کرنے سے عمدہ نتائج برآمد نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ اکثر اداکار آلات ٹیلی ویژن کے سامنے زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتے، بہرحال امید کی جاتی ہے کہ ٹیلی ویژن کی ترقی کے ساتھ ساتھ فن اداکاری میں بھی نمایاں تبدیلیاں واقع ہونگی۔

فی الحال ٹیلی ویژن کے آلات کے سامنے بہت ہی کم لوگوں کی گنجائش ہے، سائنسدان برابر کوشش کر رہے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کی گنجائش نکالیں، جس طرح ٹیلی ویژن کے فاصلے میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے اس طرح گنجائش کا میدان بھی وسیع

ہو جائیگا، اور ہم عنقریب باقاعدہ ڈرامے اور بڑے بڑے اجتماعوں کا نظارہ کر سکیں گے۔

تعلیمی انقلابات ٹیلی ویژن سے تعلیمی نظریوں میں بھی زبردست انقلابات رُونما ہونے کی توقعات ہیں، ماہرینِ تعلیم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ۸۳ فیصدی علم قوّتِ بصارت سے حاصل ہوتا ہے، اور ۱۷ فیصدی قوّتِ سماعت کے ذریعے، اس لئے ٹیلی ویژن تعلیم و تربیت میں بہت زیادہ مدد دیگا۔ کیونکہ اس کا تعلق براہ راست آنکھ اور کان دونوں سے ہے، اگر ٹیلی ویژن سے تدریسی کام لیا گیا تو تعلیم و تعلم میں اور بھی زیادہ آسانیاں پیدا ہو جائیں گی، آج کل تقریباً ہر ملک تعلیمی فلم تیار کر رہا ہے اگر ان فلموں کو ٹیلی ویژن سٹوڈیو سے نشر کیا جائیگا تو دُنیا کا ہر حصّہ ان سے فائدہ اُٹھائیگا۔ اور ایک ہی قسم کے فلم بار بار تیار کرنے کی ضرورت نہ رہے گی، اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ سینما کی تعلیمی حیثیت بالکل جاتی رہے گی، اگر سینما والے اس میدان پر اپنا قبضہ قائم رکھیں گے تو ٹیلی ویژن ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، کیونکہ ٹیلی ویژن میں وہ صفائی اور خوبیاں قائم رہنی بہت مشکل ہیں جو سینما کے پردوں سے مخصوص ہیں۔

ٹیلی ویژن کا رواج ہماری زندگی میں نئی نئی دلچسپیاں پیدا کر دیگا، اگرچہ ٹیلی ویژن کا مستقبل ابھی تاریکی میں ہے، لیکن مسلسل کوششیں جاری ہیں کہ اس دلچسپ ایجاد کو ریڈیو کی طرح مقبولیت

دی جاتی ہے، بہر حال خانگی اور دیہاتی زندگی میں ٹیلی ویژن ایک نئی رُوح پھونک دیگا، اور وُہ باتیں جو اب ہم گھر بیٹھے کانوں سے سُنتے ہیں آنکھوں سے بھی دیکھا کریں گے گویا وہ وقت کچھ دُور نہیں ہے جب اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھے دُنیا کے حالات اور بڑے بڑے واقعات عین وقت پر دکھائی دینگے۔

ٹیلی ویژن اور سنیما

اہل یُورپ کا خیال ہے کہ ترقّی کی دوڑ میں ٹیلی ویژن سنیما سے آگے نکل جائے گا، وہ دن بہت قریب ہے جب ہر سنیما میں بجائے فلموں کے ٹیلی ویژن کے پروگرام دکھائے جائینگے، اور تفریحی دُنیا کے متوالے انہیں زیادہ دلچسپی سے دیکھیں گے، بیسویں صدی کی اس بہترین ایجاد کی مقبولیّت تفریحی دُنیا میں ایک انقلاب رُونما کردے گی، یہ دلچسپ انقلاب بعض شعبوں میں روزی پیدا کرنے کی نئی نئی شاہراہیں وسیع کردے گا، ٹیلی ویژن کی ترقی سے ایسے انجنیروں کی مانگ بہت زیادہ بڑھ جائیگی جو سنیما اور ٹیلی ویژن کی انجنیری سے کماحقّہٗ واقف ہونگے، اس ترقی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ فلموں کی حیثیت بالکل ایسی ہی رہ جائیگی جیسی ریڈیو کی مقبولیّت سے گراموفون کی ہوگئی ہے، آج کل انگلستان کے اکثر سنیما ہالوں میں ٹیلی ویژن کے پروگرام دکھائے جاتے ہیں اور عوام ان کو بڑی دلچسپی اور جوش وخروش سے دیکھتے ہیں، کوئی دن میں خبر آئیگی کہ فلم غیر دلچسپ اور دقیانوسی کہلانے لگے، اور ان کا تفریحی ماحول

بہت ہی محدود رہ گیا۔

انگلستان میں ٹیلی ویژن کے کارناموں کو پردے پر دیکھ کر اکثر لوگ ورطۂ حیرت میں غرق ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک نئے دورِ زندگی میں پاتے ہیں۔ یورپ میں عموماً لوگ ہفتے میں دو بار سینما دیکھنے کے عادی ہیں، وہاں سینما ہالوں میں عام طور پر کارٹون فلم، کوئی عشقیہ افسانہ اور خبروں کے فلم وغیرہ دکھا کر تفریح کا سامان مہیّا کیا جاتا ہے، خیال ہے کہ ٹیلی ویژن کا شوق اس قدیمی عادت کو تبدیل کر دیگا، سردست اس قسم کے اندازے ضرور دلچسپ ہیں، دیکھنا چاہیئے ٹیلی ویژن کی تکمیل شوقِ تفریح کو کس حد تک بڑھاتی ہے۔

واقعات حاضرہ کو دکھانے کے لئے ٹیلی ویژن سے بہتر اور کوئی ایجاد نہیں ہو سکتی، اس کا اندازہ صحیح طور پر کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے ٹیلی ویژن کی مدد سے بعض اہم واقعات گھر بیٹھے بچشم خود دیکھے ہیں، خبروں کے فلم دیکھنے اور ریڈیو کی زبانی بعض اہم واقعات کی تفصیل سننے میں یقیناً وہ لطف ہرگز نہیں آسکتا جو ٹیلی ویژن سے بچشم خود دیکھنے اور خود سننے میں آتا ہے، بات یہ ہے فلموں کے ذریعے خبریں اور واقعات معلومات سابقہ کی روشنی میں دکھائے جاتے ہیں گویا ہمیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں واقعہ اس طرح رُونما ہوا اور اس کا فلاں نتیجہ نکلا، فلم کے ذریعہ ان کی وہ تفصیلات پیش کی جاتی ہیں جو احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتیں یا اگر کوئی قابل

واقعہ نگار ان پر اظہار خیالات کرتا ہے تو یہ فلم اس کی تصدیق کرتے ہیں، ٹیلی ویژن کی بڑی خوبی یہی ہوگی کہ ہم ہر چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور کانوں سے سُنیں گے، اس کے بعد اوّل تو ہمیں کسی رپورٹر کی رپورٹ پڑھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی، اور اگر ہم دلچسپی کے طور پر کسی رپورٹ کو پڑھیں گے تو ہمیں اس پر اسی طرح رائے زنی کرنے کا حق ہوگا جس طرح کسی رپورٹر کو ہو سکتا ہے، میری نظر سے ایک اخبار میں یہ خبر گزری کہ حکومت ریاستہائے متحدہ امریکہ ٹیلی ویژن کو آئندہ جنگوں میں استعمال کرے گی، اس طریق کار سے جرنیلوں کو ٹیلیفون کی ضرورت نہ رہے گی، گویا ٹیلی ویژن کی مدد سے ضروری کمک اور امداد عین وقت پر مہیّا ہو سکے گی، اس کے علاوہ ہوائی جہازوں میں ٹیلی ویژن کے آلات لگانے سے دشمن کی فوج کے پُورے پُورے حالات بغیر کسی دقّت کے معلوم ہو جائیں گے، دوسرے الفاظ میں اس بحث سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ٹیلی ویژن شخصی بُعد اور شخصی واقفیت کو دُور کر دیگا، وہ جو کچھ ہمیں دکھائیگا اس میں سو فیصدی اصلیّت برقرار رہے گی۔

ٹیلی ویژن سے دلچسپی رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں، کہ ٹیلی ویژن کی عمر بولنے والے فلموں سے تقریباً تین سال کم ہے لیکن باوجود اس خوردسالی کے ترقی کی دوڑ میں وہ بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے، پانچ سال ہوئے کہ بولنے والے فلم ترقی کے تمام

مدارج طے کر چکے تھے، اس وقت ٹیلی ویژن کی تصاویر بالکل ابتدائی حالت میں تھیں، یہ تصاویر پوسٹ کارڈ کے برابر پردے پر نہایت مدھم نظر آتی تھیں، اداکاروں کو اپنے نقش ونگار اور بناؤ سنگار بہت شوخ رنگوں سے نمایاں کرنے پڑتے تھے، مگر پھر بھی ان کا عکس پردے پر مبہم اور مدھم نظر آتا تھا، گویا ٹیلی ویژن کے اداکاروں کو وہی دقتیں پیش آتی تھیں جو شروع شروع میں فلمی اداکاروں کے راستے میں حائل تھیں، اس کے علاوہ کبھی پردے پر سے ان کا عکس بالکل غائب ہو جاتا تھا، کبھی مدھم پڑ جاتا تھا اور کبھی کچھ کا کچھ دکھائی دیتا تھا، ایک سال کی بات ہے کہ یہ شکایت لندن میں ہر شخص کی زبان پر تھی لیکن آج باوجود موسمی خرابیوں اور طرح طرح کی رکاوٹوں کے ٹیلی ویژن سٹ ایسا ہی کام دیتا ہے جس طرح ایک عمدہ فلم واقعات کی جزئیات اور تفصیلات بغیر کسی خرابی کے نہایت دیانتداری سے دکھائے چلا جاتا ہے، ہر روز اخباروں میں خبریں آتی رہتی ہیں کہ ٹیلی ویژن کے فاصلے اور خوبیوں میں ترقی برابر جاری ہے، اس سلسلہ کی آخری خبر یہ ہے کہ ٹیلی ویژن کے پروگرام تقریباً سو میل کے فاصلے تک نہایت خوش اسلوبی اور عمدگی سے پہنچ رہے ہیں۔

ٹیلی ویژن اور فلم تفریحات کے دو مختلف شعبے ہیں

جس تیز رفتاری سے ٹیلی ویژن ترقی کر رہا ہے اس سے صنعت فلم سازی کو

سخت اندیشہ ہے، اس مخصوص صنعت سے روزی پیدا کرنے
والے ٹیلی ویژن کی ترقی دیکھ کر بہت پریشان ہیں ان کی پریشانی کا
وہی عالم ہے جو سینما فلموں کے رواج سے پہلے تھیئٹروں سے متعلق
لوگوں کا تھا، اس وقت ٹیلی ویژن ان کو اپنی صنعت اور روزگار کا
خطرناک دشمن نظر آرہا ہے، ان خطرات کی سب سے پہلی پیشبندی
یہ ہوئی کہ سینما والوں نے براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے ٹیلی ویژن
پروگرام اپنے سینما ہالوں میں دکھانے سے انکار کردیا، کارپوریشن
نے بھی اس تنگ دلی کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے اس طرح
انتقام لیا کہ فلم تھیئٹروں کو ٹیلی ویژن پروگرام جزوی طور پر دکھانے
سے قانوناً روک دیا، جب اس طریق کار پر اعتراضات ہوئے،
تو یہ جواب دیا گیا کہ ابھی تک ٹیلی ویژن کے پروگرام تھیئٹروں
میں دکھانے کے قابل نہیں ہوئے، فی الحال ان سے گھروں کی
چار دیواری ہی میں محظوظ ہوا جاسکتا ہے، اور یہی ان کا اصلی مقصد ہے۔
حالات بتا رہے ہیں کہ یہ پابندی ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی اور
وہ دن دور نہیں جب سینما ہالوں میں ٹیلی ویژن کے پروگرام
باقاعدہ دکھائے جائیں گے، انگلستان میں اس وقت اعتدال پسند
طبقے کا یہ خیال ہے کہ سینما اور ٹیلی ویژن آپس میں حریف نہیں بلکہ
دور حاضر کی تفریحات کے دو مختلف شعبے ہیں جن کی دلچسپی اور ترقی
کی راہیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، اس لئے ان میں سے

کسی ایک صنعت کی ترقی دوسری صنعت کے لئے نقصان کا باعث نہیں ہو سکتی، ہاں یہ امر مسلّمہ ہے کہ ٹیلی ویژن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تفریحی دُنیا میں کچھ انقلابات ضرور رُونما ہونگے، خیال ہے کہ آئندہ زمانے میں فلم محض گھروں اور مدرسوں میں دلچسپی سے دیکھے جائینگے، اور تھیٹروں اور سنیما ہالوں پر ٹیلی ویژن کا قبضہ ہو جائے گا، ہر صوبے کا ٹیلی ویژن سٹیشن اپنے علاقے کے تھیٹروں اور گھروں میں نت نئی تصاویر پیش کر کے دلچسپی کی نئی شاہراہیں کھول دیگا، اُمید ہے کہ تھیٹروں میں اداکاروں کی موجودگی اور ان کی اداکاری کے کمالات شائقین کو اپنی طرف مقناطیسی کشش سے کھینچیں گے۔ بالکل ممکن ہے کہ اس طرح سے تھیٹروں کی کھوئی ہوئی عظمت اور دلچسپی از سرِ نو واپس آجائے۔

اگرچہ صنعت فلم کے پشت پناہ ٹیلی ویژن کی بڑی شدومد سے مخالفت کر رہے ہیں، لیکن ذہین اور ہوشیار فلم کار اس نئی صنعت کو باعث نقصان ہونے کی بجائے اپنے فن کی ترقی اور توسیع کا باعث سمجھتے ہیں، بعض بیش بیں فلم کمپنیوں نے اپنے فلم براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کو کرایہ پر دینے شروع کر دیئے ہیں، اکثر فلم کمپنیوں کے ذہین اور ہوشیار کارکن ٹیلی ویژن پروگرام کو دیکھ کر اپنی نظر کو وسعت اور فنی قابلیّت کو ترقی دینے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے علاوہ یہ بھی خیال رکھتے ہیں کہ شائد انہیں کوئی صاحب جوہر

اداکار کسی عمدہ کہانی کا مواد یا اپنی صنعت سے متعلق کوئی اور مفید مطلب بات ہاتھ آجائے، یہ آسانیاں ٹیلی ویژن کے ذریعے بغیر کسی صرف کے حاصل ہیں، ورنہ بعض معمولی معمولی باتوں کا تجربہ کرنے میں اکثر ہزاروں پونڈ ضائع ہو جاتے ہیں۔

امید ہے اگر فلم ساز ٹیلی ویژن سے تعاون کرینگے تو انہیں اپنی صنعت کو ترقی دینے کے عمدہ مواقع ہاتھ آئیں گے، اکثر ماہرین کی رائے ہے کہ ٹیلی ویژن کو ترقی دینے میں سنیما فلموں سے غیر معمولی مدد لینے کی ضرورت پڑے گی، بہر حال اگر فلم ساز کمپنیاں یہ متفقہ فیصلہ کرلیں کہ ہم ٹیلی ویژن سے قطعی تعاون نہیں کرینگے تو اس سے ٹیلی ویژن کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہوسکتا، ٹیلی ویژن ایسی انوکھی اور دلچسپ ایجاد ہے کہ اس کی مقبولیت میں کوئی چیز حائل نہیں ہوسکتی اس لئے آنے والے دَور کو روکنے سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ صنعت فلم اور ٹیلی ویژن میں ابھی سے تعاون اور اتحاد پیدا کیا جائے تاکہ یہ دونوں صنعتیں جو تفریحات کے دو علیحدہ علیحدہ شعبے ہونے کے باوجود ایک ہیں، اس بیجا مخالفت سے ایک دوسرے کے حریف نہ بن جائیں۔

حُبِّ وطن

حُبّ وطن کیا ہے؟ | حُبِّ وطن ایک نہایت مقدّس جذبہ ہے، قُدرت اس کو پیدا کرتی ہے، حالات اس کو اُبھارتے ہیں، اور ماحول اس کی تربیت کرتا ہے، ہر انسان کا دل اس جذبہ سے معمور ہے، انسان کیا حیوانات بھی اس نعمت سے محروم نہیں۔

"حُبّ وطن" کا مفہوم اگرچہ دو لفظوں میں مضمر ہے مگر اس کی وسعت سارے عالم پر محیط ہے، اس جذبے کا اظہار مختلف مُلکوں میں مختلف طریقوں سے ہوتا ہے، آزاد ممالک کسی اور نقطۂ نظر سے حُبّ وطن کا اظہار کرتے ہیں، غلام مُلکوں کے باشندے اپنے وطنِ عزیز کو بالکل مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر اس رُوح پرور راگ کی الاپیں اور تانیں بوسیدہ اور درست سازوں سے نکل کر یکساں دلکشی اور سرخوشی پیدا کرتی ہیں۔

وہ کونسا بدقسمت انسان ہے جس کا دل وطن کی محبّت سے خالی ہے، اور پھر بھی وہ اپنے آپ کو انسان کہنے کا دعویدار ہے، وہ کونسا دل ہے جس میں وطن کی محبّت اور کشش نہیں، بچپنے کے ساتھی دوست، دشمن، عزیز، رشتے دار، اپنا گھر، شہر کی گلیاں، غرض

وطنِ عزیز اور اس سے تعلّق رکھنے والی ہر ایک چیز دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے، پرائے دیس کے زیادہ سے زیادہ آرام وطن سے بے تعلق نہیں کر سکتے، اپنے وطن کی تکلیفیں وطن سے دُور ہو کر راحتیں معلوم ہوتی ہیں، کوئی لاکھ کوشش کرے تکلیفیں اور مصیبتیں یاد کر کے اپنے وطن کو بھول جائے، لیکن پھر بھی حُبِّ وطن کا جذبہ دل سے نہیں نکل سکتا ؎

حُبِّ وطن از مُلکِ سلیماں خوشتر
خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

یہ وہ حلال نشہ ہے جس سے عالم اور عامی، شہری اور دیہاتی، امیر اور غریب غرض سبھی قسم کے انسان سرشار ہیں، یہ وُہ مقدّس جوش ہے کہ محبّ وطن اپنے پیارے وطن کی خاطر جان تک کی بازی لگا دیتا اور طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھاتا ہے، جلا وطن اپنے وطن کو یاد کر کے اس طرح روتا ہے جس طرح کوئی بے ماں کا بچّہ شام کے وقت اپنی ماں کے لئے ہُڑکتا ہے، وطن کی قدر کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جو وطن سے دُور ہیں، شام کے وقت جب پرندے بسیرا لینے کے لئے اپنے گھونسلے کی طرف پرواز کرتے ہیں تو پردیسی کے دل میں "شامِ غریباں" کا سماں بندھ جاتا ہے، وطن کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے، اور وہ بے اختیار پکار اُٹھتا ہے ؎

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا (اقبال)

ہر شخص کے دل میں وطن کی محبت نامعلوم طریقے سے گھر کرتی رہتی ہے، جب حالات ترکِ وطن پر مجبور کرتے ہیں تو یہ بجھی ہوئی چنگاریاں شرارے بن جاتی ہیں، وطن اور یارانِ وطن رہ رہ کر یاد آتے ہیں، دل آپ ہی آپ بیچین ہوئے جاتا ہے، پردیس کے خوبصورت اور دلکشا مقامات، چہل پہل، روپیہ پیسہ، عزّت اور وقعت سب ہیچ مگر اپنے وطن کے پُرخار باغات اور ویران مقامات غیر معمولی طور پر بھلے معلوم ہوتے ہیں، اپنے جھونپڑوں میں بادشاہوں کے محلوں کا مزا آتا ہے، اپنے شہر کے کوچوں کی گداگری پردیس کی حکومت سے بھی بھلی لگتی ہے اور ع

بہارِ غم بہارِ جانفزا معلوم ہوتی ہے

اصلی حُبّ وطن حُبِ وطن کی ادنیٰ مثالیں تو سینکڑوں ملیں گی لیکن حقیقی حُبِّ وطن کا اقتضا یہ نہ ہے کہ انسان کو وطن کے گارے اور مٹّی سے محبّت نہ ہو بلکہ وطن سے حقیقی معنوں میں اُلفت ہو، حبّ وطن کسی شہر یا اس کے خاص محلّے یا گھر سے خصوصیت نہیں رکھتی، اس کا دائرہ بہت ہی زیادہ وسیع ہے، حقیقی حُبّ وطنی تمام ملک اور اہالیانِ ملک سے تعلق رکھتی ہے اسے کسی خاص قوم یا جماعت سے واسطہ نہیں، اس کے نزدیک وطن کی خاکِ پاک کا ہر ذرّہ محبّت کا مرجع اور کشش کا مرکز ہے۔

اپنے وطن کے لئے رونا، یاران وطن کو یاد کرکے بیقرار ہونا، گھر کے آرام یاد کرنا ایسی باتیں ہیں جن سے حیوانات بھی متاثر ہوتے ہیں، اس قسم کے جذبات ادنےٰ قسم کے جذبات ہیں، چونکہ حیوان اور انسان میں قدرت نے بہت بڑا فرق رکھا ہے اس لئے انسانی حُبّ وطن کو حیوانی حبّ وطن سے ضرور بالاتر ہونا چاہیئے، جو لوگ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں وہ حُبّ وطن کے جذبے کو تخصیص کی آلودگی سے بچاتے ہیں، ان کی نظر کسی خاص مقام پر مرتکز نہیں ہونے پاتی وہ تمام ملک پر نظر رکھتے ہیں، مذہب و ملّت کا اختلاف ان کے نزدیک بے حقیقت ہے، وہ حُبّ وطن کے مقدس جذبہ کو "من وماتی" کی آلائش سے آلودہ نہیں کرتے، بلکہ مالی جسمانی اور دماغی قوّتوں سے اپنے مُلک کی ہر قوم کو برابر کا فائدہ پہنچاتے ہیں، وہ مُلک جس کے محبّان وطن ایسی اعلیٰ صفات سے موصوف ہوں، ترقّی کی دوڑ میں ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے۔

حُبّ وطن کی تربیّت حُبّ وطن کا مقدّس جذبہ ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے ہمیں اس کی دیکھ بھال ماؤں کی گود سے کرنی چاہیئے تاکہ مالی اثرات اس کی نشوونما میں رُکاوٹ کا باعث نہ ہوں، یا غلط تربیّت اس کے تقدس کو ضائع نہ کردے، اگر اس پودے کی نگہداشت شروع ہی سے کی جائے تو درخت بننے تک اس کا پھیلاؤ محدود و اور اس کی چھاؤں کسی خاص جماعت کے لئے مخصوص

نہ ہونے پائے۔

اس مقدّس جذبے کی صحیح نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ بچّوں کو ایسی لوریاں سُنائی جائیں جو حُبّ وطنی کے جذبات کو اُبھاریں اور وطن کی خدمت کا شوق دل میں پیدا کریں، جب بچّوں کو کہانیاں سُنانے کا زمانہ آئے تو انکے سامنے اس قسم کی کہانیاں کہی جائیں، جن میں مُحبّان وطن کی قُربانیوں کے پُرجوش ذکر اذکار ہوں تاکہ حُبّ وطن کا جذبہ ان کے دلوں میں حرارت پیدا کر دے، بچّوں کے تعلیمی نصاب میں بھی حقیقی حُبّ وطنی کو تربیت دینے کے لئے ایسا مواد شامل کرنا چاہیئے کہ اس پاک اور مقدّس جذبے کو تنگ نظری کے آسیب سے محفوظ رکھے، اور خدمت وطن کا شوق دل میں چٹکیاں اور گدگدیاں لینے لگے۔

اپنے مُلک کے قابل ترین نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم سیاحت اور تجارت وغیرہ کے لئے غیر ممالک میں بھیجنا بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ وطن سے دُور رہ کر وطن کی محبّت کے جذبات آپ ہی آپ بھڑک اُٹھتے ہیں اور دوریٔ وطن دوست دشمن اور اپنے پرائے کو یکساں عزیز بنا دیتی ہے، اس کے علاوہ غیر ممالک کی وطن پروری اور دوسرے ممالک کے باشندوں سے غیریت کا سلوک اپنے وطن اور اہل وطن کی قدر و قیمت کو بڑھاتا اور خدمت وطن کے لئے آمادہ کرتا ہے۔

ہندو مسلمانوں میں وطن پرستی کا شوق، ہمارے ملک کے باشندے اپنے وطن کو بڑی عظمت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ہندو وطن کو بھارت ماتا کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں، بھارت ماتا کی پرستش ان کا ایمان ہے، اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنا ان کا شعار، مسلمان بھی ہندوؤں سے کسی طرح پیچھے نہیں، ان کا مذہب بھی حُبِّ وطن کو ایمان کا جزو قرار دیتا ہے۔

گزشتہ صدی کے سیاسی ہنگاموں نے وطن پرستی کے جذبات کو کسی قدر ٹھنڈا کر دیا تھا، لیکن بیسویں صدی میں یہ بجھائی ہوئی چنگاریاں ایک دم چمک اٹھیں، اور ہندو مسلمانوں میں وطن کی محبت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی، آج کل وطنیت کو اس قدر مقبولیت حاصل ہے، کہ زن و مرد اپنے ملک کی خدمت کر رہے ہیں، یہاں تک کہ ملک کی خدمت میں ہتھکڑیاں، بیڑیاں پہننا، قیدیں بھگتنا بھی باعث فخر خیال کیا جاتا ہے، اُمید ہے کہ وطن پرستی کا یہ جوش اور صداقت آپس کے اختلافات کو دُور کر کے ہر قوم و مذہب کے لوگوں کو متحد و متفق کر دے۔

غلام اور آزاد ممالک کا مطمح نظر غلام ممالک کے باشندوں کا مطمح نظر آزاد ممالک کے لوگوں سے کسی قدر مختلف ہے کیونکہ انہیں بالکل مختلف مسائل سے سابقہ پڑتا ہے، سب سے پہلے غیر آزاد ممالک کو جنگ آزادی کے لئے تیار ہونا لازم ہے، آپس کے اختلاف

مٹا کر اور مختلف الخیال جماعتوں کو ہم خیال بنا کر متفق و متحد کرنے میں بہت دقّت اور کشمکش ہوتی ہے، جب تمام ملک ایک مرکز پر جمع ہو جاتا ہے تو حکومت سے مقابلہ کرنے میں بڑی بڑی جانی اور مالی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں، پھر ایسے ملک کے لئے مقابلہ اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے جس کے پاس سامانِ جنگ نہیں ہوتا اور عام لوگ فن سپاہگری سے ناواقف ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی جنگ آزادی بالکل اسی قسم کی ہے، بغیر ہتھیاروں کے جنگ کرنا ہندوستانیوں ہی کا حصّہ ہے، خاموشی سے ہر مصیبت کا مقابلہ کرنا بڑی ہمّت اور صبر کا کام ہے، لیکن ہمارے مُلک نے دُنیا کے سامنے ایک ایسی بے نظیر مثال پیش کی ہے جو آج تک کوئی مُلک پیش نہیں کر سکا ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خُدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

سچ پوچھئے تو آزاد ممالک ہی وطنیّت اور وطن پرستی کے سچّے معنوں میں علمبردار ہیں، وہ آزادانہ اپنے اہل ملک کی بہبودی اور بہتری کی تجویزوں کو عملی جامہ پہناتے ہیں، صنعت و حرفت کو فروغ دیکر اپنے مُلک کے بیکار باشندوں کو کام میں لگاتے ہیں، اعلےٰ دماغ کے مالکوں سے بہترین کام لیتے ہیں رفاہِ عام کے کاموں میں ہر ذی استطاعت شخص بغیر کسی منظم تحریک کے خود بخود آگے بڑھتا ہے

بچّوں اور عورتوں کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے جس کی حقیقت میں اُن کے مُلک کو ضرورت ہوتی ہے ہر نوجوان کو فن سپاہگری کے اصول سکھا کر اپنے مُلک کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے، برخلاف اس کے محکوم مُلک کو رفاہ عام کے کاموں کے لئے حکومت کی سرپرستی اور رہنمائی کی ضرورت رہتی ہے، آزادی کھو دینے سے تمام قوتیں سلب ہو جاتی ہیں، خاص طور پر قوتِ عمل بالکل نہیں رہتی، کہ ترقی اور عروج کا زینہ ہے۔

حُبّ وطن کا اقتضاء حُبّ وطن کا حقیقی اقتضا یہ ہے کہ مُحبّ وطن اپنے ملک کو اپنا مطمح نظر بنائے، ذاتیات اور تخصیصات کی دلچسپی سے بالاتر رہے، ملک کی بہبودی کے لئے انفرادی فائدے کو بے دریغ قربان کر دے، اور ایسے مضر اسباب کو دُور کرنے کی سعی کرے جو ملک کی ترقی میں حائل ہوں، ظاہر ہے یہ امر ایک شخص کا نہیں، بلکہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے جس شعبے سے بھی تعلق رکھتا ہے اس کی ترقی اور توسیع سے تمام مُلک کو فائدہ پہنچائے ؎

خدمت خدا و خلق ہے نشاط زندگی
اس میں اپنا جان و مال شوق سے لگائے جا

قومی عظمت قائم رکھنے کے لئے محبّان وطن کے دل ہمیشہ بیقرار رہتے ہیں، اور وہ ایسے مواقع کے دل و جان سے منتظر نظر آتے ہیں جن کی بدولت ان کو تمام ملک کی خدمت انجام دینے کا موقع ملے،

یہی وہ لوگ ہیں، جو سچے محبّان وطن ہیں، ان کے نام اور کارنامے تاریخوں میں جلی قلم سے لکھے جاتے ہیں اگرچہ ان کا وجود موت کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہتا، لیکن ان کا نام رہتی دُنیا تک قائم رہتا ہے۔

محبّان وطن قومی عظمت کا باعث ہیں | دُنیا میں کسی قوم کو قومی وقار ایک دم حاصل نہیں ہوا کرتا بعد میں آنے والی نسلیں اپنی بلند ہمّتی اور قوّت عمل سے اس عظمت کو بڑھاتی ہیں جو ان کو وراثتاً حاصل ہوتی ہے، برخلاف اس کے جو اقوام آرام طلبی اور خود غرضی میں مبتلا ہو جاتی ہیں، اخلاف کے ہاتھوں ان کا رہا سہا وقار بھی ضائع ہو جاتا ہے۔

قوموں کی ترقی اور عروج کا انحصار قوموں کی قوّت عمل اور بلند نظری پر ہے، حکومتیں کسی قوم میں بھی قوّتِ عمل کی رُوح نہیں پھونک سکتیں، اگر وہ ایسا کریں تو ان کی حکومت قائم نہیں رہتی، اس لئے قومی عظمت ہمیشہ انفرادی کوشش سے حاصل ہوتی ہے، وطن کی سچّی محبّت کے یہی معنی ہیں کہ قومی عظمت کو بڑھانے کی کوشش کی جائے، اور کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے ملک و قوم کی تذلیل ہو، اور آزادی کا جذبہ سلب ہو جائے یا محکوم ہو کر قومی تنزّل کے اسباب پیدا ہو جائیں۔

جو لوگ وطنیّت کے جذبے سے سرشار ہیں وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس سے ملک کے وقار اور عظمت کو نقصان پہنچے، وہ ہمیشہ اپنے عیش و آرام کو ملک کی بہبودی پر قربان کر کے خوش ہوتے ہیں

یہ لوگ ملک کی سچی خدمت کرتے ہیں مگر کبھی صلے یا انعام کی توقع نہیں رکھتے، قومی خدمات ان کو مفلس بنا دیتی ہیں، لیکن روپیہ نہ ہونے سے انکے شخصی اور قومی وقار میں فرق نہیں آتا، جیل خانوں میں مُدّتوں محنت اور مشقّت کرتے ہیں، حکومت کے جا و بیجا ظلم اُٹھاتے ہیں، لیکن ملک کی محبّت کا نشہ ان کے دماغ سے نہیں اُترتا، جب قید و بند سے چھوٹتے ہیں قومی خدمت کا جذبہ ان کے دلوں میں اور زیادہ بھڑکتا ہے، ان کی مثالیں سینکڑوں نہیں ہزاروں ہیں جو ملکی خدمت کا شوق پیدا کرتی اور قربانی دینا سکھاتی ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کی مثالیں قومی ترقی اور ملکی عروج کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتی ہیں۔

حُبّ وطن ہی ہندوستان کی نجات ہے

حُبّ وطن کا فقدان یوں تو ہر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے لیکن ہمارا ہندوستان خاص طور پر حقیقی حُبّ وطن نہ ہونے سے تنزّل اور ادبار کا نشانہ بنا ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمیں امن قائم رکھنے کے لئے بیرونی طاقت کی ضرورت ہے، اگر روک تھام کے لئے ایک تیسری طاقت نہ ہو تو نا اتفاقی کا یہ عالم ہے کہ ہر طاقتور انسان کمزور کو نیست و نابود کر دے، ہماری تجارت، و زراعت اور صنعت و حرفت کو خود غرضی اور خود پرستی کی وجہ سے عروج حاصل نہیں ہو سکتا، ہماری قوّتِ عمل ایک دوسرے کی مخالفت اور تذلیل میں صرف ہوتی ہے، کہیں مذہب کا جھگڑا ہے،

کہیں سیاسیات کی بحث ہے، کہیں مجلسی اور معاشی معاملات پر خونریزی کے منظر دیکھنے میں آتے ہیں، غرض قدم قدم پر اختلاف اور چپّے چپّے پر جھگڑا فساد ہے، غدّاری، فساد انگیزی ہمارے ملک کی ہر قوم کا شعار بن گیا ہے، ظاہر ہے ایسے حالات میں ترقی کرنا تو درکنار ہمارا قدیمی وقار بھی نہیں رہ سکتا، ضرورت اس بات کی ہے کہ آپس میں اتحاد و یگانگت پیدا کی جائے اور ملک کی بہبودی کو ذاتی مفاد پر قربان نہ کیا جائے، نیز مذہب کو نجات کا ذریعہ سمجھا جائے نہ کہ فساد انگیزی کا آلۂ کار، غرض تمام اختلافات کو مٹا کر وطن اور اہلِ وطن کو پیش نظر رکھا جائے پھر دیکھیں کیسے ہمارا ملک اپنا کھویا ہوا وقار اور قدیمی عظمت حاصل نہیں کرتا۔

کیریکٹر

اُردو میں کیرکٹر کا مفہوم سیرت، چالچلن اور رویہ کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے، لیکن درحقیقت جن معانی پر لفظ کیریکٹر حاوی ہے ان کو یہ الفاظ پوری طرح ادا نہیں کر سکتے، اس لئے ہم نے اس مضمون میں جا بجا کیرکٹر کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔

کیریکٹر؟ کیریکٹر مختلف صفات کا مجموعہ ہے، کیریکٹر والے لوگ اپنی اس صفت پر جس قدر بھی ناز کریں کم ہے بلکہ جس گروہ سے وہ تعلق رکھتے ہیں اگر وہ بھی ان کی ذات پر فخر کرے تو زیبا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کیریکٹر قابلِ فخر اور لازوال سرمایہ ہے، یہ انسان کے مرتبہ کو عام انسانوں سے بلند کرتا ہے، جس شخص کا کیرکٹر دلپذیر ہو اُس کو ہر سوسائٹی میں معزّز اور محترم سمجھا جاتا ہے، کیریکٹر کا اثر اور رُعب دولت و حشمت سے کہیں زیادہ ہے، جا بجا ہے کہ اقبال کیریکٹر والوں کے قدم لیتا ہے۔

کیریکٹر انسان کی قلبی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے، کیریکٹر والے لوگ سماج کی رُوح رواں ہیں وہ اپنی اخلاقی قوتوں کے زور سے ہر زمانے میں بادشاہوں کی طرح حکومت کرتے ہیں، نپولین اعظم

کہا کرتا تھا کہ جنگ و جدل میں اخلاقی قوّت جسمانی طاقت سے دس حصّے زیادہ کام آتی ہے، حقیقتاً ترقی یافتہ اقوام کے زرّیں کارنامے تمام و کمال انفرادی کیریکٹر کے ممنون احسان ہیں؛ ملکی تحفظ اور وقار کی بنیادیں اسی پر قائم ہیں اور قوانین و احکام اسی کا عمدہ نتیجہ ہیں۔

کیریکٹر دولتمندوں اور سرمایہ داروں سے مختص نہیں، ایک مفلوک الحال اور بے زر شخص بھی کیریکٹر کی دولت سے مالا مال ہو سکتا ہے، تہذیب و تمدّن کے افسانے کیریکٹر کے کارناموں کے مقابلے میں ہیچ ہیں، ایک معمولی مزدور پیشہ کیریکٹر کی بدولت، نام نہاد مہذب، متمدّن، عالم اور عاقل شخص سے کہیں زیادہ بہتر ہے، جو لوگ زیرک اور دانا کہلاتے ہیں وہ یقیناً قابلِ تعریف ہیں، لیکن ان پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت ہے اور وہ چیز کیریکٹر ہے، یہی وجہ ہے کہ وقتِ ضرورت عقلا کی عقل اور جہاندیدہ اشخاص کے تجربوں سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے لیکن رہنمائی اُن لوگوں کی قبول کی جاتی ہے جو کیریکٹر رکھتے ہیں۔

کیریکٹر ایک ایسی مسلّمہ طاقت ہے کہ وہ کسی اور طاقت سے مغلوب نہیں ہو سکتی، بیشک دل بغیر دماغ کے، علم بغیر عمل کے اور چالاکی بغیر نیکی کے ایک قسم کی طاقت ہے لیکن کیریکٹر کی قوّت ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے، کیریکٹر کے مقابلے میں ان صفات کی

تعریف کرنی اتنی ہی دشوار ہے، جتنی کسی گٹھ کترے کے ہاتھ کی صفائی یا کسی ڈاکو کی شہسواری کو سراہنا مشکل ہے۔

شجاعت، صداقت، راستبازی، نیکوکاری کیریکٹر کی جان ہیں، جو شخص ان صفات سے متصف ہو، کوئی بہادر سے بہادر اور چالاک سے چالاک شخص بھی اس کا حریف نہیں ہو سکتا، کیریکٹر میں بدی کو روکنے کی طاقت ہے، وہ مصائب و آلام کو ہنسی خوشی برداشت کرنے کی ہمت پیدا کرتا ہے، سخت سے سخت امتحان کے موقع پر آڑے آتا ہے، ناگہانی آفات سے بڑے بڑے بہادر گھبرا جاتے ہیں، لیکن کیریکٹر والا شخص خندہ پیشانی سے ان کا خیر مقدم کرتا ہے، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بہادر سپہ سالار دشمنوں کے ہاتھوں میں پھنس گیا، اُنہوں نے اس سے کہا، کیوں جی اب وہ تمہارا قلعہ کہاں گیا، اس نے نہایت بہادری سے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا، یہ ہے مصیبت کے وقت ایک بہادر اور درستکار آدمی کا کیریکٹر زیادہ چمکتا ہے، اور اس وقت جبکہ تمام سہارے ٹوٹ جاتے ہیں وہ اپنی راستبازی کا سہارا لے کر اپنی اصلیت کو دکھاتا ہے، سکندر اعظم اور راجہ پورس کی آخری گفتگو عمدہ کیریکٹر کی زندہ مثال ہے، راجہ پورس نے سکندر کا سخت مقابلہ کیا، تقدیر کی خوبی کہ وہ گرفتار ہوا، جب اس کو سکندر کے سامنے پیش کیا گیا تو سکندر نے کہا، راجہ پورس بتاؤ اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، اس نے بیباکی سے جواب دیا،

جو راجاؤں کی شان کے شایاں ہے، اس مصیبت کے عالم میں جب کہ موت کا فرشتہ راجہ پورس کے سامنے دانت نکوسے کھڑا تھا اور وہ قیدی کی حیثیت رکھتا تھا اس نے کیسی جرأت سے جواب دیا، سکندر اعظم اس کے دلیرانہ جواب سے حد درجہ مسرور ہوا، اس نے راجہ کی ہمّت اور دلیری کو دیکھ کر اس کی حکومت اسی کو واپس کر دی۔

دُنیا میں مُراد مندی کی زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کیریکٹر کو شاندار بنایا جائے، اس میں بھی ایک نکتہ ہے، جب کوئی شخص کیریکٹر شاندار بنانے کی طرف متوجّہ ہو گا، تو اس کو جدو جہد کرنی لازم ہو گی، یہی جدوجہد اس کے دل میں مقابلہ اور برداشت کی قوّت پیدا کر دے گی، گویا قوّت عمل کے ساتھ اس میں استقلال بھی پیدا ہو جائیگا، کسی کا قول ہے اگر تمہاری زندگی کا معیار بلند نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں، تم ایک بلند معیار قائم کر لو اور اس پر قائم رہنے کی مسلسل اور متواتر کوششیں جاری رکھو، اس مقولے کی تشریح یہ ہے جو شخص بلندی پر نظر نہیں رکھتا وہ لازماً پستی کی طرف مائل ہوتا ہے، نتیجہ کے طور پر اس کے خیالات پست ہو کر ہمّت بھی پست ہو جاتی ہے ؎

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمّت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

جو شخص بلند مقاصد پیش نظر رکھتا ہے اگر اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوتی تو نہ ہو وہ بلند نظری سے محروم نہیں ہو سکتا،

یاد رکھئے ایک بلند نظر فرد اس شخص سے بدرجہا بہتر ہے جو اپنی پست حالی پر قانع رہتا ہے۔

قول و فعل میں یکسانیت

ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک آدمی نے اپنے نوزائیدہ لڑکے کا نام ایک ایسے شخص کے نام پر رکھا جو اپنی راستبازی اور کیریکٹر کی مضبوطی کی وجہ سے شہرہ آفاق تھا، اُس نے اس واقعہ کی اطلاع اس شخص کو بھی دی، اس نے جواب میں لکھا "کسی خاص آدمی کا نام رکھ لینا کوئی معنی نہیں رکھتا، میری درخواست ہے کہ اپنے اس بچے میں جس کا نام تم نے میرے نام پر رکھا ہے وہ خُوبیاں بھی پیدا کرنے کی کوشش کرو، جن کی وجہ سے تم نے اس نام کو انتخاب کا شرف بخشا ہے، تاکہ اس نام کی لاج باقی رہے، میرے والد مجھے ہمیشہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ جس قسم کے تم انسان ہو ویسا ہی اپنے آپ کو ظاہر کرو تاکہ کسی ایک شخص کو بھی تمہارے متعلق کوئی غلط فہمی نہ ہو، میرے آباؤ اجداد بھی اسی اصول پر کاربند تھے، اور یہی خصوصیّت ان کی شہرت اور عزت کا باعث تھی، ہم لوگوں نے اس نیک نام کی ہمیشہ قدر کی، یہاں تک کہ یہ صفات ہمارے خاندان سے مخصوص ہوگئیں، اور یہی سبب ہیں میری شہرت اور عظمت کا۔ کاشکہ تمہارا بچہ بھی اسم بامسمّٰی ہو۔"

جن لوگوں کے قول و عمل میں یکسانیت نہیں ہوتی، ان کی عزّت کوئی شخص بھی نہیں کرتا، جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا ہے وہ صدا بصحرا

سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، ایسے لوگ اگر سچ بات بھی کہیں تو اس پر یقین نہیں کیا جاتا، کیریکٹر اسی اعتماد کو پورا کرتا ہے، راستباز انسان کو ہمیشہ راہ راست پر گامزن رکھتی ہے، حرف گیری اور عیب چینی کرنے والوں کی موجودگی اور غیر حاضری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہ لڑکا کس قدر مضبوط کیریکٹر کا مالک تھا جس سے کسی نے کہا، میاں لڑکے جب باغ میں کوئی نہ تھا تو دو چار سیب توڑ کر تم نے اپنی جیب میں کیوں نہ ڈال لئے، اُس نے جواب دیا، جناب بے شک وہاں کوئی نہ تھا، جو مجھے روکتا یا ٹوکتا، لیکن میں خود تو وہاں موجود تھا، اور اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا، معاف کیجئے میں اپنے تئیں بددیانتی کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔

اس ادنےٰ مثال میں ضمیر کی صداقت اور کیریکٹر کی استقامت کی ایک معمولی سی جھلک ہے، کیریکٹر ضمیر کو مردہ نہیں ہونے دیتا، اس کا عمل ہر وقت جاری وساری رہتا ہے، اس کی موجودگی میں ہر قسم کے خطرات لایعنی ہیں، یاد رہے آزمائش چاہے وہ کتنی ہی خفیف کیوں نہ ہو اگر انسان اس میں پورا نہ اُترے تو وہ اپنی نظروں میں خود ذلیل وحقیر ہو جاتا ہے، خلاف اخلاق وقانون حرکات مجرم کی طبیعت کو ایکدم تبدیل کر دیتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ گرفت میں نہ آئیں، ان کا خیال دل میں ایک قسم کی بےچینی پیدا کر دیتا ہے اور یہی مجرم کی ناگزیر سزا ہے جس کے عذاب میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے۔

حسن سلوک عمدہ کیریکٹر کی نشانی ہے | حسن سلوک بڑا بھاری احسان ہے، اور لطف یہ ہے کہ اس کے لئے کسی سرمایہ کی ضرورت نہیں، چاہے جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہو لیکن حسن سلوک سے دوسروں کو بے دام غلام بنایا جاسکتا ہے، محبت بھری نگاہیں اور نرم وملائم الفاظ وہ کام کرتے ہیں جو سینکڑوں روپے دے کر بھی نہیں ہو سکتے، جو لوگ اپنے ہمجنسوں کے ساتھ محبت اور مروت سے پیش آتے ہیں وہ اپنے ماحول کو اس طرح منور کرتے ہیں جیسے آفتاب و مہتاب کی روشنی خاموشی کے ساتھ تمام فضا کو روشن کر دیتی ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ حسن سلوک تمام طاقتوں سے زیادہ طاقتور ہے، وہ اپنا راستہ اس خاموشی اور کامیابی کے ساتھ بناتا ہے جس طرح خوشنما پھول شاخوں میں سے پھوٹ آتے ہیں کس قدر بد قسمت انسان ہیں وہ لوگ جو حقیقی مسرت ان داموں بھی نہیں خرید سکتے۔

خلق ومروت کی کوئی قیمت نہیں لیکن پھر بھی ان کے بدلے میں ہم ہر چیز خرید سکتے ہیں، دنیا میں سب سے سستی چیز مہربانی ہے، مہربانی کرنے میں نہ کچھ خرچ ہوتا ہے اور نہ کسی قسم کی تکلیف ہوتی ہے، لیکن پھر بھی بعض بد قسمت لوگ مہربانی کرنے میں تامل کرتے ہیں، مہربانی ایسی قوت ہے جس سے لوگوں کے دلوں اور سرمایہ پر نہایت آسانی سے قبضہ کیا جاسکتا ہے۔

عمدہ عادات اور اچھے اخلاق انسانی زندگی کا زیور اور قوت عمل

کا حسن ہیں، خوش کلامی سے قدر و منزلت ہیں چار چاند لگتے ہیں۔ حقارت آمیز طرز گفتگو کوئی پسند نہیں کرتا لیکن پھر بھی ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں جو اپنی درشت کلامی پر ناز کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن سے تعاون کرنا اخلاقی گناہ ہے، درشت کلام شخص ممکن ہے کوئی مالی نقصان نہ پہنچا سکے، لیکن وہ مخاطب کے دل کو صدمہ پہنچاتا اور اسکے جذبہ خودداری کے نازک شیشے کو چکنا چور کر دیتا ہے۔

کیریکٹر عادات و اطوار کا دوسرا نام ہے

چونکہ عادات طبیعت ثانیہ ہیں، اور انکا ترک محال ہے اس لئے عادات اختیار کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے، عادات کے متعلق کسی بزرگ کا قول ہے اگر تم سے کوئی شخص کہے کہ فلاں پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو بلا تامل یقین کر لو، لیکن اگر تم سے کہا جائے کہ فلاں شخص نے اپنی عادت تبدیل کر لی تو یقین کرنے میں تامل کرو۔

کسی عقلمند نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی تھی کہ بیٹا سن تمیز کو پہنچنے سے پہلے اپنا کیریکٹر بنالو، وہ ساری عمر تمہارے کام آئیگا، کیونکہ کیریکٹر عادات سے بنتا ہے اور عادات امتداد عمر کے ساتھ ساتھ پختگی حاصل کرتی ہیں اس لئے جب عادت راسخ ہو کر کیریکٹر کا جزو بن جاتی ہیں، تو پھر ان کو تبدیل کرنا یا ترک کرنا محال ہو جاتا ہے، اسی طرح کسی فن یا علم کا حاصل کرنا آسان ہے لیکن اسے حاصل کرنے کے بعد ترک کر دینا یا بھول جانا دشوار تر ہے، اسی اصول کو مدنظر رکھنے

ہوئے ایک معلّم موسیقی ان شاگردوں سے دوگنی فیس لیا کرتا تھا
جو پہلے کسی گھٹیا قسم کے اُستاد سے علم موسیقی کی تعلیم حاصل کر کے
اس کے پاس آتے تھے۔

عام طور پر عادات بچپن میں راسخ ہوتی ہیں اور راسخ ہونے کے
بعد وہ طبیعت ثانیہ بن جاتی ہیں، گویا بچوّں کی حالت اس نوخیز درخت
کی مانند ہے جس کے تنے پر کچھ حروف کندہ کر دیئے جائیں، جُوں جُوں
درخت بڑھتا ہے یہ حروف بھی اس کے ساتھ نشوونما پاتے ہیں
اور جب تک یہ درخت سلامت رہتا ہے وہ بجنسہٖ قائم رہتے ہیں،
اسی طرح جو بات بھی بچپن میں دلوں پر نقش ہو جائے وہ کبھی محو نہیں
ہوتی، اس لئے اگر شروع ہی سے بچوّں کو نیک عادات اور عمدہ
خصائل کا عادی بنایا جائے تو وہ ہمیشہ ان پر کاربند رہتے ہیں۔

عادات اچھّی ہوں یا بُری ان میں راسخ ہونے کی قوّت موجود ہے،
جن بچوّں کو خوش رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے وہ ہمیشہ خوش رہتے
ہیں، اور ہر چیز کے مسرّت بخش پہلو کو دیکھنے کے عادی ہو جاتے
ہیں، ہر چیز کے مسرّت بخش پہلو کو دیکھنے کی عادت ہزاروں اور
لاکھوں روپے سالانہ کی آمدنی سے بہتر ہے۔

کیریکٹر کیونکر بنتا ہے انسان کا کیریکٹر بالکل غیر محسوس طریقے سے ان
افعال و حرکات سے مرتب ہوتا ہے جن سے اس کو کسی قسم کا فائدہ
پہنچتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ یہ فائدہ مالی منافع ہی ہو، بچپن میں محض

تسلّی اور تسکینِ قلبی کو فائدہ سمجھا جاتا ہے ، جُوں جُوں انسان کی عمر بڑھتی ہے اس سے فائدہ کی حدود بھی بڑھتی چلی جاتی ہیں اگر ابتدائے زندگی میں صداقت ، دیانتداری اور دیگر اچھی عادات سے کسی انسان کو نقصان پہنچ جائے تو پھر اس کی طبیعت اس طرف راغب نہیں ہوتی ، اور اگر حُسنِ اتفاق سے ان عادات کا معقول صلہ حاصل ہو تو جب کبھی اس قسم کے حالات پیش آئیں گے انسان عادتاً وہی کریگا جو شروع میں کرتا رہا ہے ، یہاں تک کہ یہ عمل بار بار ہونے سے طبیعت میں راسخ ہو جائیگا پھر چاہے کچھ صلہ ملے یا نہ ملے اسی طرح ظہور کرتا رہیگا۔

مختلف الطبع ہونے کے اسباب | ہر ایک بچّہ مختصر سی ضرورتیں ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لاتا ہے ، وہ پیدا ہوتے ہی رو رو کر خوراک اور جسمانی آرام طلب کرتا ہے ، اس کے بعد اس میں اپنی طرف متوجہ کرنے اور بات منوانے کا احساس پیدا ہوتا ہے ، جن افراد سے اس کی یہ خواہشیں پوری ہوتی ہیں وہ طبعاً ان سے مانوس ہو جاتا ہے ، اور لطف یہ ہے کہ وہ اپنی معصومانہ حرکات و سکنات سے اپنی دلی خوشی اور قلبی تسلّی کو ظاہر کرتا ہے ، آہستہ آہستہ وہ ان حرکات کا عادی ہو جاتا ہے ، جن کے ذریعہ ان کی ضرورتیں پُوری ہوتی ہیں گویا بچّہ وہی رویّہ اختیار کرتا ہے جس سے اس کو فائدہ حاصل ہوتا ہے ، ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بچّہ کی ابتدائی زندگی کے تجربات غیر معمولی اہمیّت رکھتے ہیں کیونکہ انہی کے اثر سے آئندہ

زندگی کا راستہ تیار ہوتا ہے۔

ابتدائی زندگی کے تجربات ہی سے مختلف قسم کے انسان تیار ہوتے ہیں، ورنہ پیدائش کے وقت بچّوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوتا، اس اجمال کی تفصیل کے لئے فرض کیجئے دو مسافر ایک راستے پر چلے جاتے ہیں، کچھ فاصلے پر یہ رستہ دو رستوں میں منقسم ہو جاتا ہے ایک شمال مغرب کو جاتا ہے دوسرا شمال مشرق کو، جب وہ دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ہیں تو ان میں بہت کم فاصلہ ہوتا ہے، لیکن جُوں جُوں آگے بڑھتے ہیں درمیانی فاصلہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کو ایک دوسرے کے حال کی بھی خبر نہیں رہتی، مختلف قسم کے تجربات اور آزمائشیں انہیں بالکل مختلف قسم کا انسان بنا دیتی ہیں۔

فرض کیجئے اپنے تجربات کی بنا پر ایک بچّہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ رونے سے اس کو گود میں اُٹھا لیا جاتا ہے، برخلاف اس کے کوئی دوسرا بچّہ روتا بھی ہے تو اس کی پروا نہیں کی جاتی، ایسی صورت میں پہلا بچّہ گود میں جانے کے لئے ہمیشہ رو کر اپنی خواہش کا اظہار کریگا اور دوسرا بچّہ اپنے تجربے کی بنا پر رونے کو فعل عبث سمجھے گا، کیونکہ اس کے معصومانہ تجربے کے مطابق رونے سے اس کی حاجت پوری نہیں ہوتی، اگر بچّوں کا یہ رویّہ بچپن ہی میں ختم ہو جاتا تو کچھ مضائقہ نہ تھا، لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ فرق ہمیشہ رہتا ہے، جن بچّوں

کی تربیت پہلے بچّے کی طرح ہوتی ہے وہ اپنی ہر خواہش کو رو دھو کر پورا کروا تے ہیں اور طبعاً نشاکی اور روٹھے بن جاتے ہیں سن تمیز کو پہنچنے کے بعد ان کی ہمیشہ یہی آرزو رہتی ہے کہ کوئی ان کی شکایتیں سُنے اور اظہارِ ہمدردی کرے ' ایسے لوگ ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتے وہ ایک ہارے ہوئے انسان کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس کے برعکس وہ بچّے جو اظہار مسرّت سے اپنی خواہشیں پوری کرانے کے عادی ہو جاتے ہیں تمام زندگی ہنسی خوشی گزارتے ہیں' جس بچّے کی گریہ وزاری کی کوئی پروا نہیں کرتا وہ بڑا صابر و شاکر انسان ہوتا ہے ، اگر کسی بچّے کو منّت سماجت سے اپنی بات منوانے کی عادت ہو جائے تو وہ تمام زندگی اپنے ہر مقصد کو اسی طرح سے حاصل کرتا ہے ، بعض بچّے شور و شر سے اپنی بات منواتے ہیں، اس کی ذمہ داری بھی ان کی تربیت کرنے والوں پر عائد ہوتی ہے ، ایسے بچّے آگے چل کر نہایت ضدّی' تند مزاج' آزاد منش اور قانون شکن اشخاص بنتے ہیں۔

بعض عقلمند والدین اپنے بچّوں کو ہمیشہ ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے لئے خود رستہ بنائیں اور اپنا ہر کام خود انجام دیں' اس ترغیب و تحریص سے وہ ہر کام میں اپنی ذات پر بھروسہ کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور کسی دوسرے شخص کی رہنمائی اور امداد کے

محتاج نہیں رہتے، اس کے برعکس جن بچّوں کے والدین ہر قدم پر ان کو سہارا دے کر چلاتے ہیں وہ ہمیشہ دوسروں کی مدد کے طالب رہتے ہیں، حد یہ ہے کہ ان کے بغیر بیرونی امداد کے کسی معمولی کام کے شروع کرنے کی بھی ہمت نہیں رہتی؛ شخصی ذمہ داری اور خود اعتمادی کا مادہ ان کی طبیعت میں فنا ہوجاتا ہے۔

بعض مستقل ارادہ والدین کے بچّے کمزور طبیعت اور غیر مستقل مزاج ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ والدین کے مستقل ارادوں کی سختی سے بچّوں کی قوتِ ارادی کمزور ہوجاتی ہے، اور وُہ اپنے والدین کے حاکمانہ اشاروں کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں، اگر وہ کسی کام کو اپنے خیال کے مطابق کرنا بھی چاہیں تو والدین کا رُعب اور اثر اُنہیں اپنا ارادہ پُورا کرنے کی اجازت نہیں دیتا، یہاں تک کہ ان میں کسی مسئلے پر غور و فکر کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔

تُند مزاج والدین کے بچّے اپنے ماں باپ سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں، اور ہمیشہ ان کی نظروں سے دُور رہنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کو آزادی کا موقع ملتا رہے، اس قسم کے بچّے بڑے ہوکر طبعاً شرمیلے، جلدی گھبرا جانے والے اور گوشہ نشین ہوا کرتے ہیں۔

بعض بچّوں کو شیخیاں مارنے کی بہت عادت ہوتی ہے، اس عادت کے ذمہ دار بھی والدین ہی ہیں، وہ چھوٹے منہ سے بڑی

باتیں سُن کر ان کی تعریف کرتے ہیں، یہ تعریف بچوں کو ہمیشہ کے لئے شیخی خور ا بنا دیتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ماحول کو تبدیل کر دیا جائے تو رویّہ تبدیل ہو گا یا نہیں؟ اگر ابتدائی عادات طبیعت ثانیہ کی صُورت اختیار کر لیں تو کیریکٹر تبدیل ہونا مشکل ہے، بلکہ مختلف قسم کا ماحول پیدا کرنے سے ایک شخص کا کیریکٹر دو قسم کا ہو جائیگا' مثلاً بچّوں کی تربیّت عموماً گھر کے اصولوں کے مطابق ہوتی ہے' اس کے بعد ان کو مدرسہ میں داخل کر دیا جاتا ہے، گویا بچّہ بالکل نئے ماحول میں پہنچ جاتا ہے، اس وقت عجیب کشمکش کا سامنا ہوتا ہے' آخر کار وہ مدرسے کے ماحول کا بھی عادی ہو جاتا ہے اور گھر کے ماحول کا بھی، اس طرح سے وہ یک رُخہ نہیں رہتا، بلکہ اس کی شخصیت مختلف کیریکٹروں کا مجموعہ بن جاتی ہے۔

ایک جیسی تربیت ایک گھرانے میں مختلف قسم کے اوضاع و اطوار کے بچّے ہونے کا کیا سبب ہے؟ جب ان کا ماحول ایک طرح کا ہے تو ان کے کیریکٹر علیحدہ علیحدہ کیوں ہیں؟ بات یہ ہے کہ دو بچّوں کو ایک جیسی تربیّت دینا قطعی ناممکن ہے، سب سے پہلے والدین کے مزاج میں امتداد ایّام کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں، جس شوق اور محبّت سے وہ پلوٹھی کے بچّے کو پالتے ہیں دوسرے کے ساتھ ویسا سلوک نہیں کرتے، ناتجربہ کاری

کی وجہ سے پہلے بچّہ کی زیادہ دیکھ بھال ہوتی ہے، پھر پہلے بچّہ کا تجربہ دوسرے کے ساتھ کام آتا ہے اکثر اوقات حالات تبدیل ہو جاتے ہیں، صحت میں فرق آجاتا ہے، میاں بیوی کے باہمی تعلّقات پہلے جیسے نہیں رہتے، عمریں بڑھ جاتی ہیں غرض سینکڑوں باتیں ایسی ہو جاتی ہیں جن کی بدولت ان کا رویّہ اور نظریّہ بدل جاتا ہے، اس کے علاوہ بچّے ایک دوسرے سے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں، اور چھوٹا بڑا ہونا بہت کچھ معنی رکھتا ہے، پھر یہ ضروری نہیں کہ اُوپر تلے کے بچّے بھائی بھائی ہوں، ممکن ہے دُوسری اولاد لڑکی ہو، لڑکی کے مقابلے میں اولاد نرینہ کو بہت زیادہ اہمیّت دی جاتی ہے، جو لڑکا لڑکیوں میں پلتا ہے اُس کی طبیعت اور قسم کی ہوتی ہے، اسی طرح جو لڑکی لڑکوں میں پرورش پاتی ہے اس کی اُفتادِ کمسی اور ڈھنگ پر جاتی ہے، نیز ہم عمر اور ہم عصر بچّے بھی ایک مزاج کے نہیں ہوتے، مختلف العمر بچّوں کی جسمانی خصوصیات بھی ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہیں، ایک گرمی میں پیدا ہوتا ہے دوسرا سردی میں، غرض یہ معمولی سے ابتدائی حالات ایک ہی شخص کی اولاد میں بہت کچھ اختلافات پیدا کر دیتے ہیں۔

جنٹلمین | جنٹلمین وہ شخص ہے جس کی ذات میں تمام اوصافِ حمیدہ مجتمع ہوں، راستبازی، دیانتداری، غریب نوازی، منکسر المزاجی، خودداری، متانت، سنجیدگی وغیرہ وغیرہ اس کے عام فضائل ہیں،

غرض انسان کامل کو جنٹلمین کا لقب دیا جاتا ہے اور حق یہ ہے کہ ایسا ہی شخص انسان کہلانے کا مستحق ہے، ایسے لوگوں کے خواص فیشن اور وضعداری کے ممنون نہیں ہوتے۔

ہر جنٹلمین اپنے کیریکٹر کی قدر کرتا ہے، وہ بھی اتنی زیادہ نہیں کہ لوگ اس پر حرف گیری کریں، جس طرح وہ اپنی عزّت کا خیال رکھتا ہے اسی طرح دوسروں کے جذبات اور احساسات کا احترام بھی کرتا ہے، وہ ہمیشہ نرمی اور درگذر سے کام لیتا ہے! اور اپنی شیریں کلامی اور اخلاق حسنہ سے دُوسروں کے دلوں میں اپنے لئے خاص جگہ پیدا کرتا ہے۔

سچّا جنٹلمین ذلیل و رکیک حرکات سے پرہیز کرتا ہے، راستبازی اس کے قول و عمل سے منعکس ہوتی ہے، وہ حیلہ بازی اور ریاکاری سے کوسوں دُور ہے، دیانتداری اور راست کاری اس کا ایمان ہے، اس کا قانون درست کرداری ہے وہ خود صحیح راستہ پر چلتا اور دُوسروں کو اپنے قول و عمل سے صداقت کی ترغیب دیتا ہے، اگر وہ ہاں کہدے تو یہی اس کا قانون ہے ہمیشہ صحیح موقعہ پر اس کے مُنہ سے "ناں" نکلتی ہے، جنٹلمین کی مخصوص صفت یہ ہے کہ رشوت اور لالچ دیکر اس کو صحیح راستے سے نہیں ہٹایا جاسکتا۔

دولت اور مرتبے کا ان خصوصیات سے کوئی تعلّق نہیں جو ایک جنٹلمین سے مخصوص ہیں، ایک بالکل غریب اور نادار شخص بھی

جنٹلمین ہو سکتا ہے۔

جنٹلمین جو ارادہ کرتا ہے اس کو سخت سے سخت حالات میں بھی پورا کئے بغیر باز نہیں رہتا، وہ اپنی آن پر جان قربان کر دیتا ہے، ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے، وہ اپنے قول اور فعل کا صادق ہوتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ صداقت ہی زندگی کا اوج و کمال ہے، قدم قدم پر اس کے افعال و اطوار سے راستبازی ٹپکتی ہے، شجاعت اور بُردباری اس کی مخصوص صفات ہیں، اس کا دل فراخ اور نقطۂ نظر وسیع ہوتا ہے، وہ کبھی ظلم نہیں کرتا اور نہ کسی ظالم کا ساتھ دیتا ہے، ہمیشہ مصیبت زدوں پر ترس کھاتا اور ان کی دامے درمے قدمے مدد کرتا ہے، جرم پوشی اور خطا پوشی اس کی عام صفات ہیں۔

جنٹلمین کی شناخت یوں تو جنٹلمین کی شناخت کے بہت سے طریقے ہیں، لیکن ایک امتحان ایسا ہے جو کبھی ناکامیاب نہیں ہوتا، جنٹلمین کو پہچاننے کے لئے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ اپنی قوت کو اپنے ماتحتوں پر کس طرح صرف کرتا ہے، بچوں اور عورتوں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہے، اگر وہ معلّم ہے تو وہ اپنے شاگردوں کیساتھ کیونکر پیش آتا ہے۔

جو شخص ان لوگوں پر سختی کرتا ہے جو اپنی کمزوری کی وجہ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، وہ جنٹلمین نہیں کمینہ انسان ہے، جو شخص کمزوروں اور بیکسوں پر ظلم روا رکھتا ہے وہ کمینہ بھی ہے اور بُزدل

بھی، ظالم انسان غلامانہ ذہنیت رکھتا ہے اور اس کے افعال اس کی دلی خفیفت کو طشت از بام کرتے ہیں، طاقت اور قوت جنٹلمین کے کیریکٹر میں عالی ہمتی کی صفت پیدا کرتی ہے، وہ اپنی طاقت کبھی بیجا صرف نہیں کرتا، وہ سمجھتا ہے دیو جیسی طاقت رکھنا بہت خوب ہے لیکن اس کو دیو کی طرح استعمال کرنا سخت ظلم۔

ملائمت اور شرافت جنٹلمین ہونے کی بہترین نشانیاں ہیں، دوسرے کے جذبات اور احساسات کا احترام، اپنے سے کم درجہ لوگوں، برابر والوں اور ماتحتوں کا خیال رکھنا سچے "جنٹلمین کا عام خاصہ ہے، وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے مگر کسی اور کو تکلیف نہیں پہنچنے دیتا، دوسروں کی خامیوں اور کوتاہیوں کا خمیازہ خود بھگتے گا لیکن کبھی حرف شکایت زبان پہ نہ لائیگا، یہاں تک کہ وہ جانوروں پہ بھی مہربانی کریگا، اپنی دولت پہ کبھی غرور اور رتبہ پہ فخر نہیں کرتا، بڑی سے بڑی ناکامیابی اور سخت سے سخت صدمہ اسکے دل کو غیر معمولی طور پہ ملول نہیں کرتا وہ اپنا ہمخیال بنانے کے لئے دوسروں کو مجبور نہیں کرتا وہ اپنا خیال ظاہر کرنے سے بھی باز نہیں آتا لیکن اس میں بھی وہی اصول مدّ نظر رکھتا ہے کہ کسی کو رنج نہ پہنچے، وہ کبھی اس نیّت سے مہربانی نہیں کرتا کہ دوسرا اس کا ممنون احسان ہو، اور اس کے بدلے میں اس کے ساتھ نیکی کرے، یہی وجہ ہے کہ جنٹلمین ہر جگہ عزّت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے،

جس طرح دن کی روشنی بہت ہی چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے دکھائی دے جاتی ہے، اسی طرح معمولی معمولی باتوں سے جنٹلمین پہچانا جاتا ہے۔

کیریکٹر کیوں ضروری ہے

ہر شخص کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے چالچلن سے ہوتا ہے، بُرا کیریکٹر رُتبہ کو گھٹاتا اور انسان کو اپنی اور دُوسرے لوگوں کی نظروں میں ذلیل و حقیر بناتا ہے، زندگی کے تمام کاروبار میں عقل و حکمت سے زیادہ کیریکٹر کام آتا ہے، اچھا کیریکٹر مشکلات اور مصائب کے وقت انسان کے پائے استقلال کو متزلزل نہیں نہیں ہونے دیتا، کیریکٹر لالچ اور خودغرضی کے جذبات سے محفوظ رکھتا ہے، اچھے کیریکٹر والے لوگ اپنے اور دوسروں کے مدارج اور احساسات کا ہمیشہ احترام کرتے ہیں، وہ سوسائٹی کا آفتاب ہیں ان کی شعاعیں تاریکی میں اُجالا پیدا کرتی ہیں۔

اگلے وقتوں کی سواریاں

قدیمی سواریاں | اگر ہم آج سے سَو سوا سَو سال پہلے کی سواریوں کو دیکھ لیں تو ہنستے ہنستے دوہرے ہو جائیں، اور تعجب کریں کہ ہمارے بزرگ ان میں کیونکر سیر و سفر کرتے تھے، اگرچہ زمانہ کافی ترقی کر چکا ہے، لیکن ایسے دُور اُفتادہ علاقوں میں جہاں تہذیب حاضرہ کے اسباب نہیں پہنچے ہیں اب بھی پُرانے زمانے کی سواریاں دکھائی دینگی، ہم قدیمی سواریوں پر جتنا چاہیں ہنس لیں، اور اعتراض کر لیں، لیکن ان کے پُر وقار ہونے سے ہم انکار نہیں کر سکتے، بات یہ ہے جیسا زمانہ تھا، جس طرح کی ضرورتیں تھیں اسی طرح کی سواریاں تھیں، زمانہ بدل گیا۔ زمانے کی رفتار تبدیل ہو گئی، اب ہر چیز میں پھرتی اور تیزی کی ضرورت ہے، کوئی دن آئیگا جب آنے والی نسلیں ہماری سواریوں کو تعجب کی نظر سے دیکھیں گی اور جس طرح ہم اگلے لوگوں کی سواریوں پر اعتراض کرتے ہیں، اسی طرح وہ بھی ہماری سواریوں پر نکتہ چینی کرینگی۔

مختلف ذرائع نقل و حرکت | اگر آجکل کے زمانے میں کوئی شخص پالکی میں بیٹھ کر نکلے تو دیکھنے والے حیران ہو جائیں اور کھلکھلا کر ہنس دیں،

لیکن پُرانے زمانے کے لوگ پینس پالکی ہوادار اور تام جھام ہی میں بیٹھنا اپنی شان سمجھتے تھے، نوجوان گھوڑوں پر سوار ہوتے اور غریب لوگ ڈولی ہی میں بیٹھ لیتے تھے، لمبے سفروں میں عام طور بیل گاڑیاں اور رتھیں کام آتی تھیں، ہاتھی کی سواری روٴسا کے لئے مخصوص تھی، خبر رسانی کے لئے اُونٹوں اور گھوڑوں سے کام لیا جاتا تھا یا پاؤں پیدل ہرکارے دوڑتے تھے، عام طور پر ان کی کمر میں گھونگر بندھے رہتے تھے کہ ان کی آمد کی خبر دُور دُور تک پہنچ جائے، وہ چھم چھم کرتے ہوائی رفتار سے بھاگتے اور پیغام رسانی کی خدمات انجام دیتے تھے، پینس پینس بہت پُرانے زمانے کی سواری ہے، شاید یہ چین والوں کی ایجاد ہے، سلطنت مُغلیہ کے زوال تک اس کا خوب رواج رہا، اب یہ سواری محض شادی بیاہ کے موقع پر کام آتی ہے، آج کل اگر مرد خواب میں بھی اپنے آپ کو پالکی میں بیٹھا ہوا دیکھ لیں تو بُرا شگون لیں، کوئی زمانہ تھا کہ پالکی میں بیٹھنا فخر خیال کیا جاتا تھا، اور اس سواری کے لئے مرد عورت کی کوئی تخصیص نہ تھی، اگلے زمانے میں پالکیاں بھی حسب حیثیت ہوا کرتی تھیں، اب وہ باتیں کہاں رہیں، اُمرا کی پالکیوں پر زربفت کمخواب اور مخمل جیسے قیمتی کپڑوں کے غلاف چڑھائے جاتے جس میں جابجا ریشم کے پھندنے لٹکتے تھے، بیرونی سطح پر نہایت خوشنما نقش بناتے، بعض پالکیاں سونے چاندی سے منڈھ دی جاتیں، کہتے ہیں یہ پالکیاں کئی کئی ہزار روپے میں تیار

ہوتی تھیں، بیچ میں قیمتی قالینیں بچھتیں، گاؤ تکیے لگتے کہ بیٹھنے والا جھکولوں سے محفوظ رہے، پانی کی چھاگل بیچ میں رکھی جاتی یا ملازم ساتھ لے کر چلتا، کہ پیاس لگتے ہی پانی کا کٹورا پیش کر سکے، پینس کو نہایت سبک رفتار کہار اُٹھاتے تھے، عام طور پہ ان کی رفتار دو تین میل فی گھنٹہ ہوا کرتی تھی، رؤسا کی پینسوں کے کہاروں کی نہایت زرق برق وردیاں ہوتی تھیں، ان کے پاؤں اس پھُرتی اور توازن سے پڑتے تھے کہ دیکھ کر لطف آتا تھا، کہاروں کے ایک ہاتھ میں سُنہری اور روپہلی ڈنڈے ہوتے تھے، جہاں تھک جاتے اور کندھا تبدیل کرتے وہاں پالکی کو ان پر سہارا دیتے، عموماً تین چار کہار آگے اور تین چار پیچھے لگتے تھے، اور ایک چھتر لئے ساتھ رہتا تھا، پہلو کے جس دروازے سے سواری پر دُھوپ آتی چتر بردار فوراً چھتری لئے ادھر آجاتا تاکہ سواری کو تکلیف نہ ہو، چھتر بھی سواری کی شان کے مطابق استعمال ہوتا تھا اُمرا اپنی پالکی اور اپنے کہار رکھتے، اوسط درجے کے لوگ پینس کے تمام لوازمات اپنے گھر میں رکھتے جب کہیں آنا جانا ہوتا پالکی کرایہ پر منگالی، کہاروں کو زردوز وردیاں پہنا دیں، اور پالکی کو حسب منشاء سجالیا۔

عہدے دار رؤساء کی پالکیوں کے آگے گُرز بردار چلتے تھے بادشاہوں کی سواریوں کے آگے نقیب آواز لگاتا تھا، کہاروں کی

بھڑک دار وردیاں اور سنہری روپہلی گرزوں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔

شروع میں پالکی کے دروازوں پر قیمتی پردے بھی لٹکائے جاتے تھے، جب یورپ کی سواریاں ہندوستان میں آئیں تو پہلوؤں میں غائب ہو جانے والے دروازوں کا رواج ہو گیا۔

تام جھام | تاریخوں میں تام جھام کا پتہ ۱۷۷۵ء کے بعد ملتا ہے، ممکن ہے اس کا رواج کچھ مدت پہلے سے ہو، بہرحال پینس اور پالکی کے بعد تام جھام بہت مقبول ہوا، تام جھام اور پالکی میں فرق یہ تھا، کہ پالکی چھت دار اور چاروں طرف سے بند سواری تھی اور اس قدر بڑی کہ سواری اگر چاہے تو لیٹ بھی سکتی تھی، لیکن تام جھام ایک چھوٹی سی چھت والی کرسی کی وضع کی سواری تھی، اس کی چھت میں سواری کے سر پر ایک طشتری سنہری یا روپہلی حسب حیثیت لٹکائی جاتی تھی، انسان اس طرح بیٹھ جاتا تھا جس طرح کرسی پر بیٹھتے ہیں، اسے اُٹھانے کے لئے چھ کہاروں کی ضرورت تھی، چار تام جھام اُٹھاتے اور دو عصا یا نیزے لیکر ساتھ چلتے، اگر کسی رئیس کی سواری ہوتی تو گرزبردار آگے آگے چلتا، ہندوستانی عورتیں اس کا استعمال بالکل نہیں کرتی تھیں، یہ سواری یوروپین لیڈیوں کو بہت پسند تھی کیونکہ خوب ہوادار اور کھلی تھی، دُھوپ کے وقت تام جھام کی چھتری بالکل کام نہ آتی تھی، اس لئے ایک چتربردار ساتھ رہتا اور

سواری کو دھوپ کی تکلیف سے بچاتا، اس میں فائدہ یہ تھا کہ جس طرف سے دھوپ آتی چتر بردار اُس طرف ہو جاتا اور اس طرح سواری کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پاتی۔

ڈولی | پالکی اور تام جھام کی سواریاں رؤسا کے لئے مخصوص تھیں، اوسط درجے کے آدمی خاص خاص مواقع پر ان سواریوں میں بیٹھتے تھے۔ عوام کے لئے ڈولیاں تھیں، ڈولی بہت ہی سستی سواری تھی اس کو دو کہار اُٹھاتے تھے، جہاں ڈولی کا رواج ہے وہاں اب بھی ڈولی کا کرایہ بہت سستا ہے، رؤسا زنانی سواری کے لئے ڈولیاں رکھتے تھے، لیکن انکی ڈولیوں کے پردے عام ڈولیوں سے زیادہ قیمتی اور بھڑک دار ہوتے تھے، اوسط درجے کے لوگ کرایہ کی ڈولیوں پر اپنے قیمتی اور صاف غلاف چڑھا لیتے، غرض ڈولی کی سواری ہر طبقے میں بہت زیادہ مقبول تھی، دہلی اور یوپی میں اب بھی اس کا رواج بہت زیادہ ہے، دس بارہ سال کی بات ہے کہ پردے دار قدامت پسند بیبیاں ڈولی کے سوا کسی اور سواری میں بیٹھنا معیوب خیال کرتی تھیں، جو عورتیں تانگوں میں بیٹھتیں اُن پر اعتراض کئے جاتے، اب وہ باتیں خواب و خیال ہوتی جاتی ہیں، آہستہ آہستہ تانگے مقبول ہو رہے ہیں، پہلے تانگوں پر چاروں طرف پردہ باندھنا اشد ضروری سمجھا جاتا تھا، لیکن اب محض بُرقع پہنکر بیٹھ جانا ہی کافی ہے، آج سے دس پندرہ برس پہلے گلیوں میں

بُرقع پہن کر نکلنا بُرا خیال کیا جاتا تھا، ہاں رات کے وقت تنہا راستوں میں چادر یا بُرقع اوڑھ کر دس پانچ قدم چل لیں تو چل لیں ورنہ سامنے کے مکان میں بھی بغیر ڈولی کے جانا معیوب جانتے تھے، جُوں جوں آزادی بڑھتی جاتی ہے ڈولی اور پردے کا رواج کم ہوتا جاتا ہے، کوئی دن جاتا ہے جو ڈولی تام جھام اور پالکی کی طرح معدوم ہو جائے گی۔

بیل گاڑی | جس طرح آج کل گھوڑا گاڑیاں مقبول ہیں، اگلے وقتوں میں یہی مقبولیّت بیل گاڑیوں کو حاصل تھی، لمبے سفر بہلیوں اور بیل گاڑیوں ہی میں ہوا کرتے تھے، اگر کہیں دُور جانا ہوتا تو سرِشام دروازے پر گاڑیاں آجاتیں، کئی کئی دن پہلے تیاریاں ہونے لگتیں، گاڑیبانوں کو سائیاں دیدی جاتیں، ناشتے اور کھانے کا سامان ساتھ لیا جاتا اور تاروں کی چھاؤں روانہ ہو جاتے تاکہ ٹھنڈے ٹھنڈے پڑاؤ پر پہنچ جائیں، دس پندرہ میل پر منزل ہوتی، دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کرتے، دوپہر ڈھلے پھر سفر شروع کر دیتے، اسی طرح منزل منزل پہ قیام کرتے مقامِ مقصود پر پہنچ جاتے۔

امیر لوگ بہلیوں کی جگہ رتھوں میں بیٹھتے، رتھوں میں بہلیوں کی نسبت اچھی قسم کے بیل جوڑے جاتے تھے، اگلے وقتوں میں ناگوری بیلوں کی بہت قدر تھی، جیسی جوڑی ہوتی ویسی ہی قیمت پاتی اور ان کی اس طرح دیکھ بھال کی جاتی جس طرح اعلیٰ قسم کے گھوڑوں کی

ہوتی ہے، یہ بیل چلائی میں گھوڑوں سے کسی طرح کم نہ ہوتے تھے، ان کے سینگوں پر سنگوٹیاں سونے چاندی کی چڑھاتے، غرض انہیں بنا سنوار کر رتھ میں جوڑتے تھے، رتھوں کو بھی حسب حیثیت سجایا جاتا تھا، رتھ کی چھت گنبد نما ہوتی تھی، اس پر نہایت خوبصورت سنہری کام کیا جاتا تھا، اگر کسی امیر کی سواری کہیں سے گزرتی، تو بیلوں کے گھونگروں کی آواز سے دور دور خبر ہو جاتی، لوگ باگ اپنے کام چھوڑ کر بھاگتے کہ دیکھیں کس کی سواری ہے۔

دھکا گاڑی

سنہ ۱۸۴۰ء میں ایک نئی قسم کی سواری وجود میں آئی، انگریز اس کو "پش پش" کہا کرتے تھے، ہم لوگ اسے دھکا گاڑی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اس کو آدمی کھینچتے ہیں، شروع میں اس کی ہیئت بالکل ٹھیلے کی سی تھی، فرق صرف اتنا تھا کہ ٹھیلے پر چھت نہیں ہوتی اس پر چھت بھی ہوتی تھی، اس کا دروازہ پیچھے رکھا جاتا تھا، جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا یہ گاڑی بھی ضرورتوں کے مطابق اپنے آپ کو تبدیل کرتی رہی، یہاں تک کہ "پش پش" کے نام کو خیر باد کہہ کر رکھشا کہلوانے لگی۔

اس گاڑی میں خوبی یہ تھی کہ چھوٹے اور تنگ بازاروں میں آسانی سے جا سکتی تھی چونکہ ہلکی پھلکی تھی اس لئے ایک دو آدمی آسانی سے کھینچ سکتے تھے، یورپین خواتین اس کو بہت شوق سے استعمال کرتی تھیں، اس کی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ گھوڑا گاڑی کی نسبت اس پر خرچ بہت کم ہوتا تھا، اس لئے ہر متوسط الحال شخص رکھ سکتا تھا، پھر بھی

یہ گاڑی ہندوستانیوں میں بہت کم مقبول تھی۔

بعض شہروں میں اب بھی یہ گاڑی خال خال نظر آتی ہے معدودے چند یورپین خواتین کی بدولت اس کی ہستی قائم ہے، ورنہ حقیقتاً اس کا عدم وجود برابر ہے، ہاں صحت افزا کوہستانی مقامات پر یہ گاڑیاں رکھشا کے نام سے بہت زیادہ مقبول ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ پہاڑی شہروں میں سڑکیں بہت تنگ ہیں اور چڑھائی اُترائی اس قدر کہ گھوڑا گاڑی یا کوئی اور سواری وہاں کام نہیں دے سکتی، اس لئے نقل و حرکت میں رکھشا ہی کام دیتی ہے، پانچ پانچ چھ چھ آدمی اس کو کھینچتے ہیں، ہموار سڑکوں پر آٹھ دس میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھاگتے ہیں، اُترائی پر بھی ہوا سے باتیں کرتے ہیں لیکن چڑھائی کے ساتھ ساتھ رفتار ہلکی ہوتی جاتی ہے، مسلسل چڑھائی میں رکھشا قلیوں کا بُرا حال ہوتا ہے، ہانپتے ہیں، کانپتے ہیں اور پیٹ کی خاطر خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ رقیق القلب انسان ان کی حالت دیکھنے کے بعد رکھشا میں بیٹھنا گوارا نہیں کرتا، لیکن جہاں کوئی اور سواری نہ ہو اور سواری کے بغیر کام بھی نہ چلے وہاں رکھشا کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

گھوڑا گاڑی | تقریباً سنہ ۱۷۸۰ء میں بیل گاڑیوں کی جگہ گھوڑا گاڑیوں نے لے لی، گھوڑا گاڑی کی مقبولیت کی دو وجہیں ہوئیں، ایک تو بیل گاڑی کی نسبت ان کی رفتار تیز تھی، دوسرے ان میں آرام بھی کسی قدر زیادہ

ملتا تھا، پھر اب سے دس پندرہ سال پہلے رتھوں اور بیل گاڑیوں کا عام رواج تھا، جہاں گھوڑا گاڑی کام نہیں دیتی وہاں بیل گاڑیاں ہی چلتی تھیں،

ہندوستان کی بندرگاہوں میں چونکہ یورپین کی آبادی زیادہ تھی، اس لئے گھوڑا گاڑیاں سب سے پہلے وہیں وجود میں آئیں، چنانچہ ۱۷۸۰ء میں ٹمٹم کا رواج ہوا، ٹمٹم کو ایک گھوڑا کھینچتا اور اس میں ایک ہی سواری کی جگہ ہوتی تھی، یورپین لیڈیز اسے بہت پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ خود گاڑی چلا سکتی تھیں، ہمارے امرا سائیسوں کے پاس بیٹھنا یا خود گاڑی چلانا اپنی شان کے خلاف خیال کرتے تھے، اس لئے یہ گاڑی ان کو مرغوب نہ تھی، ان گاڑیوں کے مقبول نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ سڑکیں اچھی نہ تھیں اور گاڑی کو خود چلانا برا سمجھا جاتا تھا۔

بہرحال چند سال بعد گاڑیوں کی بناوٹ میں تبدیلی واقع ہوئی، اب گاڑیبان کی جگہ سواریوں سے علیحدہ بنی اور نئی قسم کی گاڑی وجود میں آئی، یہ نئی گاڑی بالکل ایسی ہی تھی جس طرح آج کل عیسائیوں کے جنازے لے جانے کی گاڑی ہوتی ہے، فرق صرف اتنا تھا کہ جنازہ گاڑی کو انسان کھینچتے ہیں اور اس گاڑی کو گھوڑے چلاتے تھے، ٹمٹم بھی پرانی سواری ہے اسے ایک گھوڑا کھینچتا تھا، عام طور پر مسافر (... مفرد) ہیں، دس پندرہ میل کے بعد گھوڑے بدلے جاتے تھے،

چونکہ ٹمٹم بیل گاڑیوں کی نسبت تیز رفتار تھی، اس لئے ڈاک لانے لیجانے کا کام بھی اسی سے لیا گیا، بعد میں اس کی رفتار تیز کرنے کے لئے ایک گھوڑے کی بجائے دو دو گھوڑے لگانے لگے وہ بھی منزل بہ منزل تبدیل ہوتے جاتے تھے، تاکہ جلد ہی سے جلدی ڈاک اور سواریوں کو منزل مقصود پر پہنچا دیا جائے، ٹمٹم میں کوچوان کے علاوہ چار پانچ سواریاں اور بھی بیٹھ سکتی تھیں، پہلے ٹمٹم میں بیٹھنے کی جگہ کرسی دار نہیں تھی، ٹمٹم کو آرام دہ سواری بنانے کے لئے دو تختے پہلو میں لگائے گئے تاکہ سواری آرام سے اس طرح بیٹھ سکے جس طرح کرسی پر پیٹھ لگا کر بیٹھتے ہیں، تھوڑی مدت بعد ان بیٹھنے کے تختوں پر گدیلے نصب کئے گئے، دھوپ اور بارش سے بچنے کے لئے چھت اور پردوں کا بھی اضافہ ہوا، امیروں کی سواریوں کی دیکھا دیکھی ان میں سپرنگ دار گدیلے لگے، اور پہیوں پر ربڑ کے ٹائر چڑھ گئے، غرض یہ سواری اچھی خاصی آرام دہ بن گئی، شہروں میں آج کل ٹمٹم کا رواج بالکل نہیں رہا، ہاں ترقی یافتہ دیہاتوں اور قصبوں میں یہ سواری ابھی تک پائی جاتی ہے، اور لوگ اس کو بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔

ایکہ قدیمی سواریوں میں ایکہ بھی ایک نہایت دلچسپ سواری تھی، صوبجات متحدہ اور اودھ میں اس کو بہت مقبولیت حاصل تھی، پنجاب میں اس کی جگہ ٹمٹمیں چلتی تھیں، حق یہ ہے کہ ٹمٹم اس کے مقابلے میں نہایت آرام دہ سواری تھی، اس میں سب سے پہلی خرابی تو یہی تھی کہ تین

سواریاں اور ایک کو چوان مشکل سے بیٹھ سکتا تھا، ٹمٹم کی طرح اس میں بیٹھنے کی سیٹیں پاؤں رکھنے کی سطح سے اونچی نہ تھیں، اس لئے سواری بہت تکلیف ہوتی تھی، عام طور پر لوگ پاؤں لٹکا کر بیٹھتے تھے، جو کبھی کبھی پہیوں میں پھنس جاتے، ایکے میں بیٹھنے کا ایک خاص طریقہ تھا، جس سواری کو اس کی مشق ہوتی وہ بہت مزے سے بیٹھتا اور جو شخص اس سے ناواقف ہوتا وہ اس سواری میں بے چین ہی رہتا تھا۔

ترقی کی دوڑ میں ایکہ بھی اور سواریوں سے پیچھے نہیں رہا، ربڑ ٹائر و ہیل نے اسے کافی آرام دہ بنایا، لیکن سواری کے آرام سے بیٹھنے کی کوئی نئی تدبیر نہ سوجھی آخر فیشن کی دلدادگی نے اسے کنڈم کر دیا، ورنہ ممکن تھا کہ قدیمی سواریوں کی یاد اس سے مدتوں تازہ رہتی، دہلی میں تو ایکہ دیکھنے کو بھی نہیں ملتا، ہاں یو، پی میں ابھی اس کا تھوڑا بہت رواج باقی ہے اور وہ بھی روز بروز کم ہو رہا ہے، اس کی جگہ تانگے لے رہے ہیں، کرایہ کم ہونے کی وجہ سے غریب طبقہ اس کا قدر دان ہے، ورنہ کب سے خاتمہ ہو چکا ہوتا، بہر حال اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایکہ بھی خوب پر لطف اور مختصر سی سواری ہے، اس کے سفید سفید گدیلے، دھوپ اور مینہ سے بچنے کے لئے چھوٹی سی ناکافی چھتری قدیم زمانے کی یاد تازہ کرتی ہے۔

شکرم | شکرم قدیمی سواری نہیں، اس کو قدیم اور جدید سواریوں کے بیچ کی کڑی سمجھنا چاہئے، ابھی چند دن کی بات ہے کہ شکرم کو عام مقبولیت حاصل تھی، پردہ دار سواری ہونے کی وجہ سے اس کو

اس وقت تک چلنا چاہیئے تھا جب تک ہندوستان میں سختی سے پردے کا رواج ہے، لیکن پتہ نہیں کیا وجوہ ہوئے جو چند سالوں میں اس کا نام تک باقی نہیں رہا۔ نئی پود کے سامنے اگر شکرم کا ذکر کیا جائے تو شاید ان کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آئیگا، بند گاڑی کے نام سے ممکن ہے وہ کوئی تصویر اپنے دماغ میں بنا سکیں۔

بند گاڑی یا شکرم بڑے آرام کی سواری تھی، اس کو عام طور پر دو گھوڑے کھینچتے تھے، اس کے دونوں پہلوؤں میں دو دروازے اور چاروں طرف کھڑکیاں ہوتی تھیں، جو ریل گاڑی کی کھڑکیوں کی طرح بستے دار بنائی جاتی تھیں، زنانی اور پردہ دار سواریوں کو اس میں بہت آرام ملتا تھا، غالباً ان کا کرایہ بہت زیادہ تھا، اس لئے وہ تانگوں اور ٹمٹموں کا مقابلہ نہیں کر سکیں۔

فٹن | فٹن بہت پرانی سواری ہے، یہ سواری سنہ ۱۷۹۰ء سے ہندوستان میں چل رہی ہے، ہمارا دیس اس کو دیسی خیال کرتا ہے، لیکن یہ بدیشی اصل ہے، سب سے پہلے اس کا رواج کلکتہ میں ہوا تھا، وہاں صاحب لوگوں کی تجارتی کوٹھیاں تھیں، وہ ہندوستانی سواریوں کو اپنے ملک کی سواریوں جیسا سبک رفتار اور آرام دہ نہ پاتے تھے اس لئے انہوں نے انگلستانی وضع کی گاڑیاں تیار کرائیں، کہتے ہیں نمونے کے لئے ولایت سے گاڑی منگائی گئی تھی، لیکن سوء اتفاق سے جہاز راستے میں ڈوب گیا، آخر ہندوستانی مستریوں کو ہدایات دے کر فٹن تیار

کرائی گئی۔ ناتجربہ کاری اور ناواقفیت کی وجہ سے اس پر بہت زیادہ روپیہ صرف ہوا، جب انگلستان سے نمونے کی گاڑی آئی تو نئی قسم کی گاڑیاں تیار ہوئیں، آرام کی دھن میں اس پر طرح طرح کے انقلابات گزرے، یہ سواری جب سے اب تک نہایت عزت اور احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔

موٹر کے رواج سے پہلے رؤسا فٹن ہی رکھا کرتے تھے، عام طور پر فٹن میں دو گھوڑے جوتے جاتے تھے، ہلکی فٹنوں میں ایک گھوڑا بھی کام دے جاتا تھا، رؤسا اپنی شان بڑھانے کے لئے پانچ چھ گھوڑے تک جوت لیا کرتے تھے، کوچوان کو نہایت زرق برق لباس پہناتے، ایک یا دو آدمی چونری لے کر پیچھے کھڑے ہوتے، دو سائیس پہلوؤں میں پائیدان پر تعینات رہتے، جہاں کہیں راستے میں بھیڑ زیادہ ہوتی، وہ پائیدان سے اُتر کر ہٹو بچو کا شور مچاتے، گھوڑے کے آگے آگے یا پہلوؤں میں آٹھ دس میل کی رفتار سے دوڑتے، گھوڑوں کے طلائی اور نقرئی ساز سواریوں کی امارت کی شہادت دیتے تھے۔

فٹن کا رواج بڑے بڑے شہروں میں اب بھی ہے، کراچی، کلکتہ، اور بمبئی میں فٹنیں کرایہ پر چلتی ہیں، رؤسا بھی اس شوق سے کلیتاً مستغنی نہیں ہوتے، چھوٹے چھوٹے شہروں میں فٹنیں کم دکھائی دیتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تانگوں کی نسبت ان کا کرایہ قدرے زیادہ ہوتا ہے، اس لئے عوام تانگوں کی طرف زیادہ راغب ہیں۔

ٹرام | گزشتہ صدی کے آخری ربع میں بڑے بڑے شہروں میں ٹرام کا رواج ہوا، شاید آپ کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ شروع میں ٹراموں کو گھوڑے کھینچتے تھے، کیونکہ اس وقت تک ہندوستان میں بھاپ اور بجلی کی طاقت کو استعمال کرنے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ ایک ٹرام کو پانچ سات گھوڑے چلاتے تھے، لاہور میں گھوڑا ٹرام شہر کے باہر چلتی تھی، کلکتہ کے بازار چونکہ کشادہ تھے اس لئے ٹرام کی لائن شہر میں بچھادی گئی تھی۔

بعض مقامات پر "مانو گاڑی" کے نام سے ایک خاص قسم کی ٹرام کا رواج تھا، یہ مانو گاڑی بہت دلچسپ قسم کی سواری تھی اس کا ایک پہیہ آہنی لائن پر چلتا تھا، دوسری جانب کے دو پہیے سڑک پر رہتے تھے، غالباً اسی وجہ سے اس کو مانو کہتے تھے، اس کو بھی چار پانچ گھوڑے کھینچتے تھے، جب کبھی گھوڑے بدک جاتے یا چلتے چلتے مقررہ راستے سے اِدھر اُدھر ہوجاتے تو مانو گاڑی قلابازی کھاجاتی، اکثر توازن بگڑنے سے بھی حادثے پیش آجاتے، یہ ٹرام لمبے فاصلوں کے لئے استعمال ہوتی تھی، آج سے بیس پچیس سال پہلے سرہند اور روپڑ کے درمیان مانو گاڑی پندرہ بیس میل تک چلا کرتی تھی، اب ہندوستان میں نہ تو کہیں گھوڑا ٹرام نظر آتی ہے اور نہ مانو گاڑی، گھوڑا ٹرام کی جگہ ۱۸۸۳ء میں دخانی ٹرام، اور ۱۹۰۲ء میں برقی ٹراموں نے لے لی، اور مانو گاڑی اور گھوڑا ٹرام کا نام محض

ان لوگوں کے دماغ میں باقی رہ گیا جنھوں نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا،

برقی ٹرام ہندوستان کے بعض بڑے بڑے شہروں میں برقی ٹرامیں جاری ہیں، ٹرام کی سواری نہایت سستی اور آرام دہ ہے، اس سے وہی لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جن کے شہر اور سڑکیں وسیع ہیں، یہی وجہ ہے کہ لاہور اور لکھنؤ جیسے گنجان شہر ٹرام کی خدمات سے محروم ہیں، ٹرام کا رواج کلکتہ، بمبئی، دہلی اور کراچی میں بہت زیادہ ہے، حق یہ ہے کہ وہاں کی ٹرام کاریں دہلی کی ٹراموں کی نسبت بہت زیادہ آرام دہ ہیں، دہلی کی ٹرام سے ہر ایک کو شکایت ہے، اس لئے آئے دن اخبارات میں لے دے ہوتی رہتی ہے کہ بہتر قسم کی ٹرامیں تیار کرائی جائیں، جن کے چلنے میں شور کم پیدا ہو، موجودہ ٹرامیں اس قدر بھدی اور شور خیز ہیں کہ جہاں سے گزرتی ہیں مکانوں کی بنیادیں ہلا دیتی ہیں، اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، جو لوگ اس کی سمع خراش آواز سے مانوس نہیں ہوتے انہیں اس سے سخت دماغی کوفت ہوتی ہے۔

ریل گاڑی ۱۸۵۳ء سے پہلے ہندوستان میں کوئی شخص ریل گاڑی کے نام سے بھی واقف نہ تھا، لمبے لمبے سفر بیل گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں میں ہوا کرتے تھے، حکومت ہند کی طرف سے ۱۸۴۵ء میں بیل گاڑی سروس کو باقاعدہ کیا گیا، ۱۸۵۰ء میں یہ سروس بنارس سے لاہور تک جاری ہوئی، اسی سال بنارس سے لے کر دہلی تک بیل گاڑیوں کی جگہ گھوڑا گاڑیوں

کو رواج دیا گیا، مسافروں سے ایک آنہ فی میل کے حساب سے کرایہ لیا جاتا تھا، اس حساب سے بنارس سے دہلی کا کرایہ ۲۸ روپے ۱۰ آنے ہوتا تھا، اس زمانے کے لوگ اس گھوڑا ڈاک کو نہایت آرام دہ خیال کرتے تھے، ذرا آجکل کے زمانے سے اُس وقت کا مقابلہ کرکے دیکھو، ریل چالیس پچیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے مسافروں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے، ایک وہ بھی زمانہ تھا جب گھوڑا ڈاک آٹھ نو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتی تھی، اور لوگ اس کو آرام دہ سواری کہتے تھے۔

۱۸۵۳ء میں پہلی مرتبہ ریل گاڑی ہندوستان میں چلی، یہ ریل جی، آئی، پی ریلوے کمپنی نے جاری کی تھی، جو بمبئی سے تھانہ تک جاتی تھی، اس کے بعد بہت سی ریلوے کمپنیاں وجود میں آگئیں اور ہندوستان کی سرزمین پر ریلوے لائنوں کا جال بچھتا چلا گیا۔

۱۵ اگست (۱۸۵۴ء) کا دن کلکتہ والوں کے لئے نہایت جوش و خروش اور دلچسپی کا دن تھا، کیونکہ اُس دن ہاوڑا سے پہلی ریل گاڑی ہگلی کو روانہ ہونے والی تھی، کہتے ہیں کہ تین ہزار سے زیادہ آدمیوں نے ٹکٹ خریدنے کے لئے درخواست دی تھی، لیکن سوائے تین سو اشخاص کے سب کو مایوس ہونا پڑا، اس ٹرین میں تین فرسٹ کلاس کے ڈبے تھے، دو سیکنڈ کلاس کے، اور تیسرے درجے کے مسافروں کے لئے تین ٹرک تھے، آخر میں ایک گاڑی جناب گارڈ کے لئے تھی، جو بریک وان کے ساتھ ملحق تھی، کمپنی کا کل اثاثہ فقط یہی گاڑیاں تھیں جو ہندوستان

میں تیار ہوتی تھیں۔

اُس ابتدائی زمانے میں رات کے وقت کوئی گاڑی نہیں چلتی تھی، اور اتوار کو محکمہ ریل میں چھٹی ہوا کرتی تھی۔

نئے زمانے کی سواریاں

پرانے وقتوں کی سواریاں ہم نے دیکھ لیں، کیسی پُروقار سواریاں تھیں، سہج سہج چلتی تھیں، ان میں سوار ہونے کے لئے کس قدر استقلال اور مستعدی کی ضرورت تھی، ذرا سی دُور جانا ہوتا تھا تو کتنی زبردست تیاریاں کرنی پڑتی تھیں، ایک یہ زمانہ ہے کہ وقت کی پرواز بجلی کی رفتار سے لگّا کھاتی ہے، ہر کام کو اگر وقت پر نہ کیا جائے، تو سمجھ لو موقع ہاتھ سے نکل گیا ضرورت ایجاد کی ماں ہے، جیسی جیسی ضرورتیں پڑیں ویسی ویسی سواریاں ایجاد ہوئیں، جہاں ریل کام نہیں دیتی وہاں موٹر کار چلتی ہے، جہاں موٹر کام نہیں آتی، وہاں ہوائی جہازوں پر اُڑا جاتا ہے، اگلے زمانے کی سواریوں کا اگر آج کل کے زمانے کی سواریوں سے مقابلہ کریں تو ہم اپنے زمانے کی سواریوں کو بہت ترقی یافتہ پاتے ہیں، اور اگلے زمانے کی سواریوں کی ہنسی اُڑاتے ہیں، ترقی کی رفتار بتا رہی ہے کہ آنے والے زمانے میں نقل و حرکت کے ذرائع میں اور بھی زیادہ ترقی ہوگی اور ہماری سواریوں کو اُس خوش قسمت زمانے کے لوگ بھدّا سُست رفتار اور مضحکہ خیز بتائیں گے۔

سیر و سفر

زبیں جنبد نہ جنبد گل محمد

(ترقی یافتہ ممالک میں سفر کو بڑی اہمیت حاصل ہے، جس شخص نے بہت سے سفر نہ کیئے ہوں اس کو ناتجربہ کار اور ناواقف کہتے ہیں، اس کی تعلیم چاہے کتنی ہی اعلےٰ کیوں نہ ہو مگر ادھوری سمجھتے ہیں، ہمارے ملک کی حالت اس کے برعکس ہے، آج کل اگرچہ ذرائع آمد و رفت کی ترقی اور توسیع سے سفر میں پہلے جیسی تکلیفیں نہیں ہیں، لیکن پھر بھی ہم لوگ سفر کے نام سے گھبراتے ہیں، ہم لوگوں میں کثرت ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے وطن مالوف میں جانگیر ہونا اپنا ایمان اور اپنے شہر کو چھوڑنا گناہِ عظیم خیال کرتے ہیں) یہ نہیں سمجھتے کہ وطن کو انکی ضرورت بھی ہے یا نہیں، وہ نام نہاد حبّ وطنی کی بدولت ذلیل و خوار ہو رہے ہیں یا وطن کی عزت ان کے وجود سے خطرے میں پڑ گئی ہے۔

سفر سقر کیوں تھا

(گزشتہ صدی کے لوگ سفر کو سقر سے تعبیر کرتے تھے) حق یہ ہے کہ ان کا یہ کہنا ایک حد تک بالکل درست تھا، کیونکہ انکے زمانے میں سفر میں بڑی دقتیں اور صعوبتیں اٹھانی پڑتی تھیں، نہ سڑکیں تھیں نہ ریل گاڑیاں نہ موٹر کاریں تھیں نہ ہوائی جہاز، لمبے سفر بیل گاڑیو اور رتھوں میں طے کئے جاتے تھے، اور سفر کے لئے ایسا موسم انتخاب

کیا جاتا تھا کہ بارش اور گرمی سے محفوظ رہیں، سردیوں میں دن کو اور
گرمیوں میں سورج نکلنے سے پہلے اور ڈھلنے کے بعد سفر کرتے تھے،
رات کو سفر کرنا جان جوکھوں کا کام تھا، لوٹ مار کے ڈر سے لمبا سفر
کرنا ایک آدمی کے بس کا روگ نہ تھا، قافلے تیار ہوتے تھے، اپنی
مرضی کے مطابق ہم سفر تلاش کیئے جاتے تھے کہ سفر آرام اور لطف سے
کٹے، غرض اگلے زمانے میں سفر کے لوازمات مہیّا کرنا اور سفر کرنا
اچھّا خاصا مشکل کام تھا، اسی لیئے وہ لوگ سفر کو سقر کہتے تھے،

اب تو دُنیا ہی بدل گئی ہے، ذرائع آمد و رفت میں ایسی ترقیاں
ہُوئی ہیں کہ دیکھنے والے حیران ہوتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ہم نہایت
ہی خوش قسمت ہیں جو ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں، ریلوں،
موٹروں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے مہینوں کے سفر ہفتوں میں اور ہفتوں
کے دنوں میں، اور دنوں کے راستے گھنٹوں میں طے ہو جاتے ہیں، پھر
کیا مجال کہ پہلے جیسی تکلیفیں یا دِقّتیں پیش آئیں، اسی لیئے اب "سفر
کو حضر" کہتے ہیں، شام کو ریل میں پڑ کر سو جاؤ، صبح اپنے آپ کو تین
چار سو میل کے فاصلے پر پاؤ، ہندوستان کی مشرقی سرحد سے چلو اور
چوتھے دن شمال مغربی سرحد پر پہنچ جاؤ، نہ کرایہ زیادہ، نہ کسی ہم سفر
کو تلاش کرنے کی ضرورت، نہ دُنیا زمانے کے ساز و سامان ساتھ لیجانے
کی حاجت، جہاں جاؤ ہر چیز موجود، جو چاہو اشاروں پر حاضر، غرض آج
کل سفر نہایت آسان ہو گیا ہے مگر اتنی آسانیاں اور آرام ہونے کے باوجود

ہماری قدامت پرستی کا یہ عالم ہے کہ اب بھی ہم لوگ سفر کو اچھّا نہیں سمجھتے سفر سے گھبرانا ہماری گھٹی میں پڑا ہے (اور سفر کے شوقینوں کو سیلانی جوڑے اور آوارہ کہدینا ہم لوگوں کے لئے ایک معمولی سی بات ہے۔

سفر بعض امراض کا علاج ہے (اگلے زمانے کے لوگ اگرچہ سفر کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن وہ سفر کی خُوبیوں وہ سفر کی خُوبیوں سے ناواقف نہ تھے) (ہمارے قدیمی اطبّا سفر سے بعض مرضوں کا علاج کیا کرتے تھے، جب کسی شخص پر انتہا درجے کی گردش اور پریشانی آجاتی تو حکما مشورہ دیتے کہ سیر و سفر کرو، جب کسی کا دماغ اپنے توازن کو چھوڑ دیتا اُس وقت بھی سفر تجویز کیا جاتا، وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ سفر پریشانیوں کو دُور کر کے منتشر خیالات کو ایک طرف منعطف کر دیتا ہے، سفر سے دماغی کلفتیں دُور ہو جاتی ہیں، اور خیالات میں یکسوئی، طبیعت میں اطمینان اور سکون پیدا ہوتا ہے (

گردشِ ایّام کا اُتار سیر و سفر سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا (نئی آب و ہوا جسم و جان میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتی ہے) وہ لوگ جو اپنے وطن میں گمنام ہیں، دوسرے ممالک میں آفتاب اور مہتاب ہو کر چمک سکتے ہیں۔

سفر کی علامات | ہم لوگوں میں سفر پیش آنے کی خاص خاص علامات ہیں، اور ان پر ہمیں پُورا پُورا اعتقاد ہے، جب کسی کے تلوے میں کھجلی ہوتی ہے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ سفر درپیش ہے، اس کی حرکات و سکنات سے

پریشانی ظاہر ہونے لگتی ہے اور یہ فکر دامنگیر ہو جاتا ہے کہ دیکھئے کہاں کا سفر کرنا پڑتا ہے، سفر کے خیال سے رات دن دماغ پریشان رہتا ہے، ہر آنے والے خط کو دیکھتے ہی یہ گمان گذرتا ہے کہ سفر کا پیام آ گیا، اس دوران میں اگر کہیں سفر کرنا پڑ جائے تو یہ اعتقاد اور بھی زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہمارے تلوے میں کئی دن سے کھجلی ہو رہی تھی، تلوے میں کھجلی ہونے سے سفر کا پیش آنا بہت قدیمی اعتقاد ہے، چنانچہ اُستاد ذوق نے بھی اس کی تائید فرمائی ہے ع

مژدہ اے ذوق جنوں تلوا مرا کھجلائے ہے

سفر کا بھوت | ہندوستانی مسافر کی بدحواسی ضرب المثل کی طرح مشہور ہے، اور سو فیصدی بولتی چالتی متحرک تصاویر سے کم دلچسپ نہیں، اس پر سفر کا بھوت سفر سے کئی دن پہلے سوار ہو جاتا ہے، ہر فعل اور ہر بات سے گھبراہٹ اور پریشانی ظاہر ہوتی ہے، اول تو رخت سفر باندھتے وقت کئی ایک چیزیں رہ جاتی ہیں، جو ریل میں بیٹھ کر یاد آتی ہیں، اگر گھر اور سٹیشن کے درمیان یاد آ گئیں تو واپس لوٹ آئے یا کسی ساتھی کو دوڑا دیا، اگر گھر والوں کے نظر چڑھ گئی تو پیچھے پیچھے آدمی بھاگا، گھر سے نکلنا، گاڑی میں سوار ہونا اور ریل گاڑی میں بیٹھنا دار و گیر کا نظارہ پیش کرتا ہے، گھر والوں سے رخصت ہونا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا، کسی سے بغلگیر ہوئے، کسی کو پیار کیا، کسی سے دعائیں لیں کسی کو دعائیں دیں، امام ضامن کا پیسہ بازو پر بندھوایا،

کسی کو دیکھ کر خود آبدیدہ ہوئے، کوئی ان کو دیکھ کر چشم پُرنم ہوا، چلتے وقت کسی کی زبان پر شگونی کلمات آئے، کسی نے راستے میں پانی پھینکا، کوئی آگے آگے بھاگا کہ رستے میں کوئی عورت نہ آجائے، کسی بڑی بوڑھی نے چلتے وقت کچھ پیسے دیئے کہ فقیروں کو دیتے جانا، کسی نے بازو پکڑ کر دعا پڑھی، کوئی ساتھ ساتھ گاڑی پر سوار کرنے آیا، غرض گھر سے نکلنا قیامت کا منظر ہے۔

ادھر میاں مسافر جن پر سفر کا بھوت سوار ہے گھر سے نکلے، سفر کی پریشانی میں کچھ بھولے کچھ یاد رہا، جو کچھ ہو سکا ساتھ لیا، خُدا خُدا کر کے سٹیشن پر پہنچے، سامان اُتارا، بار بار گنا، پھر بھی ایک آدھ چیز تانگے میں رہ گئی، ٹکٹ خریدنے پہنچے، کہیں کا ٹکٹ مانگ رہے ہیں، کہیں اور جانا چاہتے ہیں، بابو نے بھی جانچ لیا بہت گھبرائے ہوئے ہیں، دام لئے ٹکٹ دیا، لیکن بقایا میں کچھ نہ کچھ اُڑا لیا، بچارے مسافر کو اتنی فرصت کہاں کہ حساب کرے، اور اگر حساب کرے بھی تو وہ درست کیونکر ہو سکتا ہے، ایسے موقع سے بابو لوگ خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں اور کچھ نہیں تو یاروں دوستوں کے کھوٹے روپے ہی دھانس دیتے ہیں، مسافر گھبراہٹ میں کچھ نہیں دیکھتا جو کچھ ملا وہ جیب میں ڈالا اور سیدھا پلیٹ فارم کا رُخ کیا، قُلی کے آگے پیچھے گرتے پڑتے اندھا دُھند چلے جاتے ہیں، گاڑی میں سامان رکھا، قلی کو پیسے دیئے، اگر قُلی نے جھگڑا نہ کیا تو ذرا آرام

کا سانس آیا، ورنہ قلی کی جھک جھک سے پریشانی اور بڑھ گئی، جوں جوں مسافر کی پریشانی بڑھتی جاتی ہے قلی کو اپنی کامیابی کا یقین ہوتا جاتا ہے، یہانتک کہ جو چاہتا ہے وہی لے کر ٹلتا ہے اور مسافر کو اس قدر پریشان کر جاتا ہے کہ گھنٹوں اس کے حواس ٹھکانے نہیں آتے، ہوش و حواس درست ہونے پر اب جو سامان کا جائزہ لیتے ہیں تو کوئی نہ کوئی چیز کم ہے، مگر پتہ نہیں چلتا کہ کیا چیز کم ہے اور یاد نہیں آتا کہ گھر رہ گئی یا راستے میں خورد برد ہوئی، قلی اور تانگے والے کو بے نقط سُنا رہے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ چیز گھر ہی بھول آئے ہیں، اب جو ٹکٹ دیکھتے ہیں تو وہ بھی غائب، اکثر ایک ایک جیب کو دس دس بار دیکھنے کے بعد ٹکٹ نکل ہی آتا ہے، کبھی ٹکٹ گھر سے ریل گاڑی تک آنے میں ضائع بھی ہو جاتا ہے، اب بقایا کا جائزہ لیتے ہیں تو کم، یا بالکل ہی غائب، کسی جیب کترے نے ہاتھ صاف کیا یا خود کہیں پھینک آئے، روپوں کو پرکھتے ہیں تو کھوٹے، حیران ہیں کیا کریں کیا نہ کریں، "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" سامان چھوڑ کر کہاں جائیں، خطرہ ہے رہا سہا سامان بھی غائب ہو جائے کچھ نہیں تو بیٹھنے کی جگہ ہی پر کوئی دوسرا قبضہ کر لے، غرض سفر زدہ مسافر کے ہوش و حواس ریل چلنے کے بہت دیر بعد تازہ ہوا لگ کر درست ہوتے ہیں، پھر بھی منزل مقصود تک پہنچنے کی بےچینی، نئے نئے مسافروں کی درآمد اور برآمد آرام نہیں لینے دیتی، خُدا خُدا کر کے

منزلِ مقصود پر پہنچتے ہیں، پھر اسی بدحواسی اور پریشانی سے سابقہ پڑتا ہے، اگر سوءِ اتفاق سے قلی غائب ہو جائے تو اُس کا نمبر دیکھ لینے کے باوجود بھول جاتے ہیں، قلی بچارا کہاں جائے گا، یہ اُس کو ڈھونڈھتے ہیں، وہ ان کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے، آخر وہ ان کی پریشانی اور بدحواسی ہی سے ان کو پہچانتا ہے، اب تانگے ہیں سامان رکھا، قلی کے جھگڑے سے نبٹے، چُنگی خانے کے داروغہ کو سامان کا جائزہ دیا، نئی چیزوں پر جھگڑا شروع ہوا، یہ کہتے ہیں استعمال کی ہوئی چیز ہے، وہ کہتا ہے نئی ہے، بمشکل تمام گھر پہنچے یا ہوٹل میں اُترے، اور غضب یہ ہوا کہ اُترتے وقت تانگے میں ٹرنک چھوڑ گئے، پولیس سٹیشن پر پہنچے، دن رات اِدھر اُدھر مارے مارے پھرے، جس کام کے لئے آئے تھے اُس کا ہوش نہیں، سامان ریل میں رہا کہ تانگے میں، اس بات کا بھی پوری طرح یقین نہیں، ایک ٹانگ سٹیشن پر ہے دوسری تھانے میں، غرض اس پریشانی کا سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہتا ہے۔

ہمارے مسافروں کی انہی بدحواسیوں کو دیکھتے ہوئے ریل کے ساتھ پولیس کے سپاہی چلتے ہیں وہ مسافروں کو ہوشیار کرتے رہتے ہیں، گم شدہ سامان کے دفاتر قائم ہیں، جن میں ہزاروں روپے کا مال دن رات آتا رہتا ہے، کمیٹیوں نے تانگوں کی دیکھ بھال کے لئے انسپکٹر مقرر کر رکھے ہیں تاکہ گم شدہ مال برآمد کرانے میں مسافروں کو

مدد دیں، قصہ کوتاہ ہم لوگ سفر سے بہت ہی پریشان ہوتے ہیں،
اس لیئے سفر کو سقر کہتے ہیں۔

مُسافر نوازی | مشرقی ممالک کے باشندے جن کو نام نہاد تہذیب یافتہ اور متمدن اقوام غیر متمدن اور غیر مہذب کہتے ہیں مہمان نوازی اور مسافر نوازی میں تمام اقوام عالم سے آگے ہیں، قدم قدم پر مسافر خانوں اور سراؤں کا ہونا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ مسافر نوازی ہمارے بزرگوں کا ایمان تھا، وہ مسافروں کی ایسی خاطر مدارات کرتے تھے، کہ مُسافر اپنے گھروں کا آرام و آسائش بھُول جاتے، ان کی مہمان نوازی میں برسوں فرق نہ آتا، آخر مہمان ہی کا دل انکی مہمانداری سے تنگ آجاتا، ہمارے شمال مغربی سرحدی صوبے کی بعض اقوام مہمان نوازی میں سب سے بڑھ گئی، کہتے ہیں مہمانوں پر آپس میں قتل و خون ہو جانا ان کے ہاں معمولی سی بات ہے، کیا مجال جو کسی کے مہمان پر دوسرا قبضہ کر لے، سیّدوں کی خاطر مدارات اور تعظیم و تکریم ان کا عام شیوہ ہے، اگر کوئی سیّد مہمان آجائے تو اُسے کسی طرح جانے نہیں دیتے، جب دیکھتے ہیں کہ یہ ہاتھوں سے چلا تو جان سے مار کر اس کی قبر اپنے گھر میں بنا لیتے ہیں، اس کی قبر کا احترام ہمیشہ قائم رہتا ہے، اس پر قوالیاں ہوتی ہیں، منتیں مُرادیں مانی جاتی ہیں، لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے، غرض مہمانی اور مہمان نوازی کا ایک لامنتہا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔

اگلے زمانے میں چونکہ مسافروں کی خاطر مدارات خاص طور پر کی جاتی تھی کہ اُس زمانے میں سفر کرنا بڑی جان جوکھوں کا کام تھا، اجنبی مسافروں کے ساتھ ہر ایک کو ہمدردی ہوتی تھی، پیغام رسانی کا صحیح انتظام نہ ہونے کی وجہ سے مہینوں اور بعض اوقات برسوں خیریت معلوم نہ ہوتی تھی، پھر سفر کی صعوبتوں اور تکلیفوں سے کم و بیش ہر شخص واقف تھا، اس لئے انسانی ہمدردی مجبور کرتی تھی کہ مسافر کی زیادہ سے زیادہ خاطر مدارات کی جائے، مسافر کو کھانا کھلانا، اس کی ہر ممکن خدمت کرنا ثواب خیال کیا جاتا تھا، امیر اور رئیس لوگ مسافروں کے لئے سرائیں اور مسافر خانے بنواتے تھے، مسجدوں اور مندروں کے ساتھ مسافروں کے لئے حجرے اور کوٹھریاں بنوانے کا عام رواج تھا، مسافر نواز سراؤں سے مسافروں کو اپنے مہمان خانوں میں لاکر رکھتے اور انکی مہمانداری میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑتے تھے، جہاں کوئی ایک آدمی انتظام نہ کرسکتا وہاں محلّوں میں ہر گھر سے باری باری کھانا مسجدوں میں پہنچ جاتا، غرض مسافروں کو سفر میں کوئی تکلیف نہ ہونے پاتی تھی۔

ع۔ ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں | اب ہندوستان کی تباہ حالی سے یہ باتیں خواب و خیال ہوگئی ہیں، مسافر خانے اور سرائیں ویران پڑی ہیں، مسجدیں بے چراغ ہیں، اپنا پیٹ بھرنے کے لالے پڑے ہوئے ہیں، مسافر نوازی کیا خاک کریں، دوسرے مغربی

تہذیب نے ان قدیمی روایات کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا ہے، مسافر خانے ہوٹل بن گئے ہیں، گویا کشاکش حیات نے انکو آمدنی اور روزگار کا ذریعہ بنا دیا ہے، پھر بھی کہیں کہیں ایسے بزرگ موجود ہیں، جن کی فیاضی اور مہمان نوازی سے پرانی تہذیب اور مہمانداری کا نام زندہ ہے۔

ایک دفعہ مجھے چند احباب کے ساتھ صوبۂ متحدہ میں شکار پر جانے کا اتفاق ہوا تقریباً ایک ہفتہ ہم لوگ جنگلوں میں شکار کھیلتے پھرے، ایک دن جنگل میں ہماری ملاقات وہاں کے ایک زمیندار سے ہوگئی، انہوں نے ہمیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور بہت اصرار کیا، آخر ہم نے بھی وعدہ کر لیا، کئی دن بعد ہم بہت رات گئے ان کے قصبے میں پہنچے، پرانی وضع کا چھوٹا سا شہر تھا، بارش ہو رہی تھی، مسلسل سفر اور بارش نے ہم لوگوں کا حلیہ بگاڑ دیا تھا، ایسی حالت میں ہم نے ان کے ہاں جانا مناسب نہ سمجھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں ایک بھٹیاری "نیل سر" کی سرائے ہے، پتہ پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچے، صحن میں پانی بھرا تھا، چھتیں ٹپک رہی تھیں، خیر اسی کو غنیمت جانا، ارادہ تھا کہ صبح کو انسانی صورت بنا کر اپنے داعی سے ملیں گے، ہم پڑے سو رہے تھے کہ علی الصبح وہ حضرت بہ نفس نفیس تشریف لے آئے، ہم حیران تھے کہ راتوں رات ہماری آمد کا انہیں کیسے علم ہو گیا، وہ سرائے میں ٹھہرنے

پر بہت ناراض ہوئے، اور ہمارا کوئی عذر نہ سُنا، اپنے ملازمین سے ہمارا سامان اُٹھوا کر اپنے گھر لے گئے، دوسرے دن ہم بڑی مشکل سے اجازت لے کر رخصت ہوئے، مدتوں ان سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا، ہمارے بعض احباب نے بھی کئی بار ان کی مہمان نوازی کا لطف اُٹھایا، ان کا نام اگرچہ یاد نہیں رہا لیکن انکی مہمان نوازی ابھی تک دل پر نقش ہے۔

یہ پرانے لوگوں کی باتیں ہیں، شرافت کے ان قدیم نمونوں کا خاتمہ ہوتا جارہا ہے، ہم ہیں اور آپ ہیں یہ جذبہ نہیں کہ آپ ناواقف شخص کو سرائے سے لاکر اپنے گھر میں مہمان رکھ لیں اور ہمہ تن اس کی مہمانداری میں مصروف ہو جائیں، مغربی تہذیب نے شہر والوں کے دلوں سے اس صفت کو بالکل محو کر دیا ہے، جو لوگ شہری تکلفات سے بچے ہوئے ہیں، ان میں یہ جذبہ بقدر رمق باقی ہے، شہری لوگ تو مہمان نوازی اور مہمانداری کے نام سے گھبراتے ہیں، وہ ایسے مکان بھی بنوانا پسند نہیں کرتے جن میں مہمان ٹھہر سکے، انقلاب زمانہ ہے، ایک وہ وقت تھا جب مکان بنوانے سے پہلے آتے گئے کے آرام کا خیال رکھا جاتا تھا، یہ حال متوسط درجے کے لوگوں کا تھا، امیر اپنے مکانوں کے ساتھ باقاعدہ مہمان خانے بنواتے تھے۔

بحری سفر ہمارے ملک میں عام لوگوں کو سفر سے نکلنے کے نام سے تھرتھری چڑھتی ہے، بیرونی ممالک کی سیر و سیاحت تو بڑی بات ہے،

ایسے لوگ بھی بہت کم ہیں جنہوں نے سارے ہندوستان کا سفر کیا ہوگا، سیر و سیاحت کے معاملے میں ہمارا ملک دوسرے ملکوں کی نسبت بہت ہی زیادہ پیچھے ہے، ہمارے ہندو بھائیوں کے مذہبی قوانین بحری سفر کی اجازت نہیں دیتے، سمندر کا سفر کرنے سے ان کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے، اس لئے شروع شروع میں اوّل تو مذہبی تعصب کی وجہ سے کوئی ہندو کمر ہمت ہی نہیں باندھتا تھا، اگر مجبوراً جانا ہی پڑتا تھا تو واپس آن کر دوبارہ شدھ ہوتا تھا ورنہ برادری سے باہر سمجھا جاتا تھا، موجودہ زمانے کی ترقیوں نے ان مذہبی قیود کو بالائے طاق رکھ دیا ہے، اب صفحہ عالم پر کوئی ایسا مقام نہیں جہاں ہنود نہ پہنچ چکے ہوں، پھر بھی جو لوگ کٹر ہندو ہیں اور قدیمی اصولوں سے ایک سُوت ادھر اُدھر نہیں ہونا چاہتے، وہ سمندری سفر سے حتی الامکان احتراز ہی کرتے ہیں۔

ابھی چند سال کا عرصہ گزرا کہ ہندوستان کے مشہور قومی لیڈر پنڈت مدن موہن مالویہ جی کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے انگلستان جانا پڑا، وہ اپنے ساتھ گنگا جلی کے کنستر کے کنستر بھر کر لے گئے تاکہ سمندر پار جانے کا ان کے دھرم پر کوئی اثر نہ ہو اس کے باوجود ان کو واپس آن کر شدھ ہونا پڑا، چونکہ اپنی قسم کی یہ پہلی مثال تھی اس لئے اخباروں میں بہت

چہ میگوئیاں ہوئیں۔

مسلمانوں کو بحری سفر کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں بلکہ حج کا فریضہ ادا کرنے کے لئے عام مسلمانوں کو بحری سفر کرنے کا موقع حاصل ہے، عموماً اس اصول پر تاسف کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اس سفر کا فائدہ عمر کے آخری حصّے میں اُٹھایا جا سکتا ہے کیونکہ حج اُسی وقت واجب ہوتا ہے جب انسان اپنے تمام دُنیاوی فرائض ادا کر چکتا ہے۔

زندگی کے آخری سالوں میں سفر حج یقیناً وہ دلچسپیاں پیدا نہیں کر سکتا جو سیاحت سے مختص ہیں، نیز حاجیوں کا دل مذہبیات پر مرتکز ہوتا ہے، اس لئے وہ کسی چیز کو سیّاح کی ناقدانہ نظر سے نہیں دیکھ سکتے، دُوسرے وہ ایسے ملک میں سفر کرتے ہیں جس کا ذرّہ ذرّہ اِن کے لئے باعث احترام ہوتا ہے۔

بحری سفر کی آسائشیں اَب وہ زمانہ افسانہ ہو گیا ہے، جب سمندر کا سفر کرنا جان جوکھوں کا کام تھا، ہاں کہانیوں اور افسانوں میں اکثر سُننے میں آتا ہے کہ بادبانی جہاز مسافروں کو کہیں سے کہیں لے جاتے تھے، اور عام طور پر مسافروں سمیت غرق ہو جاتے تھے، اب تو ایسے جہاز بن گئے ہیں، جن میں بلا مبالغہ ہزاروں آدمی سفر کر سکتے ہیں، بڑے سے بڑا طوفان ان کو جنبش نہیں دے سکتا، لمبے لمبے سفر ہنستے کھیلتے طے ہو جاتے ہیں، بلکہ سمندر کا سفر خشکی کے

سفر سے زیادہ آرام دہ اور پُر لطف ہوتا ہے۔
پہلے زمانے میں سمندر کا سفر بڑی ہمت اور جانبازی کا کام سمجھا جاتا تھا، لیکن اب جس کے دل میں شوق ہے اور جیب میں پیسے ہیں وہ بغیر کسی رُکاوٹ کے ساری دُنیا کا سفر آسانی سے کرسکتا ہے۔
مغربی تعلیم نے سفر کرنے کا جذبہ عام لوگوں میں پیدا کر دیا ہے ہر شخص کسی نہ کسی مقصد سے سمندر کا سفر کرنے کے لئے آمادہ ہے خاص طور پر نوجوانوں میں سیر و سفر کا شوق بہت بڑھ رہا ہے، قرض لے کر، جائدادیں فروخت کر کے لوگ اپنے بچّوں کو سمندر پار بھیجتے ہیں اور ایسے موقع کو "سُنہری موقع" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

جہاندیدہ بسیار گوید دروغ

پہلے زمانے میں سیّاحوں کی باتوں کو اگرچہ بہت دلچسپی سے سُنا جاتا تھا، لیکن ساتھ کے ساتھ "جہاندیدہ بسیار گوید دروغ" بھی کہدیا جاتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ بیرونی ممالک میں سفر کرنے سے سیّاح کو بڑی صعوبتیں پیش آتی تھیں ہزار قسم کے حیلے حوالوں سے کام چلانا پڑتا تھا، کچھ عجیب و غریب واقعات پیش آتے تھے، اور کچھ "زیب داستاں" کے لئے مبالغے سے کام لیا جاتا تھا، اس لئے بلا تأمل ان پر دروغ گوئی کا شبہ ہوتا تھا، چونکہ پہلے زمانے میں سیّاحوں کا وجود عنقا تھا،

اس لئے ان کو مبالغہ آمیزی اور دروغ گوئی کے مواقع بھی حاصل تھے، جنگ عظیم کی بدولت لاکھوں آدمیوں کو ممالک غیر میں جانے کا موقع مل گیا، اب ہر مقام پر ایسے لوگ بکثرت ہیں جو ممالک غیر کا سفر کر چکے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک دیہاتی مولوی صاحب حج کے لئے تشریف لے گئے، لوگوں نے بڑے شوق اور جوش کے ساتھ اُن کو رخصت کیا، بمبئی پہنچے، مولوی صاحب تھے ذرا رنگین مزاج، بمبئی کی دلچسپیوں نے ان کا دامن پکڑ لیا اور جہاز میں بیٹھنے کی اجازت نہ دی، مولوی صاحب نے بمبئی میں خوب گل چھرے اُڑائے، یہاں تک کہ حاجیوں کے جہاز واپس آگئے، حاجیوں سے مل کر انھوں نے وہاں کے حالات دریافت کئے، اس کے بعد حاجیوں کا سا حلیہ بنایا، حجازی تحفے تحائف ساتھ لئے، غرض پورے حاجی بن کر اپنے گاؤں کو لوٹے، دیہات والوں نے ان کا نہایت پُر احترام استقبال کیا، گھر گھر دعوتیں ہوئیں، حاجی صاحب مجلسوں اور محفلوں میں حج کے سُننے سُنائے حالات سُناتے رہے، ایک دن کسی نے پوچھا، حاجی صاحب حجر اسود کیسا ہے، آپ نے بلا تکلف فرمایا، سبحان اللہ بہت ہی مقدس اور محترم شخص ہے، حاضرین میں سے ایک شخص بولا۔ حاجی صاحب ہم نے تو سُنا ہے وہ پتھر ہے، کہنے لگے بھائی

جب ہم اس سے ملے تھے تو وہ آدمی تھا، اب اپنے اعمال کی بدولت پتھر ہو گیا تو ہمیں معلوم نہیں۔

اگلے زمانے کے نام نہاد سیاح اسی قسم کی مبالغہ آمیزی اپنا شعار بنا لیتے تھے، اسی لئے دروغ گو کہلاتے تھے، باخبر لوگ ان کو دروغ گو کہنے میں حق بجانب بھی تھے کیونکہ وہ جب اپنے کارنامے سُناتے تھے تو زمین آسمان کے قلابے ملاتے تھے۔

سفر تجربہ سکھاتا ہے (جو لوگ اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے انکی حالت کوئیں کے مینڈک کی طرح ہے، سیر و سفر کرنے والوں کو ہر قدم پر نیا کرشمہ نظر آتا ہے، نئے نئے تمدّن کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، عجیب و غریب اخلاق و اطوار دیکھ کر وسعت نظر بڑھتی ہے، ہر جگہ نئی زمین اور نیا آسمان دکھائی دیتا ہے، کہیں ضرورت سے کہیں محبّت سے اپنے آپ کو ہر رنگ میں ڈھالنا پڑتا ہے، چالبازوں کے ساتھ ہوشیاری، حیلہ سازوں کے ساتھ عقلمندی اور دیانتداروں کے ساتھ ایمانداری کا برتاؤ مسافر کی آنکھیں کھول دیتا ہے، کہیں اپنے رسم و رواج کو ترک کرتے ہیں کہیں میل ملاپ کی خاطر دوسروں کی زبان بولتے ہیں، ہر شخص کی بُری بھلی بات خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں، اور یہی وہ صفات ہیں جو سفر کرنے سے پیدا ہوتی ہیں)

سفر وسیلۂ ظفر ہے قناعت ایک نہایت ہی اچھی صفت ہے اور

ہندوستانیوں میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود ہے، لیکن قناعت کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ہمّت کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے جائیں، قناعت اصلی یہ ہے کہ جو کچھ اپنے پاس ہے اس پر ضرور صبر و شکر کیا جاتے مگر ترقّی اور بہبودی کا خیال ہمیشہ پیش نظر رہے، اکثر لوگ قناعت کا یہ مطلب سمجھتے ہیں، کہ جو کچھ مل گیا وہی کافی ہے اور جو کچھ قسمت کا ہوگا وہ آپ ہی مل جائیگا، اس کے لئے کوشش کرنے کی ضرورت نہیں، اسے قناعت ہرگز نہیں کہا جا سکتا، ایسے بے ہمتی سے تعبیر کرنا چاہیئے، انسان کا فرض ہے کہ عمر بھر ترقّی اور بہبودی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہے، اور مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھائے، تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہمیشہ وہی اقوام ترقّی کرتی ہیں جن کے افراد میں قوّت عمل ہوتی ہے، ہمارے سامنے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بہترین مثال موجود ہے، یہ ایک معمولی تجارتی جماعت تھی لیکن باہمّت تھی، وہ اپنی جان پر کھیل کر ہندوستان جیسے دور افتادہ ملک میں تجارت کے مقصد سے آئی، اور تجارت کو فروغ دیتے دیتے ہندوستان پر حکومت کرنے لگی۔

یہ انگریزوں کے سیاحت پسند مزاج ہی کی برکت ہے کہ ایک چھوٹے سے ملک کے باشندے ہیں، مگر دنیا کے بیشتر حصّہ پر حکمران ہیں، اس کے برعکس ہمارے ہندوستانی بھائیوں کی یہ حالت ہے کہ اپنے ملک میں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ

جانے سے کتراتے ہیں، اپنے فائدے ترقّی اور عروج کو یہ کہہ کر
لات مار دیتے ہیں ؎

گرمیاں بہت نہ کھائینگے تھوڑا ہی کھائینگے
ہم اپنی دِلّی چھوڑ کے دکّن نہ جائینگے

اِس بات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ فقط غیر تعلیم یافتہ طبقہ
ہی اس صفت سے موصوف ہے، اُستاد ذوق جیسے عالم باکمال
اور شاعر بے مثال نے بھی گرانقدر تنخواہ اور بڑے بڑے وعدوں
کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا ؎

ان دنوں دکن میں ہے گرچہ بہت قدر سخن
کون جائے ذوقؔ پہ دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر

علمی سفر کا شوق

آج سے چند سال پہلے علمی سیر و سیاحت کا شوق
ہمارے ملک میں بالکل مفقود تھا، جب سے تعلیم کا چرچا ہوا ہے
اور ملازمتوں کا کال پڑا ہے، پیٹ پوجا کی خاطر سیر و سیاحت نے
کسی قدر علمی حیثیت اختیار کرلی ہے، اس میں شک نہیں اِس
شوق کی ترویج اور مقبولیّت میں غیر مُلکی حکومت اور ماہرین تعلیم کو
بہت دخل ہے۔

ماہرینِ تعلیم نے متفقّہ طور پر تسلیم کرلیا ہے کہ طلباء کے لئے
سیر و سیاحت تعلیم کا جزو ہے، یہی وجہ ہے کہ کالجوں سکولوں اور
دیگر درسگاہوں کے طلبا اپنے اساتذہ کی زیرِ نگرانی اکثر لمبے لمبے سفر

تعلیمی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں، اور ان تاریخی مقامات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنی واقفیت بڑھاتے ہیں، جن کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے۔

محکمۂ ریل بھی اس قسم کے سیّاحوں کو بہت زیادہ مراعات دیتا ہے، اگر کم از کم تین چار آدمی مل جائیں تو ایک طرف کا کرایہ ادا کرکے تمام ہندوستان کی سیر ہو سکتی ہے، سیّاحوں کی تعداد زیادہ ہو تو سپیشلیں بھی چلا دیتے ہیں، اور کرائے میں مزید رعایت کرتے ہیں، اس قسم کی تعلیمی سیر و سیاحت کا انتظام موسم سرما یا گرما کی تعطیلات میں ہوا کرتا ہے، ملک و قوم کو ان رعایات سے تفریحی سفر کرنے میں بہت آسانیاں ہوگئی ہیں اور سیر و سفر کا شوق ترقی کر رہا ہے۔

شکار

شکار کی تدریجی ترقیاں | جب حضرت آدمؑ کو جنّت سے نکالا گیا، اور وُہ اس دُنیا میں تشریف لائے تو شروع شروع میں اُنہوں نے درختوں کے پتّے اور پھل پھول کھا کر اپنا پیٹ پالا، اور انہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، اس وقت دُنیا خونخوار درندوں سے بھری پڑی تھی، اپنی حفاظت کے لئے ان سے نبرد آزمائیاں کیں، جس قدر اولادِ آدم بڑھتی گئی یہ لڑائیاں بھی زیادہ ہوتی گئیں، اس طرح درندوں سے دُشمنی مسلّم اور ان کا کُشت و خون حفاظت خود اختیاری میں جائز ہو گیا، قیاس کہتا ہے جب کسی درندے سے بہت زیادہ آزار پہنچا ہو گا تو دُشمنی کا جذبہ اور بھی زیادہ ترقّی کرتا ہو گا، کیا تعجب ہے کہ انسان غُصّہ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ان کا خُون پی لیتا ہو، غرض جب انسان کے مُنہ کو خون لگا تو اس کی توجّہ گوشت کی طرف مبذول ہوئی، خُون ایسی چیز ہے کہ اسے تازہ تازہ ہی پی سکتے ہیں لیکن گوشت کئی کئی دن رکھ کر بھی کھایا جا سکتا ہے اس لئے بالکل ممکن ہے کہ تازہ بتازہ خون نہ ملنے کی صورت میں گوشت کھایا جاتا ہو۔

جب انسان نے ترقی کی تو اس نے درندوں کو مارنے کے لئے

نئے نئے ڈھنگ ایجاد کئے، بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ شکار کے آلات کو ایجادات میں اوّلیّت کا فخر حاصل ہے، جس زمانے میں انسان شکار پر زندگی بسر کرتا تھا، تاریخی کتابوں میں اُسے شکار کا زمانہ کہا جاتا ہے، اس دَور میں شکار ضروریات زندگی میں سے تھا کیونکہ شکار سے نہ صرف غذائے انسانی مہیا ہوتی تھی، بلکہ انسان کی زندگی بھی محفوظ رہتی تھی، زمانۂ دراز کے بعد جب انسان کی عقل نے مزید ترقی کی تو اس نے دوسرے زمانہ میں قدم رکھا، اب وہ جنگلوں میں سے نکل کر سیراب علاقوں میں آگیا، اس نے اپنے رہنے کے طور طریقے بدلے، ضروریاتِ زندگی کو بڑھایا، جانوروں کو پالنے لگا، اس زمانے کو تاریخی زبان میں گڈریوں کا زمانہ کہتے ہیں، اس دورِ زندگی میں ہر خاندان کے ساتھ مویشیوں کے گلے ہوا کرتے تھے، افرادِ خاندان ان کا دُودھ پیتے اور گوشت کھا کر پیٹ پال لیتے تھے، اب بجائے پتّوں کے وہ کھالوں سے تن پوشی کرنے لگے تھے، اس وقت انسان شکار کے زمانے سے ایک قدم آگے تھا، لیکن حقیقت میں شکار کے زمانے کی تمام خصوصیات اس دَور میں موجود تھیں اب انسان پر صرف اپنی ہی حفاظت لازم نہ رہی تھی بلکہ ان جانوروں کا تحفّظ بھی اس پر فرض تھا جنہیں وہ اپنی ضروریات زندگی پُوری کرنے کے لئے پالتا تھا، اس زمانہ میں انسان نے ترقی کا ایک اور قدم اُٹھایا گویا اس نے زمین کی پیداواری قوّت کا پتہ لگایا، اس نے خانہ بدوشی کی زندگی کو

خیرباد کہا، اور زرخیز زمینوں پر قبضہ کیا، کاشتکاری کی طرف متوجّہ ہُوا، ضرورتیں بڑھتی گئیں اور طبیعتیں زراعت، صنعت حرفت اور تجارت کی طرف باقاعدہ مائل ہوئیں، یہی وہ زمانہ ہے جہاں سے انسان کے متمدّن اور مہذب کہلانے کا دَور شروع ہوتا ہے لطف یہ ہے کہ باوجود اس قدر ترقی کے اس نے شکار کو نہ چھوڑا ہاں اتنا فرق ضرور پیدا ہوگیا کہ پہلے اور دوسرے دَور زندگی میں شکار ضروریاتِ زندگی میں شامل تھا، اب تہذیب و تمدّن کی آن بان نے اسے شوق میں تبدیل کردیا۔

انسان کو اس دُنیا میں زندگی بسر کرتے ہوئے ہزارہا سال گزر چکے ہیں لیکن شکار کی پخ اس کے ساتھ اب تک لگی ہوئی ہے ہم روزانہ دیکھتے ہیں گلی کوچوں میں چھوٹے چھوٹے بچّے طرح طرح کی غلیلیں لئے پھرتے ہیں، جہاں کسی پرندے کو بیٹھا دیکھتے ہیں اس کا نشانہ اُڑاتے ہیں، اگر حسنِ اتّفاق سے وہ غُلّہ لگ کر زخمی ہو جائے تو ان کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی، بڑے ہونے کے بعد اگر حالات مساعدت کرتے ہیں تو یہ شوق غلیل سے آگے بڑھتا ہے، ورنہ صرف شکار کا شوق ہی شوق باقی رہ جاتا ہے، غالباً اسی افتادِ طبع کی بدولت اکثر لوگ شکاریوں کے ساتھ ساتھ جنگلوں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔

شکار کے متعلق فلاسفہ کا نظریہ | شکار کے متعلق علمائے تقسیات کی تحقیق و

تفتیش کا لُبِ لباب یہ ہے کہ شکار انسان کی فطری ضروریات زندگی میں سے ایک ضرورت ہے طرزِ معاشرت اور تمدّن میں تبدیلیاں اور ترقیاں ہونے سے اس مخصوص ضرورت کی نوعیّت بدل گئی ہے، ورنہ درحقیقت یہ فطری ضرورت ہر انسان کے دل میں اب تک موجود ہے، موجودہ دَور میں چونکہ شکار ہر شخص کے بس کا کھیل نہیں رہا، اس لئے یہ ضرورت تحصیل و گرفت سے پوری کیجاتی ہے، مثلاً چھوٹے چھوٹے بچّے کمال شوق سے ہر دلپسند چیز اپنی جیبوں میں بھر لیتے ہیں، اور کسی عنوان اپنی جیب خالی کرنے نہیں دیتے، نوخیز لڑکے اس ضرورت کو ان کھیلوں میں دلچسپی لے کر پُورا کرتے ہیں، جن میں پکڑ دھکڑ اور چھینا جھپٹی لازم آتی ہے، مرد اس فطری ضرورت کو عشق و محبت کے کارناموں کے ذریعے بہم پہنچاتے ہیں، ظاہر ہے اگر ان معاملات میں فطری ضرورت کارفرما نہ ہوتی تو انسان ان سے بہت کم دلچسپی لیتا۔

گرمی

ہندوستان میں تین قسم کے موسم ہوتے ہیں، اوّل گرمی دوسرے برسات اور تیسرے جاڑا، گرمی کا موسم عام طور پر مارچ سے شروع ہو جاتا ہے، لوگ باگ گرم لباس اُتار کر ہلکی قسم کے کپڑے پہننے شروع کرتے ہیں، مئی اور جون کے مہینے میں گرمی اپنے شباب پر ہوتی ہے، عموماً جولائی میں برسات شروع ہو جاتی ہے اور گرمی میں تخفیف ہونے لگتی ہے۔

گرما گرمی | جوں جوں گرمی بڑھتی ہے لباس ہلکا ہوتا جاتا ہے، اور تخفیف ہوتے ہوتے لنگوٹی کی نوبت آجاتی ہے، ہر طرف سے ہائے گرمی ہائے گرمی کی صدائیں کانوں میں آتی ہیں، پانی کا کٹورا منہ سے نہیں چھوٹتا، پیٹ پھٹا جاتا ہے، لیکن پیاس نہیں بجھتی، بڑے پانی لاؤ ٹھنڈا پانی پلاؤ پکارتے ہیں، بچے مم مم کی رٹ لگاتے ہیں، زمین آگ اُگلتی ہے، آسمان سے آگ برستی ہے، در و دیوار سے شعلے نکلتے ہیں، مکان بھٹی کی طرح تپتے ہیں، لوؤں سے جسم جلا جاتا ہے، انسان چنوں کی طرح بھنتے ہیں، دھوپ میں اس قیامت کی تپش ہے کہ ہرن کالے ہو جائیں گے، کیا عجب ہے پتھر بھی پگھل

جائیں، جسم پسینے سے تر ہے، مسام مسام سے پسینے کی دھاریں بہ رہی ہیں، کپڑا سوئیوں کی طرح جسم پر چبھتا ہے، گرمی دانوں سے جسم اولمہ بنا ہے، کھال اُدھڑ گئی ہے اور تمام بدن میں آگ سی لگی ہے، نہ سوتے آرام ہے نہ جاگتے چین ہر وقت پنکھا ہاتھ میں ہے، بار بار بھگوتے ہیں، دماغ بارود کی طرح اُڑا جاتا ہے، کوئی سر پہ پانی ڈالتا ہے، کوئی کپڑے بھگو کر پہنتا ہے، چہرے کملا گئے، دل جل بجھے، کھانے کو جی نہیں چاہتا، پانی کے سوا دوسری چیز حلق سے نیچے نہیں اُترتی، جان ہے تو پانی میں، ایمان ہے تو پانی میں، جی چاہتا ہے قسم بھی کھاؤ تو ٹھنڈے پانی کی اور مرو بھی تو ٹھنڈے پانی میں، بس نہیں چلتا کہ پانی کی مچھلی بن جائیں، انسان پر کیا موقوف ہے حیوانات تک پانی کو ترستے ہیں جہاں پانی نظر آیا وہیں کے ہو رہے جہاں ذرا ٹھنڈک معلوم ہوئی وہیں اڑ گئے، ہانپ رہے ہیں، کانپ رہے ہیں، گرمی کی شدت سے زبانیں باہر لٹک پڑیں، نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں، درختوں کی چھاؤں میں کھڑے ہیں، چھپا دل میں گھس گئے تو شام تک نہ نکلے پانی پیتے پیتے جان عزیز جاں آفریں کے سپرد کر دی، پرندوں کو دیکھو تو درختوں کے پتّوں میں چھپتے پھرتے ہیں، چونچیں کھلی ہوئی ہیں، پتلا حال ہے، لدّو جانوروں نے کندھا ڈال دیا، چاہے کوئی مار مار کر کھال اُدھیڑ دے مگر کیا مجال جو اپنی جگہ سے ہل جائیں، مویشیوں کا

دُودھ خشک ہے، لوؤں کے جھکڑ ہوش اُڑا دیتے ہیں، آسمان پر غبار چڑھا ہے، کُرّۂ ارض کُرّۂ نار بن گیا ہے، معلوم ہوتا ہے قیامت آگئی، سوا نیزے پر سُورج اُتر آیا، سرسبز اور شاداب باغ جل کر خاک ہو گئے، گرمی سے بڑے بڑے تناور درخت خُشک ہیں چھوٹے چھوٹے پودوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، سبزہ کہیں نام کو نظر نہیں آتا، پانی ملے تو سبزہ باقی رہے، آدمیوں کے پینے کو پانی نہیں ملتا، کنوئیں خُشک ہیں، دریا سانپوں کی طرح پڑے سسکتے ہیں، وہ دریا جو کف بلب ٹھاٹھیں مار کر بہتے تھے پایاب ہیں، نہریں بند پڑی ہیں، ہری بھری کھیتیاں سُوکھی جاتی ہیں، کسانوں کی جان پر بنی ہے، کبھی آسمان کو دیکھتے ہیں کبھی کھیتوں پر نظر ہے، دل بدعا ہیں کہ خدایا رحم کر، کھیتی جل گئی تو کیا ہوگا، قحط کا خوف روح قبض کئے لیتا ہے، مستقبل کے خیال سے دل سینے میں گھبراتا ہے۔

بازاروں کی حالت

چھوٹے موٹے شہروں کا تو نام ہی نہ لیجئے بڑے بڑے شہر جو تجارت کے مرکز کہلاتے ہیں دوپہر کے وقت ان کے پُر رونق بازاروں میں اُلّو بولتا ہے، دُکاندار اپنی دُکانوں کے آگے پردے ڈال کر اندر بیٹھ گئے آمد و رفت بالکل بند ہے، ہر شخص اپنے اپنے گھر میں گھُس گیا اور کسی ایسی جگہ پر آرام کر رہا ہے، جہاں روشنی اور تپش سے محفوظ ہے، جو مصیبت کے مارے دن کو پھرتے ہیں، دھوپ سے بیکل نظر آتے ہیں، کوئی سر پر کپڑا ڈال کر چلتا ہے کوئی

چھتری لگاتا ہے، لُو سے بچنے کے لئے کوئی جیب میں پیاز کی گٹھیاں ڈال کر نکلتا ہے، کوئی کانوں کو لپیٹ کر چلتا ہے پھر بھی کسی کی نکسیر پھوٹتی ہے، کسی کو سرسام ہوتا ہے، کوئی چلتے چلتے بیہوش ہو کر گرتا ہے کسی کو لو لگ کر بخار چڑھتا ہے، خوف کے مارے پران خشک ہیں کہ دیکھئے گرمی کیا آفت لاتی ہے، الٰہی خیر کیجیو، گرمی کی گرما گرمی ہے، بڑے بڑے کاروباری دُکاندار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، ہاں شربت شیرے کی دُکانوں اور سبیلوں پر ضرور ہجوم ہے، پیاؤ پر پانی کی مانگ سے باری نہیں آتی، مشکوں پانی صرف ہوتے جاتا ہے سقوں کے وارے نیارے ہیں، قدم قدم پر مشک لئے کھڑے ہیں "ٹھنڈا پانی" کی ٹھنڈی آوازیں لگا رہے ہیں، ایک گلاس پلاتے ہیں اور پوری مشک کے دام وصول کرتے ہیں۔

شام کی کیفیت دوپہر ڈھلے تیسرے پہر ذرا گرمی کم ہوئی تو جان میں جان آئی: آمد و رفت کا بازار گرم ہوا، اب ذرا بازاروں میں بھی رونق ہے، سقّے سڑکوں پر چھڑکاؤ کرتے پھرتے ہیں، دُکاندار پیسے دے دے کر اپنی دُکانوں کے آگے چھڑکاؤ کراتے ہیں، شام ہوتے ہوتے پوری طرح چہل پہل ہو گئی، لوگ نہا دھو ہلکے ہلکے باریک پہن، گھومنے نکلے ہیں، کسی کے ہاتھ میں پنکھا ہے، کوئی اخبار ہی سے پنکھے کا کام لے رہا ہے، کوئی بار بار رومال سے پسینہ پونچھتا ہے، کوئی انگشت ہلالی سے پیشانی صاف کرتا ہے، قطرات عرق

ٹپ ٹپ نیچے گرتے ہیں، گرمی سے گھبرا کر ہر شخص یہی کہتا ہے چلو ذرا باغ میں چلیں وہاں ٹھنڈک ہوگی، باغ کے دروازے میں قدم رکھتے ہی دوسری دُنیا میں پہنچ گئے، پہلے معتدل ہوا کا جھونکا آیا ذرا آگے بڑھے تو ہوا میں بھی خنکی بڑھی بیچ میں پہنچے تو معلوم ہوا جنت میں آ گئے، ہری ہری گھاس کو دیکھ کر آنکھوں میں تراوت آ گئی، پھولوں پر نظر پڑی تو دل باغ باغ ہو گیا، بچّوں بڑوں کا ہجوم ہے، لڑکے کلیلیں کرتے پھرتے ہیں، کوئی گھاس پر لیٹا ہے کوئی ٹہل رہا ہے، بنچوں پر تل دھرنے کو جگہ نہیں، بہت سے اس انتظار میں اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں کہ بنچ خالی ہو تو لپک کر قبضہ کریں لیکن اس خنک فضا کو چھوڑ کر کون اُٹھتا ہے، قدم قدم پر سقّے پانی پلاتے پھرتے ہیں، کٹورے ایسی تال اور سُر سے بجاتے ہیں کہ بغیر پیاس پانی پینے کو جی چاہتا ہے، فقیر بڑے بڑے پنکھے لئے گھوم رہے ہیں، دو منٹ پنکھا جھلتے ہیں اور بغیر اصرار کے پیسہ وصول کرتے ہیں، ساقی تازے تازے حُقّے لئے پھر رہے ہیں، نَے پر پھولوں کے ہار لپیٹے ہیں، جو حقّہ نہیں پیتا اُس کا بھی دل چاہتا ہے کہ دو کش لگا لے، بانکے چھیلوں کے کچھ اور ہی رنگ ہیں، باریک باریک کُرتے پہنے ہیں، نیچے جالی کا بنیان ہے، گورا گورا جسم جھلک رہا ہے، دُور سے خس اور باڑھی کے عطر کی لپٹیں آ رہی ہیں، چھڑی ہاتھ میں ہے لپکتے مہکتے چلے

آرہے ہیں، کسی نے دو پلڑی ٹوپی جمائی ہے، کوئی ننگے سر ہے اور اپنے بالوں کی شان دکھا رہا ہے، کسی نے سلمے کی ٹوپی ترچھی رکھی ہے، اور اور ناپ تول کر برابر کے قدم اٹھاتا ہے، تعلیم یافتہ لوگ، نصف آستین کی قمیص پہنے ننگے سر ٹہل رہے ہیں، ٹوپی ہاتھ میں ہے، اگر زیادہ فیشن زدہ ہیں تو پتلون ڈانٹے ہیں، ورنہ نکر ہے، جرابیں بھی تکلف میں داخل ہیں، چپلی نے شوز کی جگہ لی ہے، کوئی بنچ خالی مل جائیگی تو بیٹھ جائیں گے ورنہ گھومتے رہیں گے، اور آخر تھک ٹوٹ کر گھاس کے مخملیں فرش پر ہی دراز ہو جائیں گے۔

باغوں میں رات کے گیارہ بارہ بجے تک یہی گہما گہمی رہے گی، چوکیدار آوازوں پر آوازیں لگائے گا کہ وقت ہو گیا ہے باغ خالی کرو دروازے بند ہوتے ہیں لیکن لوگ ہیں کہ ہلنے کا نام نہیں لیتے چوکیدار یہاں سے اٹھائے گا وہ بھونرے کی طرح ادھر سے اٹھ کر ادھر جا بیٹھیں گے، بس نہیں چلتا کہ باغ ہی میں سو جائیں یہیں ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر کروٹیں لیں اور صبح کر دیں۔

صبح کا منظر | شام کی لطف انگیزیاں دیکھ چکے، اب صبح کی رنگ آمیزیاں دیکھو، کتنے ہی سویرے اٹھو لوگ دریا کی طرف امنڈے چلے جاتے ہیں، جیسے رات کو گرمی کے مارے نیند ہی نہیں آتی، سیرگاہوں میں جھرمٹ کے جھرمٹ جمے ہوتے ہیں، کوئی ورزش میں مصروف ہے کوئی دوڑ لگا رہا ہے، چہل قدمی کا دلدادہ پھولوں کی کیاریوں پر

منڈلا رہا ہے، کسی نے ٹہلتے ٹہلتے پھول توڑا ہے، اسے کیفیت سے سونگھ رہا ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم کے جھونکے اُمنگوں کو بیدار کرتے ہیں، چڑیوں کی چوں چوں میں ترانوں کا کیف بھرا ہے، شاخیں جھوم رہی ہیں نہیں جھوم جھوم کر پھولوں کا منہ چوم رہی ہیں، ہر طرف ایک کیفیت طاری ہے، معلوم ہوتا ہے فطرت نے انگڑائی لی ہے۔

دریا پر چل کر دیکھو تو کچھ اور ہی سماں ہے، بچے، بوڑھے، جوان لڑکے لڑکیاں مچھلیوں کی طرح پانی میں تیرتے پھرتے ہیں، باہر نکلنے کا نام نہیں لیتے، کوئی رات کو سستی اُتار رہا ہے کہیں شباب اور حسن کے سربجوش شیشے معتدل ہو رہے ہیں، پجاری اپنے دکان پر آسن جمائے بیٹھے ہیں، صندل اور سیندور کے تلک لگا رہے ہیں، کوئی ہری اوم کے ورد میں اپنے آپ کو بھولا ہے، کوئی رام رام جپتا چلا جاتا ہے، کوئی بھجن گنگناتا چلا آرہا ہے، کسی کے ہاتھ میں گنگا جلی ہے، کوئی دونے میں ارادت کے پھول لئے ہے، ماتھے پر قشقہ کھچا ہے، چل چلاؤ کا نقشہ جما ہے، جلدی جلدی قدم اُٹھ رہے ہیں کہ دھوپ نکلنے سے پہلے گھر پہنچ جائیں۔

دولتمندوں کی گرمی | لو وہ سورج نکل آیا، آنکھیں چندھیانے لگیں، پہاڑ سا دن سامنے ہے، گرمی کا بھوت دانت نکوسے کھڑا ہے۔ دوپہر کیا ہوئی سورج سوا نیزے پر آگیا، دھوپ کی شدت سے

چیل نے چلچلا کر انڈے چھوڑ دیئے، لوگ باگ اپنے گھروں میں گھس گئے، جن کو خدا نے دولت دی ہے، وہ گرمی کی تاب نہ لاکر پہاڑوں کو روانہ ہو چکے ہیں، جو نہیں جا سکے اُنہوں نے یہیں گرمی سے بچنے کا انتظام کیا ہے، سرد خانوں میں پڑے ہیں، پنکھا چل رہا ہے، خس کی ٹٹیاں دروازوں پر لگی ہیں، برابر پانی چھڑکا جا رہا ہے، خس کی لپٹیں چلی آتی ہیں، سوندی سوندی خوشبو سے دل و دماغ معطر ہے، میدانوں میں پہاڑوں کا مزہ آرہا ہے، لُو کے گرم اور جانگزا جھکڑ جانفزا اور ٹھنڈی ہواؤں میں تبدیل ہو گئے، برف کی بدولت گرم پانی کی تاثیر بدل گئی، غسل خانے میں فوارے لگے ہوئے ہیں جب گرمی لگی ان کے نیچے جا بیٹھے اور ساون بھادوں کا لطف اُٹھایا، دن بھر خوب سنّائے، شام ہوتے نہائے، ٹھنڈے شربت پیئے، قلفیاں کھائیں، آئس کریم جمائی، اب بن سنور کر باہر نکلیں گے، سیر کو جائیں گے، قدم قدم پر گرمی کی شکایت زبان پر آئے گی، دن بھر کا آرام بھول جائینگے، گرمی گرمی کا شور مچائینگے، دم بدم یخ بستہ پانی کا دَور چلے گا، لیکن پھر بھی آرام نہ آئے گا۔

بجلی کے پنکھوں نے گرمی کی تکلیفوں میں بہت کمی کر دی ہے، پہلے دستی اور فرشی پنکھے استعمال ہوتے تھے، پنکھا قلی دن بھر پنکھا جھلتے، اگر سو جاتے تو بے نُقط گالیاں کھاتے، اب صرف پنکھے کا بٹن دبانے کی دیر ہے کہ فرانٹے کی ہوا آنے لگتی ہے، ہاں اگر بجلی

خراب ہو جائے یا پنکھا بگڑ جائے تو ٹھنڈا پانی پی پی کر کوسو اور دل کی بھڑاس نکالو، اس میں کیا شک ہے بجلی سے بہت آرام ہیں لیکن جب تمام عالم تپتا ہے تو پنکھوں میں سے بھی گرم ہوا نکلتی ہے، تیز ہوا سے دماغ چکراتا ہے، جسم پھنکتا ہے، جس حصہ جسم کو ہوا لگتی ہے وہ خشک، جہاں ہوا نہیں پہنچتی وہ پسینے سے تر، غرض گرمی سے بچنے کی کتنی ہی کوشش کرو لیکن وہ اپنا اثر دکھلائے بغیر نہیں رہتی۔

غریبوں کی گرمی | کوئی کہتا ہے گرمی اچھی، کوئی کہتا ہے سردی اچھی، اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو نہ سردی بھلی نہ گرمی ہم سے پوچھو تو سب موسموں میں اعتدال کا موسم اچھا ہے، چونکہ اللہ میاں کے کاموں میں کوئی اعتراض نہیں کر سکتا، اس لئے گرمی اور سردی دونوں اچھی ہیں، ہمیں مین میخ نکالنے کا کیا حق ہے، پھر بھی اگر غریبوں سے پوچھا جائے تو وہ گرمی ہی کو اچھا بتائیں گے، لیکن جس شخص میں ذرا سا بھی ہمدردی کا مادہ ہے اُس کا دل ان لوگوں کی حالت دیکھ کر ضرور کڑھتا ہے، ہائے مفلسی، غریب کا خون پسینہ ہو کر بہتا ہے، جسم و جان کو جلا دینے والی لوئیں اسے بے محابا ستاتی ہیں، گرمی کے مارے پرندہ پر نہیں مارتا، ہاں کبھی کبھی چیل کے چلچلانے کی آواز ضرور کانوں میں آتی ہے، امیر تہ خانوں، سرد خانوں اور خسخانوں میں استراحت فرما ہیں، اوسط درجے کے لوگ گھروں میں محفوظ ہیں، جانور درختوں کی چھاؤں میں کندھا ڈالے

کھڑے ہیں، لیکن غریب جانہار مزدور اس قیامت کی گرمی میں اپنا کام کر رہا ہے، ایڑی سے چوٹی تک پسینے کا تار بندھا ہے، پیاس سے نڈھال ہے، جسم پر کپڑا نہیں، پیٹ میں روٹی نہیں، بھوک لگتی ہے تو گرم پانی کے دو گھونٹ پی لیتا ہے، اگر سستانے کے لئے بیٹھتا ہے تو کسی ظالم کی دلدوز آواز کانوں میں آتی ہے، کام کرو، کام کرو، بیکار مت بیٹھو، لو لگے سرسام ہو، بخار چڑھ جائے، سرمایہ دار کو پروا نہیں، اسے تو اپنے کام سے کام ہے، اس نے تانبے کے چند ٹکڑے دے کر اس کی جان خرید لی ہے، کھری مزدوری دے کر چوکھا کام لے گا، بچارا مزدور بھی کیا کرے کام نہیں کرتا اور گالیاں صبر سے نہیں سنتا تو پیٹ کی دوزخ کیسے بھریگا، ان لوگوں کو جاکر کیا منہ دکھائے گا جو اس کی راہ تک رہے ہیں، اور شام کی روٹی کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔

شام ہوگی ٹھنڈک کا مژدہ لائے گی، امیر سیر کو جائیں گے، ٹھنڈے ٹھنڈے شربت اڑائیں گے، رات کو مزے سے پلنگ پر پڑکر سوئیں گے، اس بچارے کے پاس پلنگ کہاں، سر چھپانے کو چھت بھی نہیں، رات ہوگی سڑک کے کنارے جلتی ہوئی زمین پر لیٹ رہے گا، اور ایسا بیخبر ہو کر سوئے گا کہ صبح کو حلال خور ہی آکر جگائے گا، کہ اٹھ کھڑا ہو جھاڑو دینی ہے،

اور ساتھ کے ساتھ دو چار گالیاں بھی جھاڑ دے گا، ٹھیک ہے گرمی اور سردی دولت کے دو نام ہیں، اس کو نہ سردی کی پروا ہے نہ گرمی کا فکر، جب پیسے جیب میں ہوں گے تو گرمی اور سردی دونوں کو محسوس کرے گا۔

گرمی کے فائدے | کہتے ہیں خدا نے کوئی چیز بیکار اور بغیر کسی مصرف کے پیدا نہیں کی، اس کے ہر کام میں کوئی راز ہے جس کو انسان کی ناقص عقل ذرا مشکل سے سمجھتی ہے، گرمی کے نقصانات اور مصائب تو اظہر من الشمس ہیں مگر فائدے ذرا غور طلب ہیں، کہا جاتا ہے کہ گرمی بہت مفید ہے، دھوپ کی تیزی سے زہریلے جراثیم خود بخود ہلاک ہو جاتے ہیں، آندھیوں سے ہوا صاف ہو جاتی ہے، وبائی امراض دُور ہوتے ہیں، پانی پی پی کر جسم کی مشینری دُھل جاتی ہے، پسینوں سے جسم کے مسامات کھُلتے ہیں، اور زہریلا مواد پسینے کے ساتھ خارج ہو جاتا ہے، انسان کو گرم پانی سے غسل کی ضرورت نہیں رہتی، جن مُلکوں میں گرمی نہیں پڑتی، وہاں جب کبھی دھوپ نظر آتی ہے تو خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے، لوگ کپڑے اُتار دیتے ہیں، ننگے ہو کر دُھوپ کھاتے پھرتے ہیں، کہتے ہیں وہ اپنے جسموں میں سورج کی کرنیں جذب کر کے برقی طاقت بھرتے ہیں ورنہ صحت کو درست رکھنے کے لئے برقی غسل کرنا پڑتا ہے تاکہ جلد ہی امراض

سے محفوظ رہیں، ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ امیروں اور آرام طلب
لوگوں کے لئے گرمی بہت مفید ہے، وہ کوئی ایسا محنت طلب
کام نہیں کرتے جس سے پسینہ آئے، ان کے جسمانی مسامات
بند ہو جاتے ہیں، گرمی کے موسم میں انہیں خود بخود پسینہ چلا
آتا ہے، مسامات کے ذریعہ جسمانی آلائشیں آپ ہی آپ صاف
ہو جاتی ہیں، بہرحال یہ تسلیم کرنا ہی پڑیگا کہ گرمی باوجود
اپنے شدائد کے فوائد سے خالی نہیں۔

برسات

گرمی کی گرما گرمی اور برسات کی آمد

خدا یاد نہ دلائے گرمی کا موسم بھی قیامت سے کم نہیں، آسمان کی آتش ریزی اور زمین کی شعلہ خیزی سے اللہ ہر ایک کو محفوظ رکھے، ہر طرف خاک اُڑتی ہے، آندھیاں چلتی ہیں، در و دیوار سے العطش العطش کی صدا بلند ہوتی ہے، ٹھنڈے پانی کے لئے چھوٹے بڑے جان دیتے ہیں، درخت مُرجھائے اور پودے خُشک ہوئے جاتے ہیں، سبزہ کہیں نام کو نظر نہیں آتا، بنی نوع انسان ہزاروں کی تعداد میں گرمی کا شکار ہوتے ہیں، آدمی تو آدمی جانور بھی زبان نکالے ہانپتے کانپتے نظر آتے ہیں، مویشیوں کا دُودھ خُشک ہو جاتا ہے، غرض کیا انسان کیا حیوان گرمی سے سب نڈھال اور بیحال نظر آتے ہیں نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اُٹھتی ہیں، اور ابر کو ڈھونڈھتی ہیں، بارش کے لئے دُعائیں مانگی جاتی ہیں، جب آسمان پر ابر نمودار ہوتا ہے، تو خوشی کی انتہا نہیں رہتی، بُوڑھے، بچّے، جوان لنگر لنگوٹے کس لیتے ہیں، توے کی سیاہی اور کیچڑ ایک دوسرے کے

۱؎ بارش کا خیر مقدم اس طریقے سے نیچ طبقے کے لوگ کرتے ہیں۔

مُنہ پر ملتے ہیں، گلی کوچوں میں گروہ در گروہ شور مچاتے پھرتے ہیں کہ اللہ میاں مینہ برساؤ۔

کالے پیلے بادلوں اور اُودی گھٹاؤں کو دیکھ کر مردہ جسموں میں جان آتی ہے، بارش کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، ٹھنڈی ہوائیں پژمردہ چہروں پہ رونق لاتی ہیں، آسمان اور زمین کا رنگ ہی پلٹ جاتا ہے، ایک بارش سے رُت بدل جاتی ہے، مُرجھائے ہوئے پودے اور خُشک درختوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں، گھر گھر خوشیاں ہوتی ہیں، شکرانے ادا کئے جاتے ہیں، کہ برسات آئی اور گرمی ختم ہوئی، یہی وہ موسم ہے جس کو ہندوستان کا موسم بہار کہتے ہیں، یہی وہ وقت ہے جو غیر شاعر کو شاعر بنا دیتا ہے، یہی وہ زمانہ ہے جو مُردہ دلوں میں ولولے اور جوش پیدا کرتا ہے، یہی وہ دَور ہے جو بچھڑے ہوؤں کی یاد کو تازہ کرتا ہے، اور جنوں خیز اور طرب انگیز کہلاتا ہے، پرندوں کے چہچہے اور زمزمے، کوئل کی کُوکُو اور پپیہے کی پی کہاں کچھ ایسے جذبات کے متحمل ہے جو برسات ہی سے مخصوص ہیں۔

برسات کی بہاریں ہندوستان میں برسات کا موسم کیا آتا ہے، مسرتوں اور اُمنگوں کا پیغام لاتا ہے، پژمردگی دُور ہوتی ہے، تازگی آتی ہے، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے، در و دیوار تک سبز ہو جاتے ہیں، سُوکھے ہوئے درخت، ویران باغ ہرے بھرے

دکھائی دیتے ہیں، جنگل منگل بن جاتے ہیں، جل تھل ایک ہو جاتے ہیں، لڑکیاں بالیاں رنگ برنگ کے لباس پہنتی ہیں، سرسبز اور شاداب فضا میں رنگ برنگ کے لباس ایسے معلوم ہوتے ہیں جس طرح کہکشاں آسمان سے زمین پر اُتر آئی، گھر گھر کڑاہیاں چڑھتی ہیں، پکوان اور پوڑے تلے جاتے ہیں، آم کھائے جاتے ہیں، آلو کچالو، امرود، جامنیں اس موسم میں کچھ عجب لطف دیتے ہیں، گھر گھر کھم گڑوائے جاتے ہیں، جہاں درخت ہیں وہاں درختوں میں جھولے ڈالے جاتے ہیں، چھوٹے بڑے سب باری باری جھولتے ہیں، مزے مزے کے گیت گاتے ہیں اور اپنا دل خوش کرتے ہیں، ایک جھولتی ہے دوسری جُھلاتی ہے، امیر خسرو کا یہ گیت عورتوں میں بہت مقبول ہے شاید ہی کوئی ایسی ہو جس کو یاد نہ ہوگا:۔

جو پیا آون کہہ گئے اجھوں نہ آئے سوامی ہو اے ہو جو پیا آون کہہ گئے
آون آون کہہ گئے آئے نہ بارہ ماس اے ہو جو پیا آون کہہ گئے

یہ بڑی بڑی عورتوں کے گیت ہیں جو اپنے سوامی کی یاد اور اپنے عزیزوں کی محبّت کی آگ کو بھڑکاتے ہیں، بچّی بالیوں کے لئے اور گیت ہیں، کیونکہ جذبات تو ان میں بھی ہیں، آخر وہ اپنے دلوں کی اُمنگوں کا کیونکر اظہار کریں، دیکھنا کیا معصومانہ خیالات ہیں معلوم ہوتا ہے لڑکی سسرال میں ہے برسات کا موسم آیا ہے جھولے

ڈالے گئے ہیں، برسات منائی جارہی ہے، وہ اپنی ماں کو یاد کرتی ہے، اور کہتی ہے اماں مجھے بلالو، ابا کو بھیجدو کہ وہ مجھے آن کر لے جائیں، ماں کہتی ہے وہ تو بڈھا ہے وہ کس طرح اتنا لمبا سفر کر سکتا ہے، بیٹی کہتی ہے اچھا اگر ابا بڈھے ہیں تو بھائی کو بھیجدو، ماں کہتی ہے بیٹی وہ تو بچہ ہے وہ تجھے کس طرح لاسکتا ہے تو پھر کہتی ہے، اچھا تو پھر ماموں ہی کو بھیجدو، وہ مجھے اپنے ساتھ لیجائیں، ماں جواب دیتی ہے، بیٹی وہ تو بانکا چھیلا ہے اُسے رنگ رلیوں سے فرصت کہاں جو تجھے لینے جائے ؎

اماں میرے باوا کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری " " "
اماں میرے بھیا کو بھیجو جی " " "
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری " " "
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی " " "
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری کہ ساون آیا

چھوٹی چھوٹی توتلی بچیوں کے گیت کسی اور ہی رنگ میں ڈوبے ہوتے ہیں، ہمارے ملک میں گزشتہ صدی تک یہ عام رواج تھا کہ بہت ہی کمسنی میں لڑکیوں کی شادی کر دیتے، بچیوں کی ابھی پوری زبان نہ کھلتی تھی کہ ماں کی گود سے علیحدہ ہو جاتی تھیں، پرایا گھر آباد کرتی تھیں ایسی بچیاں سوائے ان پاکیزہ جذبات کے

زنہ کیا اظہار کرتیں کہ اماں مَیں سسرال نہیں جاتی ، آڑو اور جامنیں تو گھلی ہوئی رکھی ہیں ، مَیں پہلے اُنہیں کھاؤں گی ، اگر گھوڑا اور دُولھا دروازے کے باہر کھڑا ہے تو کھڑا رہنے دو ، برسات کی رنگ رلیاں چھوڑ کر میں ہرگز نہ جاؤں گی ؎

آڑو جامن گھلے پڑے ، مَیں نہیں جاتی میری ماں
دُولھا گھوڑا باہر کھڑا ، مَیں نہیں جاتی میری ماں

غرض کوئی گھر مشکل سے ایسا ہوگا جس میں برسات کی خوشیاں نہ ہوتی ہونگی ، جس گھر میں جھولا پڑا ہے وہاں ہجوم ہے ، کاموں سے فارغ ہوتے اور سب وہاں جمع ہوئے پھر کیا تھا ، جھول رہے ہیں ، آپس میں چہلیں اور چیخیں ہو رہی ہیں ، آنکھ مچولی کھیلی جا رہی ہے ، کوئی گرتی پڑتی بھاگتی ہے ، کوئی لڑتی جھگڑتی ہے ، کوئی کھلکھلا کر ہنستی ہے ، طرح طرح سے دل کی اُمنگوں کا اظہار ہوتا ہے ، گھربار ویران ہیں ، اور ویرانے آباد ہیں ، بارش ہو رہی ہے ، بھیگ رہے ، لیکن خوش ہیں ، غرض کھانا پینا گانا بجانا ، سیر تماشے برسات کی عام تفریحات ہیں جن سے سبھی لطف اندوز ہوتے ہیں ۔

بارش کے لطف آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا نظر آیا ، وہ پھیلتے پھیلتے سارے آسمان پر محیط ہو گیا ، اب آسمان پہ طرح طرح کے نقشے نظر آ رہے ہیں ، ہوا کے زور میں بادل اِدھر سے اُدھر اُڑے

چلے جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے قدرت کا نداف روئی دھنک دھنک کر اڑا رہا ہے، بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہے ہیں، آسمان پر میدانِ جنگ کا سماں بندھ گیا ہے، بادلوں کے رسالے کالی اور اودی وردیاں پہنے بندوقیں چھوڑتے اور توپیں داغتے، تلواریں چلاتے اڑے چلے جاتے ہیں، گھٹا کیا ہے کوئی مست ہاتھی ہے جو سونڈھ میں تلوار پکڑ کر اسے گردش دے رہا ہے، آسمانی توپوں کی گرج اور چمک سے دل دہلتے ہیں، بچے ماؤں کی چھاتی سے چمٹے جاتے ہیں، بارش موسلا دھار ہے معلوم ہوتا ہے نوحؑ کا طوفان آیا ہے یا میگھ دیوتا بگڑ گئے ہیں، سورج نے منہ پر کالے بادلوں کی نقاب ڈالی ہے، گھنگھور گھٹائیں مچل رہی ہیں، پانی برس برس کر جل تھل ایک ہوا ہے، کوئی ملہار گاتا ہے، کوئی دیس الاپتا ہے، کہیں ہارمونیم بج رہا ہے، کہیں گراموفون کے ریکارڈوں سے لطف اٹھایا جا رہا ہے، برساتی گیت سن کر سننے والے سر دھن رہے ہیں ؎

آئی بدریا برسن کو، ترست ہے دل درسن کو
آئی بدریا برسن کو

باغبان خوش اور کسان سرمست ہے، کوئل کی کوک سے دل میں ہوک اٹھتی ہے، پپیہوں کی آواز کچھ اور لطف پیدا کرتی ہے، مور کی جھنکار سے اور ہی سماں بندھا ہے، جہاں کوڑی کے ڈھیر

تھے اب وہاں سرسبزی اور شادابی نے گل کھلائے ہیں، خشک جھیلیں اور دریا اُبل رہے ہیں، ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں، کالی گھٹا سامنے سے جھوم کر اُٹھی ہے، دُھواں دار ابر آیا ہے، بجلی کوندتی ہے تو آنکھوں میں چکاچوند آجاتی ہے، بگلوں کی سفید سفید قطاریں اور گھٹاؤں کا پس منظر کیسی بہار دکھاتا ہے جب بادل گرجتا ہے تو دل ہل جاتے ہیں، پرندے دبک کر شاخوں میں چھپتے پھرتے ہیں، جانور درختوں کی اوٹ ڈھونڈھتے ہیں، مور جُدا جھنکارتے ہیں، پپیہے الگ پکارتے ہیں، مینڈک رل مل کر ٹراتے ہیں، مویشی پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے پھرتے ہیں نکلنے کا نام نہیں لیتے، زمین کے مخفی خزانے بارش کے جادو سے آپ ہی آپ برآمد ہو گئے، ویرانے اور باغ شہروں سے زیادہ آباد ہیں، جھولے پڑے ہوئے ہیں، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے، کچھ جھولتے ہیں کچھ جھلاتے ہیں، چہلیں ہو رہی ہیں چھینٹوں سے لڑا جا رہا ہے، دیکھنا پینگیں کہیں سے کہیں جا پہنچیں، اُف اُلٹنے کا خطرہ ہے، کتنا دل گردہ ہے، نہیں جوانی دیوانی ہے، یہ اُس کا جوش اور آب و ہوا کی تاثیر ہے، لو وہ زور کی بارش آگئی، آہاہا تل دھار اوپر دھار برسنے لگا، سب آم جامنوں کے ٹوکروں پر ٹوٹ پڑے، کھاتے جاتے ہیں مزے لیتے جاتے ہیں، پہلے گٹھلیوں اور چھلکوں سے چوکھی شروع ہوئی پھر کھٹے

آموں سے مُنہ کی آنے لگے، جب دل سیر ہو گیا تو جتنے کھائے اتنے کھائے باقی لڑائی میں کام آئے، کہیں ناچ گانا ہو رہا ہے خوب چہل پہل ہے، قدم قدم پر پھول کھلے ہیں، طرح طرح کی خوشبوئیں آ رہی ہیں، ٹھنڈی ہواؤں سے ٹہنیاں مستوں کی طرح جھوم رہی ہیں، اور مستی کے عالم میں پھولوں کا [illegible]، صبح کے وقت شبنم ان کا مُنہ دُھلاتی ہے، کوئل اذان دے کر جگاتی ہے، بادِ نسیم شکرانے کے لئے جھکاتی ہے، اور شبنم کے موتی ان چمن کے تاجداروں پر سے نچھاور کرتی ہے، طائرانِ خوش الحان ہیں کہ غول غول اُڑتے پھرتے ہیں، کوئی زمزمہ پرداز ہے، کوئی کلول کر رہا ہے، کوئی بول رہا ہے، غرض بھیگی بھیگی ہوائیں مرغانِ چمن کی نغمہ سرائیاں اور برسات کی چمن آرائیاں وہ لطف پیدا کر دیتی ہیں جو کسی اور موسم کو نصیب نہیں، اسی لئے ہم لوگ اس بہار کو موسم بہار کہتے ہیں۔

میلے ٹھیلے برکھا رُت کی گل ریز اور گل خیز آب و ہوا عجب گُل گلزار کھلاتی ہے، آج کل کے زمانے میں وہ پہلی سی باتیں نہیں رہیں مگر پھر بھی جو میلے تماشے قدیم سے چلے آتے ہیں اب بھی منائے جاتے ہیں، ان میں امیر غریب ہندو مسلمان سبھی شریک ہوتے ہیں اگلے زمانے میں ان میلوں سے ہندو مسلمانوں میں یکجہتی اور یگانگت پیدا ہوتی تھی، سب ایک جگہ جمع ہوتے تھے اور مل کر

خوشیاں مناتے تھے، اب یہ میلے جنگ وجدل کا درس دیتے ہیں،
ذرا سی بات پر جنگ چھڑ جاتی ہے اور دم کے دم میں چھُری
کٹاری ہو جاتے ہیں، اگر کوئی میلہ آیا تو سمجھ لو کہ قہر خدا کا پیش خیمہ
پتہ نہیں کتنے زخمی ہوں گے، کتنے بیگناہ مارے جائیں گے،
کوئی قید ہو گا کسی کو پھانسی ملے گی، کئی گھر بے چراغ ہو جائینگے
یتیم اور بیوائیں لاوارث ہو کر ماری ماری پھرینگی، خدا جانے
دُنیا کو کیا ہو گیا ہے، آخر پہلے بھی یہی میلے تھے اور یہی
ہندو مسلمان تھے۔

پھول والوں کی سیر | دِلّی والے برسات کے موسم میں "پھول والوں کی
سیر" کا میلہ ابھی تک مناتے ہیں، لیکن وہ پہلی سی بات کہاں،
پھر بھی جو کچھ باقی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، یہ میلہ مُغلیہ
سلطنت کی یادگار ہے، شاید اس کو اکبر شاہ ثانی نے قائم کیا تھا،
وہ برسات میں ہمیشہ مہرولی (قطب صاحب) جا کر رہتے تھے، اِن
کی وجہ سے ساری دِلّی وہاں پر اُمنڈ پڑتی تھی، اتحاد، یگانگت،
یکجہتی اور اِتّفاق کے وہ سمے دیکھنے میں آتے تھے کہ کوئی ہندو
مسلمان اور امیر غریب میں امتیاز نہیں کر سکتا تھا، مُدّتوں پہلے
تیاریاں شروع ہو جاتیں، سیر کی نفیری بجتے ہی خوب چہل پہل
ہو جاتی تھی؛ قطب صاحب میں مکانات کرایہ پر نہ ملتے تھے،
دو دو چار چار روپے کے مکانات چند دن کے لئے پچاس پچاس

اور ساٹھ ساٹھ پر اُٹھتے اور پھر بھی ڈھونڈھے نہ ملتے، گھر گھر وہ ہجوم ہوتا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی، اور مارے غُل غپاڑے کے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی، بچّے الگ کھیل رہے ہیں، عورتیں علیحدہ منڈلی جمائے بیٹھی ہیں طرح طرح کے کھیل ہو رہے ہیں کہیں جھولا ہے کہیں شطرنج اور چوسر کی بساطیں بچھی ہیں کنکوے بازی، گلی ڈنڈا، کبڈی، آنکھ مچولی، خدا جانے کیا کیا کھیل کھیلے جاتے تھے، مینہ آگیا تو سب بارش میں بھیگ رہے ہیں، کپڑے شرابور ہیں، چھینٹوں سے لڑا جا رہا ہے، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، کوئی پھسلا اور گرا تو قہقہوں کی گونج سے آسمان پھٹ جانے کا گمان ہوا، کوئی کسی کا منہ کالا کرتا اور نہیں تو کیچڑ ہی منہ پر مل دیتا، موقع پاتے ہی پانی میں دھکا دیتا، غرض ایک ہنگامہ رہتا، شام آتی تو نئے لطف لاتی، سب کپڑے بدل کر جمع ہیں، ڈھولک بج رہی ہے، بچّی بوڑھیاں مل مل کر گا رہی ہیں مردوں کی نشستگاہ میں رنڈی کا رقص ہو رہا ہے، ہر طرف سے ایسی سُریلی آوازیں کانوں میں آ رہی ہیں کہ دل کھچا جاتا ہے، جس مکان کے آگے دیکھو ٹھٹ کے ٹھٹ آدمیوں کے لگے ہیں، کھڑے گا ناسن رہے ہیں اور وہیں سے بیساختہ داد دے رہے ہیں، بازاروں کی رونق اور چہل پہل کا کیا کہنا، طرح طرح کی دکانیں کھلی ہیں، کوئی دیکھ رہا ہے، کوئی خرید رہا ہے، قدم قدم پر کڑاہیاں چڑھی ہیں، کہیں

پکوان پک رہے ہیں، کہیں پراٹھے اُتر رہے ہیں، کبابوں والے کی دُکان پر اس قدر بھیڑ ہے کہ گھنٹوں باری نہیں، پھُول والے کنٹھے لئے پھرتے ہیں، دوگنی چوگنی قیمت لیتے ہیں، مگر پھر بھی لوگ شوق سے لئے جاتے ہیں، جسے دیکھو پھُولوں سے لدا پھندا اکڑتا ملکتا چلا جارہا ہے، پنواڑیوں کی دُکانوں کے آگے بھی خوب ہجوم ہے، گلوریوں کے تھال بھرے رکھے ہیں اور لگے ہاتھوں بکتے چلے جاتے ہیں، چھلّے انگوٹھیوں کی دُکانیں اتنی پُر رونق ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے، کیوں نہ ہو پھُول والوں کی سیر کا یہی خاص تحفہ ہے، جو شخص آتا ہے انگوٹھیاں چھلّے ضرور خریدتا ہے، اور خوشی خوشی گھر جاکر تقسیم کرتا ہے۔

جھُوم جھوم کر بادل آرہے ہیں، کالی گھٹائیں دیکھ کر ہر ایک کا دل مچلتا ہے، کوئل کی کوک اور مور کی جھنکار موسلا دھار بارش کا پیغام دے رہی ہے، لو وہ مینہ آگیا، ہلکی ہلکی پھوار میں سب بھیگ کر لطف اُٹھا رہے ہیں، کیاریوں میں پھُول اپنی بہار دکھا رہے ہیں، بہار دیکھنے والوں کی بہار الگ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، رنگ برنگ کی تیتریاں پھُول پھول پر اُڑتی پھرتی ہیں، اگر سچ مچ کوئی تیتری آگئی تو اس کے پیچھے بھاگ پڑے، کوئی گر پڑا تو طرح طرح کی پھبتیاں اڑیں کیا مجال جو کپڑے بگڑے کا خیال آئے سب بے تکان گھاس کو روندے ڈالتے ہیں، اگر آم

کھا رہے ہیں تو کچھ اور ہی لطف ہے ، ذرا کسی کی آنکھ بچی دوسرے نے فوراً آم کی گٹھلی ماری ، اگر کسی کا آم کھٹّا نکلا تو سمجھو دوسروں کی شامت آگئی ، ان سے فارغ ہوئے تو آلو کچالو کھلنے کی نوبت آئی ، رنگترے اور انار کچھ کھاتے کچھ پھینکے ، کسی کی آنکھوں کے قریب چھلکا لیجا کر دبا دیا ، آنکھوں سے پانی بہنے لگا ، کوئی رو رہا ہے ، کوئی ہنس رہا ہے ، اس طرح سے دن کٹا ، لو اب شام آئی ، اور کچھ نیا ہی رنگ لائی ، ہر زبان پر یہی ہے چلو چل کے پنکھے دیکھیں ، یہ دھوبیوں کا پنکھا ہے ، یہ سقّوں کا ہے ، یہ کھتریوں کا ہے ، دیکھنا کیا خوبصورت بنایا ہے ، کارچوب سے لپا ہے ، معلوم ہوتا ہے سونے کا بنا ہے ، پھول والوں کا پنکھا دیکھو ، واللہ کیا صنّاعی صرف کی ہے ، غرض ہر قوم کے پنکھے کی شان نرالی ہے ، جلوس کو دیکھو توبہ توبہ سارا شہر اتنی سی جگہ میں آگیا ہے ، تل دھرنے کو جگہ نہیں کھوّے سے کھوّا چھلا جاتا ہے ، کیسی دھکا پیل ہے ، روشنی سے رات کو دن بنا دیا ہے ، چھجوں اور برآمدوں پر سے تماشائی لٹکے پڑتے ہیں ، دو کی جگہ پر دس کھڑے ہیں ، اگر چھجہ نیچے آگیا تو کوئی زخمی ہوا ، کسی کی ہڈی پسلی ٹوٹی ، خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی ، کمروں اور برآمدوں پر سے چھنا چھن روپے برس رہے ہیں ، نفیری والا مست ہو ہو کر اپنی نفیری بجا رہا ہے ۔

میرا پیا گیا ہے بدیس، موری چولی کون رنگاوے بیری ساون آیو ری، مورا پیا گیا ہے بدیس
اب آتشبازوں نے آتشبازی چھوڑنی شروع کی جس کو دیکھ کر ہر ایک کے مُنہ سے بیساختہ واہ نکلی، شوقینوں نے اُستادوں کے گلے میں ہار ڈالے، انعام و اکرام دیا، اور میلہ بچھڑنا شروع ہُوا۔ مسلمانوں نے اپنے پنکھے درگاہ پر چڑھائے، ہندو اپنے پنکھے جوگ مایا لے گئے، باقی رات ناچ گانے میں گزری، صبح ہوئی تو پھر وہی رنگ ڈھنگ، لیکن اب آہستہ آہستہ رُخصت ہونے کے انتظام ہو رہے ہیں، دو دن بعد دیکھنا قطب میں سنّاٹا ہوگا اور انسان کی شکل نظر نہ آئیگی۔

برسات کی صعوبتیں | برسات کا موسم باوجود اپنی رنگینیوں کے صعوبتوں سے خالی نہیں، اکثر بارش ہو چکنے کے بعد جب دھوپ نکلتی ہے تو دُھوپ کی گرمی سے پانی کے بخارات بننے شروع ہوتے ہیں، اور ہَوا چلنی بند ہو جاتی ہے، عام زبان میں اس کو بند گرمی یا حبس کہتے ہیں، حبس "شدّت کی گرمی" سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے، سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے، پسینے آکر کپڑے بدن سے چمٹ جاتے ہیں، اور حد درجہ ناگوار معلوم ہوتے ہیں، برسات کے پسینوں میں سے ایک خاص قسم کی بُو آتی ہے جس سے دل بہت ہی خراب ہوتا ہے۔

حبس عام طور پر بارش آنے سے پہلے بھی ہو جاتا ہے لیکن بارش

ہونے سے یہ کیفیت دُور ہو جاتی ہے، جو حبس بارش ہونے کے بعد ہوتا ہے اس سے بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے پھر برسات کی موٹی موٹی اور بھاری بھاری مکھیاں جو غالباً ہیضے کے جراثیم سے بھاری ہو جاتی ہیں، طبیعت پر اور بھی زیادہ ناگوار گزرتی ہیں، رات کے وقت روشنی کرنے سے پروانوں، بھنگوں اور ٹڈوں کی فوجیں ٹوٹ پڑتی ہیں، غرض ان دنوں زمین اور آسمان اپنے اچھے بُرے جوہر سب اُگل دیتے ہیں، اگر کہیں جگنو، بیر بہوٹیاں دلکش معلوم ہوتی ہیں، تو دوسری طرف سانپ، بچھو، کنکھجوروں اور کیڑوں، پتنگوں سے دل سہما جاتا ہے۔

جب برسات پورے زور شور سے آتی ہے، اور کئی کئی دن سُورج دکھائی نہیں دیتا، تو خلقت اللہ میاں کی نوازشوں سے گھبرا جاتی ہے، بجلی کی چمک اور گرج اور مسلسل بارش سے لوگ پناہ مانگنے لگتے ہیں، اب اُلٹی دُعائیں مانگی جاتی ہیں کہ یا اللہ اس طوفانِ نوح سے محفوظ رکھیو، کوئی کہتا ہے جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو، کوئی بارش روکنے کے لئے مسافر بنا کر کھڑا کرتا ہے، کوئی پرنالا لیپتا ہے، غرض بارش روکنے کے لئے طرح طرح کے ٹوٹکے کئے جاتے ہیں، بارش کے خوف سے لوگ گھروں سے نہیں نکلتے، بار بار آسمان کی طرف دیکھتے ہیں کہ دیکھئے کب مطلع صاف ہو اور اطمینان کا سانس لیں۔

ہر طرف سے بارش کی تباہ کاریوں کی اطلاعیں آتی ہیں، کبھی

سُننے میں آتا ہے، فلاں مکان گر گیا، اس کے نیچے گھر والے دب کر مر گئے، کہیں سے خبر آتی ہے، دریا میں سیلاب آگیا اور فلاں گاؤں غرق ہوگیا ہے، جانور بہہ گئے جو بچ گئے تھے وہ چارہ نہ ملنے سے مر گئے، مکانات گر گئے، لوگوں نے درختوں پر چڑھ کر اپنی جان بچائی، اور جو کشتیاں ان کی امداد کے لئے پہنچی تھیں وہ آدمیوں سمیت غرق ہوگئیں، اچھے اچھے پختہ مکانات کو بارش سے نقصان پہنچتا ہے، شاید ہی کوئی ایسا مکان بچتا ہو جو ٹپکتا نہیں۔

کسی نے ایک نہایت سن رسیدہ بُڑھیا سے پوچھا کہ بُڑھیا بُڑھیا تُو کس چیز سے ڈرتی ہے، بُڑھیا نے جواب دیا، بیٹا میں کسی چیز سے نہیں ڈرتی، فقط ٹپکے سے ڈرتی ہوں، اس نے کہا، بڑھیا تو شیر سے ڈر، سانپ سے ڈر، موت سے ڈر، یہ ٹپکے سے ڈرنا کیسا، بُڑھیا نے نہایت متانت سے جواب دیا، بیٹا ہر چیز سے اِنسان بچ سکتا ہے، لیکن ٹپکے سے انسان نہیں بچ سکتا۔

بڑھیا کا جواب بالکل ٹھیک تھا، جن لوگوں کو ٹپکے کا تلخ تجربہ ہے، اس مصیبت کا کچھ وہی اندازہ کر سکتے ہیں، جب کوئی مکان ٹپکتا ہے تو اس میں رہنے والوں کی عجب حالت ہوتی ہے، اچھےّ چپےّ پر برتن رکھتے پھرتے ہیں، دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے، گھر کا سامان الگ خراب ہو جاتا ہے، جس کو دھوپ دینے کے لئے خاصی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے اور اگر سوءِ اتفاق سے

دھوپ کئی دن نہ نکلے تو اکثر چیزیں ضائع ہو جاتی ہیں، اگر بچ جائیں تو برسات کی نشانیاں ان کو ہمیشہ کے لئے داغدار بنا دیتی ہیں، شدّت کی بارشوں سے مکانات گر جاتے ہیں، بعض کا تو لاکھ کا گھر خاک ہو جاتا ہے، نہ ان کے پاس کھانے کو روٹی نہ بیٹھنے کو جگہ اور نہ پہننے کو کپڑا رہتا ہے، ایسی بارشوں سے خدا بچائے، اب تو پہلے جیسی بارشیں ہی نہیں ہوتیں، کہتے ہیں جنگل کم ہو جانے سے بارشیں بھی کم ہو گئی ہیں، پہلے ایسی بارشوں کو ڈھائی ڈھوئی کی بارشیں کہتے تھے، اور ان کے تصوّر سے پناہ مانگتے تھے۔

برسات کی تباہ کاریاں یہیں ختم نہیں ہو جاتیں موسم خراب ہو کر طرح طرح کی بیماریاں پھیلتی ہیں، اکثر ملیریا اور ہیضہ سے ہزاروں جانیں تلف ہو جاتی ہیں، گھر ہسپتال بن جاتے ہیں۔

جاڑا

گلابی جاڑا | قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے، ہمارے ملک کی آب وہوا میں بھی افراط و تفریط موجود ہے، کبھی سخت گرمی ہے، کبھی شدّت کی برسات، اس کے بعد سردی اور پھر قیامت کی سردی، خدا خدا کرکے گرمی کی ہیبتوں اور برسات کی صعوبتوں سے نجات ملتی ہے تو جاڑے کا موسم آتا ہے، شروع شروع میں جاڑا بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے، لوگ باگ باریک کپڑے اُتار کر ذرا بھاری کپڑے پہنتے ہیں، جن میں جوانی کی حرارت ہوتی ہے، وہ سرد کپڑوں میں اکڑے مکڑے پھرتے ہیں، جسموں میں جان اور چہروں پر رونق آتی ہے، چلنے پھرنے کا مزا آتا ہے، ٹھنڈی ہوائیں کملائی ہوئی طبیعتوں میں زندگی کے آثار پیدا کرتی ہیں، یہی زمانہ جاڑے کی آمد آمد کا وقت ہے اور ٹکسالی اُردو میں گلابی جاڑا کہلاتا ہے، ایسا موسم عام طور پر اکتوبر سے نومبر کے وسط تک رہتا ہے۔

چلّے کی سردیاں | گلابی جاڑے کے بعد اصلی جاڑا آتا ہے، اب ذرا لوگوں کی طبیعتیں سردی کی طرف رجوع ہوتی ہیں، جسے دیکھو گرم کپڑے پہنے بیٹھا ہے، جُوں جوں سردی بڑھتی ہے، لباس بھی گرم تر ہوتے

جاتے ہیں، جب جاڑا بہت ہی شدّت کا پڑتا ہے تو کہتے ہیں بابا "چلّے کا جاڑا" ہے، ہر شخص سردی سردی، جاڑا جاڑا پکارتا ہے، ذرا باہر نکلو دانت سے دانت بجنے لگتا ہے، باد خنک کے جھونکوں سے دل تھرّاتا ہے، جسم کانپتا ہے، جی چاہتا ہے لحاف ہی میں دبکے رہو، کمرے کے دروازے بند رکھو، آگ روشن رہے، غرض جس طرح بھی ہو گرم رہیں، گرم گرم غذائیں کھائیں، گرم گرم چائے پئیں، بس نہیں چلتا کہ آگ کو سینے میں رکھ لیں، مُنہ سے انجن کی طرح دُھواں نکل رہا ہے، لیکن سردی سردی کی فریاد ہے، کوئی سیٹی بجاتا چلا آتا ہے، کوئی سوں سوں کر رہا ہے، بچّے ماؤں کے سینے سے چمٹے جاتے ہیں، کوئی لحاف سے مُنہ نکالے پڑا ہے، کسی نے انگیٹھی کلیجے سے لگائی ہے، کسی نے لحاف میں رکھ لی ہے، انگیٹھی بیچ میں رکھی ہے، چاروں طرف سارا گھر ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہے، باتیں ہو رہی ہیں، حکایتیں بیان کی جارہی ہیں، ذرا آگ دھیمی ہوئی اور سردی کا لفظ ہر ایک کی زبان پر بیساختہ آیا، غرض سردی کے لطف کچھ سردی ہی میں آتے ہیں۔

منچلے نوجوانوں کی حالت بھی ان دنوں عجیب ہوتی ہے، کمزور اور بوڑھے تو مارے سردی کے بات نہیں کر سکتے، اگر کہتے ہیں تو یہی کہ ارے بابا بڑی سخت سردی ہے، اپنی جوانی پر رحم کرو، سردی سے بچو، گرم کپڑے پہنو، ہمارے حال پر کرم کرو، لیکن وہ بھلا کب سُنتے ہیں، کہتے ہیں سردی ہے کہاں، ہمیں تو کوئی نہیں لگتی، خون کی حرارت واقعی سردی محسوس نہیں

ہونے دیتی، بڑے بوڑھے منع کرتے رہے اور وہ ٹھنڈے پانی سے نہالئے، صبح کا وقت ہے، سردی کے مارے منہ سے بات نہیں نکلتی، بقول شخصے الفاظ منہ میں جم جاتے ہیں لیکن یہ لحاف میں سے نکلے اور بغیر کپڑے پہنے صحن میں نکل آئے۔

دلچسپ حادثے

مجھے ایک واقعہ یاد آگیا، ستمبر کا مہینہ تھا، ہم کشمیر میں گاندربل کے مقام پر اپنے ہاؤس بوٹ میں مقیم تھے دریا میں نیلا نیلا پانی عجب لطف دے رہا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑوں پر سے برف پگھل پگھل کر آرہی ہے، پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ ہاتھ پاؤں سن ہوتے تھے، اس دن سردی زیادہ تھی ہم اپنے کمرے میں بیٹھے دریا کی سیر دیکھ رہے تھے، قریب ہی چند نوجوان نہا رہے تھے، ان میں سے ایک تیرتے تیرتے دریا کے منجھ میں چلا گیا، وہاں پہنچکر وہ ایک دم چلّایا، ارے پکڑنا، لینا، مرا، فوراً دو ایک آدمیوں نے چھلانگ ماری، اور انہیں پکڑ کر کنارے پر لائے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ٹھنڈے پانی سے ان کا تمام جسم سن ہو گیا تھا، اگر وقت پر مدد نہ پہنچتی تو یہ حضرت وہیں جم گئے ہوتے، اس واقعہ کے دوسرے دن ہمارے ساتھی کو ایک اور دلچسپ حادثہ پیش آیا، ان کو سوء اتّفاق سے تیرنا آتا تھا، وہ حضرت حسب دستور لنگوٹہ کس کر دریا میں کود گئے، لیکن خلاف معمول تھوڑی دیر میں نکل آئے، کہنے لگے سردی بہت لگ رہی ہے، میں نے کہا بہت عقلمندی کی آپ فوراً تشریف لے آئے ورنہ ملّاحوں کو چھلانگ مارنی پڑتی، شام ہوتے ہوتے انکے سینے میں

درد ہونے لگا اور تکلیف زیادہ بڑھ گئی، ڈاکٹر کو بلایا، اُس نے تشخیص کیا کہ نمونیا ہو گیا ہے، سخت پریشانی ہوئی، خیر علاج ہو گیا، اور جان بچ گئی۔
اکثر پُرانے لوگوں کی زبانی سردیوں کا یہ لطیفہ بھی سُننے میں آیا ہے آپ بھی اس سے کیوں محروم رہیں، کہتے ہیں بہت مدت کا ذکر ہے، سردی کا موسم تھا اور چِلّے کے جاڑے پڑ رہے تھے، لکھنؤ کے رنگیلے بادشاہ اپنے محل میں جھروکوں کے پاس کھڑے سیر کر رہے تھے، کیا دیکھتے ہیں کہ دو نوجوان باریک تن زیب کا انگرکھا پہنے چھڑی ہلاتے، اس طرح سیر کرتے چلے جا رہے ہیں، جیسے گرمیوں کا موسم ہوتا ہے، بادشاہ سلامت کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی، اپنے مصاحب سے فرمایا، ماشاء اللہ خوب نوجوان ہیں، لوگ ہمارے لکھنؤ کو خواہ مخواہ بدنام کرتے ہیں کہ یہاں کے لوگ کمزور ہوتے ہیں، ہمارا جی چاہتا ہے ان سے ملاقات کریں، فوراً پیش خدمت دوڑے اور نوجوانوں کو ملاقات کے لئے ایک کمرے میں لا کر بٹھا دیا، سرکار یہ بات کہہ کر اپنی رنگ رلیوں میں لگ گئے اور بالکل خیال نہ رہا کہ کسے بلایا تھا اور کیا کہا تھا بہت رات گئے جب گانے کی محفل برخاست ہوئی اور حضور خوابگاہ تشریف لے جانے لگے تو سردی لگی، اس وقت پھر وہ نوجوان یاد آئے، اپنے مصاحب سے ان کا ذکر کیا، اس نے عرض کیا، حضور وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں، آپ فوراً ان سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے، کمرے میں داخل ہوئے، وہ نوجوان اسی طرح بیٹھے رہے، آداب و کورنش

کا بھی خیال نہ کیا، بات کی تو اُس کا جواب نہ دیا، بار بار سوالات ہوئے،
آخر مصاحب زچ ہو کر ان کے قریب گئے، اور کہا، یہ کیا بدتمیزی ہے،
حضور کے سوالات کا جواب دو، وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے، شانہ
ہلایا تو معلوم ہوا، کہ سردی کی شدّت سے رُوح اور قوّت گویائی دونوں
جسم چھوڑ چکے ہیں، کہتے ہیں کسی مسخرے نے اسی موقع پر یہ شعر کہا تھا ؎

عاشق کا بانکپن نہ گیا بعد مرگ بھی
تختے پہ جو لٹایا وہاں بھی اکڑ گئے

سردیوں کی خزاں اور بہار | جُوں جُوں سردی بڑھتی ہے، آب و ہوا کی تاثیر
بدلتی جاتی ہے، سرد ہواؤں کے جھکڑوں سے جس طرح سینوں میں
دل تھرّاتے ہیں اسی طرح نونہالانِ چمن مارے سردی کے پتّوں میں
مُنہ چھپائے لیتے ہیں، بادِ صرصر کے جھونکے سبز سبز پتّوں کو زرد
کر دیتے ہیں، پت جھڑ سے گل و گلزار کی رونق کم ہونی شروع ہوتی
ہے، نغمہ سنجانِ چمن ہرنوں کی طرح چوکڑی بھول جاتے ہیں پر پھُلائے
اور منقار زیر پر کئے ٹنڈ مُنڈ درختوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں، گل و غنچہ کی
مُرجھائی ہوئی پتّیاں ٹھٹھری ہوئی گھانس پھونس پر اُڑتی پھرتی ہیں، یہی
وہ موسم ہے جس کو موسم خزاں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

بہر حال جہاں سردی سے باغوں کی رونق کم ہوتی ہے وہاں اس
سے فائدے بھی پہنچتے ہیں، ہواؤں کی کثافتیں دُور ہوتی ہیں، زہریلے
حشرات الارض یا تو سردی کی شدّت سے ہلاک ہو جاتے ہیں یا اپنے

بلوں میں گھس جاتے ہیں اور وہیں منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں، برسات کے وبائی جراثیم سردی کی تاب نہ لاکر کالعدم ہوتے ہیں، مریض شفا پاتے ہیں، مزاجوں کی رطوبت خشک ہو جاتی ہے، میووں میں شیر ینی اور غذویت پیدا ہوتی ہے، تر اور خشک میوے مزہ دینے لگتے ہیں، کھانے پینے کا مزا آتا ہے، گنبد گردوں شیشے کی طرح صاف ہو جاتا ہے معلوم ہوتا ہے، عالم خاک کی انگوٹھی میں قدرت کے صانع نے ایک نہایت خوشرنگ فیروزہ بڑی کاریگری سے جڑ دیا ہے۔

عین سردی میں بسنت آتی ہے نباتات کا رنگ بدل جاتا ہے، سرسوں پھولتی ہے، نونہالان چمن بسنتی جوڑے پہنتے ہیں اور آنکھوں میں کھبے جاتے ہیں، بسنتی اور زعفرانی رنگ اس بہار میں کچھ عجب لطف دیتے ہیں، بسنت کے ترانے جب فضا میں گونجتے ہیں، ہر طرف سے شور اٹھتا ہے بسنت آگئی، بسنت آگئی، بسنتی جوڑے رنگے جاتے ہیں، خوشیاں ہوتی ہیں، رقص و سرود کی محفلیں برپا کی جاتی ہیں، آج اس محلّے میں کل دوسرے میں، مسرتوں کا ایک دریا اُمنڈ آتا ہے، بسنت کی خوشیوں میں ہندو مسلمان بغیر تعصب کے شریک ہوتے ہیں اور اس تہوار کو باہم مل کر مناتے ہیں۔

غریبوں کی سردی ہندوستان کے مفلس لوگوں کی بیشتر جانیں اسی جاڑے میں ضائع ہوتی ہیں، اسی لئے کہتے ہیں امیر سردی کو پسند کرتے ہیں اور غریبوں کو گرمی بھاتی ہے، غریبوں کے لئے کیا گرمیاں اور کیا

سردیاں، جس طرح بھی ہو اپنی زندگی کے دن پورے کرتے ہیں پھر سردی
تو انہیں لگتی ہے جو سردی سے بچ سکتے ہیں، غریبوں کی تو وہ
ہے، کیا ننگی نہائیگی اور کیا ننگی نچوڑے گی، کوئی اپنے مال میں مست
ہے کوئی اپنے حال میں، صبح اُٹھے سوں سوں کرتے اپنے کام میں
لگ گئے، پھر سردی کہاں، سردی نے ایسا ہی تنگ کیا، تو اِدھر
اُدھر سے کوڑا کرکٹ جمع کیا اور آگ جلا کر تاپ لی، دھوپ نکل آئی
تو پھر نہ کپڑے کی ضرورت ہے اور نہ آگ کی، شام کو تھکے ہارے آئے
چولھے کے آگے بیٹھ کر روٹی کھالی، جب تک جاگے چولھے کے قریب
بیٹھے رہے، باہر نکلے تو چار آدمی جمع ہوئے اِدھر اُدھر سے درختوں
شاخیں، پتّے، کوڑا کرکٹ اور اگر کہیں سے مل گئیں تو چند ایک لکڑیاں
جمع کیں اور راستے میں آگ سُلگا دی، چار اِدھر سے آگئے چار اُدھر
سے آنکلے، کوئی آتا جاتا بھی آبیٹھا، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور
آگ سینکتے رہے، جب نیند آئی تو کچھ وہیں چادر تان کر سو رہے،
جنہیں خدا نے گھر دیا ہے، وہ اپنی تنگ و تاریک کوٹھری میں
رہے، مفلس کسان سردی سے بچنے کے لئے اکثر اپنی کوٹھریوں میں
گائے بھینس باندھ لیتے ہیں اور اس کے سانس کی گرمی سے اپنی
تئیں سردی سے بچاتے ہیں جن کو یہ بھی میسّر نہیں، وہ سڑکوں کے
کنارے لوگوں کے دروازوں اور دُکانوں کے چبوتروں پر لمبی تان لیتے
ہیں، موت ان کی جانوں کی حفاظت کرتی ہے، جس کا وقت آلگتا ہے

مفلسی اور بیکسی اُس کے سرہانے آنسو بہاتی ہے۔

سردیوں کے ثواب

سردی کے موسم میں اکثر امیر لوگ کمبل اور لحاف غریبوں میں تقسیم کر کے ثواب دارین حاصل کرتے ہیں، ہندوستان کی اکثر میونسپل کمیٹیاں بھی سردی میں کمبل وغیرہ تقسیم کرتی ہیں، لیکن ان کی مثال وہی ہوتی ہے کہ اندھا بانٹے ریوڑیاں اپنے اپنوں کو دے، پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اکثر مستحق لوگوں کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچ ہی جاتا ہے، بہت نہ سہی تھوڑا ہی تھوڑا، جن لوگوں کو بلا ضرورت یہ خیراتی کمبل اور لحاف مل جاتے ہیں وہ ان کو بیچ ڈالتے ہیں، میں نے خود اپنی آنکھوں سے کمیٹی کے خیراتی کمبل بکتے ہوئے دیکھے ہیں، اس کا عذاب و ثواب ان لوگوں پر ہے جو کسی لحاظ کے ماتحت یا بلغیر تحقیقات کئے غیر مستحقین کو مستفید فرماتے ہیں، نیکی بجائے خود نیکی ہے، لیکن اگر اس سے اس شخص کو فائدہ پہنچے جو حقیقت میں اس کا مستحق ہے تو سبحان اللہ۔

سردیوں کے دن

سردیوں میں دن چھوٹے ہوتے جاتے ہیں، اور راتیں لمبی، صبح آٹھ بجے کے قریب سورج کی شکل نظر آتی ہے، صبح کے وقت دھوپ میں گرمی نام کو نہیں ہوتی، معلوم ہوتا ہے سورج کی کرنیں برف میں سے ٹھنڈی ہو ہو کر آ رہی ہیں سرد ہوا جسم کو اس طرح لگتی ہے جس طرح کسی نے برف کا نیزہ مار دیا، سردی کے مارے ہاتھ باہر نہیں نکال سکتے، کوئی بغلوں میں ہاتھ دبائے لیتا ہے، کوئی اپنے

سانس سے گرم کرتا ہے، کوئی دستانے پہنے ہوئے ہے کسی نے کمبل لپیٹا ہے، کوئی لحاف ہی اوڑھ کر نکل آیا ہے کسی نے چسٹر اور کوٹ ڈانٹا ہے، گلے میں مفلر لپیٹا ہے، سر پر گرم ٹوپی ہے گرم پاجامہ ہے، گرم قمیض ہے، پہلے زمانہ میں اُونی کپڑے بہت مہنگے بکتے تھے، اس لئے عام طور پر رُوئی کے کوٹ بھروا کر پہنتے تھے، اب دُنیا ہی بدل گئی ہے، اگر کوئی آج کل رُوئی کا کوٹ، رُوئی کا پاجامہ اور روئی کا کنٹوپ پہن لے تو اُسے دیکھ کر ہنسی آئے اور مُنہ سے بیساختہ نکل جائے کہ یہ اُذباک کہاں سے آگیا، ابھی صدریاں عام طور پر استعمال کی جاتی ہیں لیکن ان کی جگہ بھی سویٹر، اُونی بنیان اور گرم واسکٹیں لیتی جاتی ہیں، اب چسٹر اور اور کوٹ سے جسم کو زینت دی جاتی ہے، پہلے زمانہ میں شالیں دُھسے، رضائیاں اور لبادے کام آتے تھے، کیا عجب ہے کہ عنقریب ہمارے سائنسدان کوئی ایسی دوا ایجاد کر دیں جو سردی نہ لگنے دے، اور اس مصیبت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دے۔

سردیوں کی راتیں سردیوں کی راتیں بہت طولانی ہوتی ہیں، پانچ بجنے نہیں پاتے کہ سورج غروب ہو جاتا ہے، اور رات کا سیاہ جھنڈا لہرانے لگتا ہے، سردی بلا کی طرح اُمنڈے آتی ہے، نو بجے تک بڑے بڑے شہروں میں اُلّو بولنے لگتا ہے، لوگ اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور جلدی جلدی سب ضروریات سے فارغ ہو کر لبستروں پہ دراز ہو جاتے ہیں، بُڈھوں کو کھُشکی کی

وجہ سے ذرا نیند کم آتی ہے اور سردی کی رات بھی کچھ غیر معمولی طور پر لمبی ہوتی ہیں، اس لئے بڑی بوڑھیاں اپنے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کو انگیٹھی کے گرد لے کر بیٹھ جاتی ہیں، کبھی پرانے زمانے کے خاندانی قصے سناتی ہیں، کبھی لمبی لمبی کہانیاں کہتی ہیں، کبھی گھر بار کی گفتگو رہتی ہے، شادی بیاہ، مرنے جینے اور نسبت ناطوں کے افسانے انہی راتوں میں لطف دیتے ہیں، اگلے وقتوں میں امیر گھرانوں میں مغلانیاں ملازم رکھی جاتی تھیں، امور خانہ داری سکھانے کے علاوہ ان کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ سردیوں کی طولانی راتوں میں لڑکیوں بالیوں کو کام کی باتیں، کہانیوں اور افسانوں کے ذریعہ سکھائیں، اگر کچھ نہ ہو تو سینا پرونا لے بیٹھیں، اب وہ زمانہ گیا، مغلانیاں نہ ملتی ہیں اور نہ کوئی رکھتا ہے اگھر گھر تعلیم کا چرچا ہے، مغلانیوں کی جگہ قصے کہانیوں کی کتابوں، ناولوں اور مدرسوں کے نصابوں نے لے لی ہے۔

مجلسوں اور صحبتوں کے مزے بھی سردیوں کی راتوں ہی میں آتے ہیں، گرمیوں میں تو کسی کے قریب بیٹھا نہیں جاتا، طرح طرح کے پسینے کی بھپک آتی ہے، دل الٹا جاتا ہے، لیکن سردیوں میں ایک دوسرے میں گھس کر بیٹھتے ہیں اور گھنٹوں گپیں لڑاتے ہیں، جوان اپنی جوانی کا اور بچے کہانی کا مزا اٹھاتے ہیں، رضائیوں اور کمبلوں میں لپٹے ہوتے ہیں، بیچ میں انگیٹھی رکھی ہے، رقص و سرود کی محفلیں برپا

ہیں، حُقّے کے دَور چل رہے ہیں، پان کی گلوری پر گلوری کھائی جا رہی ہے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد چائے کے سر بجوش پیمانے گردش میں آتے ہیں، اور پینے والے بے نشہ مست ہوئے جاتے ہیں۔

شب سرما کے لطف کیا بیان کئے جائیں، کہیں شاعر صاحب فانوس خیال کو روشن کئے بیٹھے ہیں، کوئی عالم ارواح کی سیر کر رہا ہے، کسی نے کتابیں کھول رکھی ہیں، کہیں کہانیاں ہو رہی ہیں، کوئی چوروں کے خوف سے دبکا ہے، کوئی گھوڑے بیچ کر بیخبر سویا ہے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد چوکیداروں کی دل ہلا دینے والی آواز جو آجاتی ہے، تو خوف سے جسم لرز جاتا ہے، ذرا سی کھٹ کھٹ ہے سارا گھر جاگ اُٹھتا ہے، چوہے اور بلّی کی کھٹا پٹی پر چور کا گمان گزرتا ہے، اور کوبل لگنے کا یقین ہو جاتا ہے، جس کی آنکھ پہلے کھلتی ہے دُوسرے کو آواز دیتا ہے، کیوں بھئی جاگ رہے ہو؟ ابھی سے سو گئے، اگر سوء اتفاق سے گھر میں کوئی مرد موجود نہیں تو کریم النسار کو بڑی بی پکارتی ہیں، ارے کریم سنگ کمبخت کیا مصیبت آگئی اتنی جلدی پڑ کر سو گیا، ذرا دیکھ تو چھینکے پر دہی رکھی ہے، بلّی آئی ہے، کسی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا، بلّی کے پاوں آیا ہے، کُتّے کے پاوں جائیو، کسی نے جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھی، جل تو جلال تو کا ورد کیا، یہ لیجئے جناب چور صاحب کو معلوم ہو گیا کہ ان کی آمد کی اطلاع ہو گئی، بھلا چور کے پاوں کہاں، چراغ لے کر

ڈھونڈو تو کوسوں پتہ نہیں، رات تو جوں توں کر کے گزار دی صبح کو نقش قدم تلاش کرنے کی کوشش کی گئی، کہیں کوئی پاؤں کا نشان مل گیا تو یقین ہو گیا کہ چور تھا، بار بار شکر کے کلمات زبان پر آنے لگے، کوئی سجدۂ شکر بجا لایا، کسی نے شکرانے کے دو نفل ادا کیے، کہ اللہ نے بچا لیا، ورنہ کیا دھرا تھا، غرض جذبات، توہمات اور خیالات جس سرعت اور آزادی سے سردی کی طولانی راتوں میں اُبھرتے ہیں اس کا اندازہ کچھ سردی ہی میں ہو سکتا ہے۔

سردیوں کی چاندنی | ہمارے ہاں مثل مشہور ہے کہ غریب کی جوانی اور سردیوں کی چاندنی یونہی ضائع جاتی ہے، پرانے لوگوں کی جو بات ہے باون تولے پاؤ رتی ہوتی ہے، بھلا آپ ہی بتائیے آپ نے سردیوں میں چاندنی کا لطف کب اُٹھایا ہے، اگر چاندنی کا کھیت دیکھنا ہو تو سردیوں میں دیکھیے، ماہتاب کے چشمہ سے کس طرح نور اُبلتا ہے، تمام عالم بُقعۂ نور بن جاتا ہے، لیکن سردی کب باہر نکلنے دیتی ہے، جو لطف اُٹھائیں، ہاں کہیں آتے جاتے چاندنی سے لطف اُٹھا لیا تو سبحان اللہ بے ساختہ زبان سے نکل گیا، اور یہ کہتے کہتے کہ آہا چاندنی کیسے جوبن پر ہے اپنے کمرے میں گھس گئے اور لحاف میں جا دبکے۔

مہاوٹ | سردیوں کی بارش بھی عجب لطف دیتی ہے، پہلے کئی دن تک مطلع ابر آلود رہتا ہے، کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی بوندیاں پڑ جاتی

ہیں، پھر ایسی ٹھنڈی ہوائیں ہوائیں چلتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے برف سے ٹکرا کر آرہی ہیں، جس حصّۂ جسم سے آکر ٹکراتی ہیں اسے سُن کرتی چلی جاتی ہیں، سرد ہوا کا ہر ایک جھونکا تیر و تبر کی طرح بدن کو کاٹتا ہے، اگر کہیں اولے پڑ گئے تو سمجھو قیامت آگئی، کُرّۂ خاک ورنا طبقۂ زمہریر بن گیا، مسلسل کئی کئی دن تک سورج کا منہ دکھائی نہیں دیتا، آنکھیں سورج دیکھنے کو ترس جاتی ہیں، جب بارش شروع ہوتی ہے، تو پھوئیوں پھوئیوں کئی دن تک برسے چلی جاتی ہے، یہ نہیں کہ ایک دم آجائے اور برس کر کھل جائے، لوگ گھروں سے نہیں نکلتے، دن کو یہ عالم ہے کہ لحافوں میں گھسے ہوئے ہیں، کمروں کوٹھریوں کے دروازے بند ہیں، انگیٹھیاں روشن ہیں، چراغ جل رہے ہیں، ذرا آگ سے دور ہوئے، سردی سے کانپ اُٹھے، دانت بجنے لگے اور سردی سردی پکارتے پھر انگیٹھی کے سامنے آ بیٹھے۔

ان دنوں میں لکھنے پڑھنے والوں کی بھی عجیب حالت ہوتی ہے، سردی سے ہاتھ ٹھٹھرے جاتے ہیں، انگلیاں سیدھی نہیں ہوتیں، ہاتھ سینک لیتے ہیں دو حرف لکھ لیتے ہیں، دفتروں میں انگیٹھیاں روشن رہتی ہیں، جس کے قریب آگ ہے وہ مزے میں ہے جو دور ہیں وہ تھوڑی دیر بعد آگ کے پاس دوڑ دوڑ کر آتے ہیں، کبھی ہاتھ سینکتے ہیں، کبھی پاؤں گرم کر کے جسم کو حرارت پہنچاتے ہیں، غرض چاروں طرف کے دروازے بند رہتے ہیں، اور اگر کھلے رکھنے ہوں تو

گرم پردے ڈال دیتے ہیں، کمرہ حمام بن جاتا ہے، پھر بھی سردی
چڑھے چلی جاتی ہے اور بیحال کئے دیتی ہے۔
ہمارے ملک میں اکثر سڑکیں بہت خراب ہوتی ہیں، اس لئے
ہلکی ہلکی بارش سے کیچڑ ہو جاتی ہے، اور کیچڑ بھی ایسی کہ چلنا محال
ہو جاتا ہے، پاؤں کہیں رکھو پڑتا کہیں ہے، ذرا انسان چوکا کہیں
کا کہیں پہنچا، اور چاروں شانے چت بیچ سڑک کے گرا، دیکھنے
والے دیکھ کر ہنستے ہیں، اور گرنے والا شرم کے مارے آنکھیں
اونچی نہیں کر سکتا، کوئی میونسپل کمیٹی کو برا بھلا کہتا جاتا ہے، کوئی
اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا چلا جاتا ہے جس کے کپڑے دیکھو کیچڑ
سے لتھ پتھ، جس کے جوتے دیکھو گارے سے دو دو من کے،
قدم اٹھائے نہیں اٹھتا، ایک دن بارش ہو تو کئی دن تک راستے
چلنے کے قابل نہیں ہوتے، جن سڑکوں کی اچھی طرح دیکھ بھال
کی جاتی ہے، وہاں اوّل تو کیچڑ ہوتی ہی نہیں، اور اگر ہوتی ہے،
تو بہت ہی کم، ایسی سڑکیں مشکل سے کسی بڑے شہر میں ایک دو
ہی ہوں گی، لوگوں کی چیخ پکار سے اکثر میونسپل کمیٹیاں سڑکوں کی
مرمت وغیرہ پر کافی روپیہ خرچ کرنے لگی ہیں، لیکن جن رستوں پر سے
انگریز افسروں کا گزر ہوتا ہے ان کی خاص طور پر دیکھ بھال کی
جاتی ہے، ورنہ اور سڑکیں اسی طرح کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہتی ہیں،
اگر سردیوں میں بارش ہو تو یہ مصیبتیں ہیں اور اگر نہ ہوں تو خشک

سردیاں اور بھی زیادہ قیامت برپا کرتی ہیں، خشک سردی میں نمونیا بہت ہوتا ہے، ذرا ہوا لگی اور کھانسی ہوئی، زکام آیا، اور نمونیا نے آن دبایا، سینے میں درد ہے، گرم گرم دوائیں پی جارہی ہیں، ہر ایک اپنے آپ کو پھپھولے کی طرح لئے پھرتا ہے، کہیں ہوا نہ لگ جائے، ہمارے ملک میں گرمی کی نسبت سردی سے زیادہ اموات ہوتی ہیں، بڑے تو اپنے آپ کو سردی سے بچائے رکھتے ہیں لیکن بچارے معصوم بچّوں کا اللہ ہی حافظ و ناصر ہوتا ہے۔

سردی کا موسم تقریباً فروری کے وسط میں ختم ہوجاتا ہے اور پھر وہی گلابی موسم آتا ہے، جس میں لوگ اپنی کینچلی بدلتے ہیں۔

دیہاتی زندگی

شہر کے ہنگاموں سے دُور، تصنّع اور آرائش سے پاک فضا میں جہاں فطرت اپنے اصلی رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے، دیہات آباد ہیں جو لوگ ان دیہاتوں میں فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں دیہاتی کہلاتے ہیں، ہم کیا جانیں دیہات کیا ہیں، دیہاتی زندگی کے لطف کچھ دیہاتی ہی جانتے ہیں اور وُہی ان کی قدر کر سکتے ہیں، ہم تو دیہاتوں کو ویرانوں اور گنواروں کے مسکنوں سے تعبیر کرتے ہیں، ہمارے لئے شہروں کی پُرشور فضا ہزارہا دلچسپیوں کا موجب ہے لیکن جو لوگ فطری ماحول میں زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں، وہ شہروں سے کوسوں بھاگتے ہیں، فطرت کے پُرکیف اور خاموش نغمے بہتی ہوئی ندیوں کے دلکش راگ، درختوں کی سائیں سائیں، رہٹ کے چلنے کی متوازن رُوں رُوں، کھیتوں میں کام کرنے والوں اور چرواہوں کے جذبات سے بھرے ہوئے گیت وہ لطف اور کیفیت رکھتے ہیں جو ہمارے اعلےٰ قسم کے ساز اور سازندے بھی پیدا نہیں کر سکتے۔

سادگی دیہاتی زندگی کی امتیازی خصوصیت سادگی ہے، دیہاتوں کے رہنے والے نہایت ہی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، وہ شہریوں کے

تکلّفات سے بالکل ناواقف ہیں، نہ فیشن کو جانتے ہیں، نہ اس کو پسند کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے جانور بھی شہریوں کے لباس، ان کی وضع قطع اور چال ڈھال سے ڈرتے ہیں، جس طرح ان کا طرزِ معاشرت سادہ اور بے تکلف ہے اسی طرح ان کا ماحول بھی تکلّفات اور تصنّع سے مبرّا ہے، لباس، عادات، رہنے سہنے کا طریقہ، بات چیت کا ڈھنگ، کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا، غرض ان کی ہر چیز سے سادگی ٹپکتی ہے، اور ان کی فطری سادگی کی گواہی دیتی ہے۔

لباس | دیہاتیوں کے لباس میں بھی غضب کی سادگی ہوتی ہے، گاڑھے کا کُرتہ یا فتوحی وہ بھی اگر موسم نے اجازت دی ورنہ اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں، پاؤں میں پُرانی وضع کا آدھ آدھ سیر کا جُوتا، اگر شہر کے قریب پہنچے تو پہن لیا ورنہ لٹھ کے سرے پر اَڑا کر کندے پر رکھے چلے جا رہے ہیں، سر پر خدا جھوٹ نہ بُلوائے تو پانچ سیر کا پگڑ، سمجھ لو کہ موتی ململ کا پُورا تھان لپٹا ہوا ہے، اگر سردی بہت زیادہ ہے تو گاڑھے کی ایک بڑی سی چادر جس میں تمام جسم لپٹ جائے، کندھوں پر پڑکا، ٹانگیں چھپانے کے لئے تہ بند، وہ بھی گاڑھے کا، اور تکلّفات میں شامل، ورنہ ایک چار اُنگل کی لنگوٹی کافی ہے، گرمی ہے تو چھتری کی ضرورت نہیں، سردی ہے تو اور کوٹ اور کمبل کے محتاج نہیں، کڑکتی ہوئی سردیاں اسی چادر میں گُزر جاتی ہیں، مگر کیا مجال جو کھانسی زکام سنائے، یا لسّی کو چھوڑ کر چائے کا نام آئے، غرض گرمی جائے سردی

آتے ان کے لباس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوتی، نہ ان کو گرمی ستاتی ہے، نہ جاڑا تنگ کرتا ہے، انتہا درجے کی گرمی میں ننگے پنڈے اپنے کھیتوں میں نہایت محنت طلب کام کرتے پھرتے ہیں موسمی تبدیلیوں سے ان کے کاروبار میں ذرّہ بھر فرق نہیں آتا، اور فطرت کی ستم ظریفی کا شکوہ ان کی زبان تک نہیں آنے پاتا۔

خوراک | دیہاتیوں کے لباس کی طرح ان کی خوراک بھی سادہ ہوتی ہے، ہماری طرح ان کو مرغن اور لذیذ کھانے مرغوب نہیں، دن بھر محنت کرنے کے بعد لہسن کی چٹنی اور خشک موٹی روٹی میں جو لطف اور لذّت ان کو حاصل ہوتی ہے وہ ہمیں رنگ برنگ کے کھانوں اور پلاؤ زردے میں نہیں آسکتی، ان کا من بھاتا کھاجا دودھ، لسی اور سادی اُبلی ہوئی ترکاریاں اور دال روٹی ہے، بلکہ ان کا دودھ اور مکھن ہمارے کام آتا ہے، گندم کی فصلیں شہریوں کو مبارک رہیں وہ تو جو اور بھجڑ کی روٹی کھا کر الحمد للہ کہتے اور بہت ہی خوش ہوتے ہیں، اس بات سے انکے معدے کی قوت اور جسمانی طاقت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے، ذرا شہری تو ایک دن جَو یا بھجڑ کی سوکھی روٹی کھا کر دیکھیں، واللہ پیٹ کے درد کے مارے بل کھاتے پھریں یا قلابازیاں لگائیں، خشکی سے رات بھر نیند نہ آئے، ڈاکٹروں، حکیموں کی خوشامدیں کریں، ان کی فیسیں بھریں، لیکن واہ رے دیہاتی اس قدر سادہ اور سخت غذا، اچھی صحت، طاقتور جسم، بلند ہمت، اس پر اپنی کھال میں مست، سو سو برس

کی عمریں، عینک کا کبھی نام نہیں سُنا، اگر کسی نے لگائی تو دلچسپی کا نمونہ بن گیا، دُور دُور سے لوگ پُوچھنے کو آر ہے ہیں کہ خیر ہے کیا ہوا، عینک لگائی ہے، باپ کی سو سال کی عمر تھی، دادا سوا سو برس کے ہو کر مرے تھے، خدا بخشے اندھیرے میں سُوئی پر و تے تھے اور آخر دم تک عینک کی نوبت نہ آئی تھی، اگر تمہارا استّر اسّی برس کی عمر میں یہ حال ہے تو پوتوں پڑ پوتوں کا کیا حشر ہو گا، ایک ہم لوگ ہیں پوتے تو دُور رہے بیٹے بیٹیوں کی شادی بھی دیکھنی نصیب نہیں ہوتی، پیدا ہوتے ہی حکیموں، ڈاکٹروں کا تانتا بندھ جاتا ہے، اور ادنےٰ جماعت میں عینک کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے، بچپن ہی میں چوُرن اور ہاضمہ کی دواؤں سے الماریاں بھری ہوئی نظر آتی ہیں، وقت پر کھانا ملتا ہے لیکن وہ بھی ہضم نہیں ہوتا، گہری نیند تو برسوں نہیں آتی، زندہ باد، دیہاتی آفرین ہے تیری زندگی پر، جس وقت بھوک لگی جو ملا کھا لیا، ہل جوت رہے ہیں، کنواں چلا رہے ہیں، سُوکھی روٹی نکالی اور پانی پی کر ڈکار لی، یہ بھی میسّر نہیں تو کھیت میں سے کوئی کچّی ترکاری توڑی اور چکر چکر چبا لی، دوپہر کو جب گھر والی کھانا لائے گی تو کھا لیں گے، کام چھوڑ کر گھر جانے یا بھوک کے مارے بیکار بیٹھ رہنے کی عادت نہیں، کھانا کھا کر نرم اور گرم بستروں کی ضرورت نہیں، درخت کے سائے میں زمین پر لیٹ رہینگے اور آرام کر کے پھر اپنے کام میں جُت جائینگے، شام کو محبّت بھرے گیت گاتے اور مؤثر تانیں

اُڑاتے، اپنے مویشیوں کو ہانکتے گھر آئینگے، نہا دھو کر روٹی کھائینگے، تھوڑی دیر چوپال میں بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرینگے اور پھر ایسے بیہوش ہو کر سوئیں گے کہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھینگے، ضروریات سے فارغ ہو کر پھر اُسی تن دہی سے اپنے کام میں لگ جائینگے۔

آب وہوا | حقیقت میں سب تعریف دیہاتوں کی پاک اور پاکیزہ، صحت بخش اور روح افزا آب وہوا کو ہے، اور یہ اسی اچھی آب وہوا ہی کا ثمرہ ہے کہ دیہاتوں میں رہنے والوں کی صحت شہریوں کی نسبت سو فیصدی اچھی ہوتی ہے، وہ کاشتکاری اور زراعت کے سخت ترین فرائض نہایت آسانی سے بجالاتے ہیں، موسمی تبدیلیوں کا ان کی صحت پر قطعی اثر نہیں ہوتا، ثقیل سے ثقیل غذا ہضم کر لینا ان کیلئے روزانہ کا معمول ہے، اور دیر ہضم غذائیں کھانا ان کا عام دستور، کہا جاسکتا ہے کہ اسکی ذمہ دار سخت کوشش اور محنت طلب طرز زندگی ہے، لیکن پھر بھی ماننا پڑیگا کہ کھلی ہوا اور کنوؤں کے پانی کو بھی اس میں بہت کافی دخل ہے۔

اگر ہم شہری لوگ چند دن کے لئے کیا چند گھنٹوں کے لئے دیہات چلے جائیں تو تازہ ہوا، ہرے بھرے کھیت چہروں پر تازگی پیدا کر دیتے ہیں، اور اگر حُسن اتفاق سے چند دن ٹھہرنے کا اتفاق پیش آئے، تو صحت میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

ایک مرتبہ ہمیں سیر وشکار کے لئے اپنے شہر کے مضافات میں جانے کا اتفاق ہوا، پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر ایک ہرا بھرا کھیت نظر آیا

ایک دیہاتی نے بتایا کہ یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ہرن ڈول رہے ہیں،
ہم وہیں اُتر گئے، شکاری بندوقیں لیکر شکار کے تعاقب میں نکل گئے اور ہم تین
چار آدمی کھیتوں کے بیچ میں ایک کنوئیں کے قریب پیپل کے درخت کے
گھنے سائے میں جا بیٹھے، کنواں چلاکر پانی پیا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں ادھر
ادھر گھومنے لگے، سرسبز کھیت، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، چرواہوں کے ترنم ریز
اور کیفیت انگیز گیت عجب لطف پیدا کر رہے تھے، اور خیال یہ تھا کہ اب
کوئی چیز ساتھ لیجانے کی ضرورت نہیں رہی، اس لئے ایسے ہی چلے آئے
تھے، لیکن اتنی بھوک لگی کہ اس نے ناقابلِ برداشت صورت اختیار کرلی،
رہٹ چلاکر پانی پیا کہ کچھ سہارا ہوجائے لیکن پانی نے سوڈے کا کام دیا،
اور بھوک زیادہ بھڑک اُٹھی، ہم وہاں سے واپس بھی نہ آسکتے تھے، کیونکہ
ہمارے شکاری ابھی واپس نہ آتے تھے، جہاں تک نظر کام کرتی تھی انکا سایہ
بھی نظر نہ آتا تھا، خیر جب بھوک کی شدّت برداشت سے گزر گئی تو اِدھر اُدھر کسی
چیز کی تلاش میں گھومنا شروع کیا، بھلا سنسان جنگل میں کیا رکھا تھا،
آس پاس کے کھیتوں میں مرچوں کے پودے لدے پھندے کھڑے تھے، جب
بھوک نے بالکل بیحال کردیا تو چند مرچیں توڑ کر بے تکلف چبالیں، بھوک تو
یقیناً رُک گئی لیکن مُنہ اور آنکھوں سے بلا مبالغہ پانی کے فوّارے چھوٹ گئے اور ساتھ
ہی دماغ بم کی طرح اُڑ گیا، بہر حال مرچوں نے اعضا میں غیر معمولی ہمّت پیدا کردی،
آگے بڑھ کر ایک جگہ باجرے کی چھوٹی چھوٹی بالیں نظر آئیں انکو توڑ کر دانے نکالے
بغیر ہی چبا گئے، جب اس کوشش میں بھی ناکام رہے تو آگ جلاکر بالوں کو

بھونا اسوقت ان کچّے پکّے دانوں نے وہ مزہ دیا کہ ابھی تک یاد ہے لیکن ک
مجال جو پیٹ میں درد یا طبیعت میں گرانی ہوئی ہو، ذرا آپ شہر میں رہ کر تو
مذبوحی حرکت کا ارتکاب کریں اگر پاگل اور سڑی نہ کہلائیں تو ہمارا ذمّہ اور اسے
ساتھ ہی اگر کئی ہفتے صاحب فراش نہ رہیں تو جو مُنہ میں آئے سو کہیں ہاں
، ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھلا آدمی آپ کو اپنی جان خطرے میں ڈالنے ہی نہ د
اور آپکو زبردستی روک لیگا، سبحان اللہ دیہات کی آب و ہوا جس میں پتھر
کھاؤ تو ہضم ہو جائیں اور مٹّی بھی کھا لو تو معدے میں پگھل کر سونا بن جا
. یہی وجہ ہے کہ دیہاتوں کی عمدہ آب و ہوا شہری بھی پسند کرتے ہیں اور ج
کبھی موقع ملتا ہے چند دن دیہاتوں میں رہ کر اپنی صحت درست کرتے ہیں
اب تو عوام کا رُجحان شہروں سے قریب کے دیہاتوں میں منتقل ہونے کی طرف
رہا ہے، گویا شہری بھی دیہاتوں کی عمدہ آب و ہوا سے مستفیض ہونا چا
اس تحریک کی مقبولیّت سے دیہاتوں کے شہر بن جانے کا ضرور خطرہ ہے
فطرت کی فیاضیوں کا فائدہ اُٹھانے کا ہر ایک کو حق حاصل ہے، صرف
دیہاتی بھائی کُھلی آب و ہوا کے بلا شرکت غیرے اجارہ دار نہیں ہیں

صفائی عام طور پر کہا جاتا ہے کہ صفائی خدا کو پیاری ہے، مگر فطرت پرست
ہیں دیہات خُدا کو پیارے ہیں کہ وہاں فطرت خلقت سے ہر وقت ہم آغوش
ہے، اگر ان دونوں اقوال کو یکجا کیا جائے تو ممکن ہے صفائی کے نام نہاد د
کو کچھ تضاد نظر آئے اور وہ دیہاتوں کو گندگی اور امراض کا سرچشمہ بتائیں
اگر انصاف کی عینک لگا کر دیکھا جائے تو جیسی صفائی دیہاتوں میں نظر

وہ شہر و نمیں نہیں، ذرا دیہاتیونکے گھر ملاحظہ فرمائیے، لپے پتے، صاف ستھرے معلوم ہوتا ہے ابھی بنکر تیار ہوتے ہیں، یہ اور بات ہے قدرت نے باوجود سخت کوشش زندگی کے انکو اتنی دولت نہیں دی کہ وہ پکے گھر اور پکی سڑکیں بنائیں، اور نئے دور کے صفائی کے اصولونکی پابندی کریں گویا اُن اعتراضات کو دور کرنیکی کوشش کریں جنکی بدولت وہ ملامت کا نشانہ بنے ہوتے ہیں، بہرحال حکومت نے ہر صوبے میں دیہات سدھار کے ادارے کھول دیئے ہیں جو دیہاتیونکو صفائی کی ترغیب اور ضروری تعلیم دے رہے ہیں، دیہاتی بھی اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں، امید ہے چند سال کے عرصے میں دیہاتی زندگی ایک نعمتِ غیر مترقبہ بن جائے گی اور دیہات ان تباہ کن وبائی امراض سے محفوظ ہو جائیں گے جو نئی روشنی کی صفائی نہ ہونے سے گاؤں کے گاؤں خالی کر دیتے ہیں۔

ہمدردی اور اشتراک عمل ہمدردی اور محبت کی جیسی مثالیں دیہات میں دیکھنے میں آتی ہیں وہ شہروں میں سُننے میں بھی نہیں آتیں، کسی کو ذرا سی تکلیف ہو سارا گاؤں خدمت کے لئے موجود، ایک کو خطرہ ہو پوری بستی جانوں کو سپر کیے حاضر، ایک گھر کا مہمان پُورے گاؤں کا مہمان، اگر ایک دیہاتی کے پاس کوئی چیز ہے تو باقی دیہاتی اسکو استعمال کرنیکے برابر کے حقدار، مگر ہمارے شہروں کی یہ حالت ہے کہ برابر کے گھر میں موت ہو جائے کوئی کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے، جھگڑا فساد ہو، خون خرابے ہو جائیں، کس نمی پُرسد کہ بھیا کون ہے، اسکے برعکس دیہاتونکی کیفیت ہی کچھ اور ہے، ہر شخص ہمدردی، محبت، استقلال اور اشتراک عمل کی زندہ یادگار، امیر غریب، زمیندار، کاشتکار سب ایک حال میں،

جو زمیندار ہیں انکے وارے نیارے ہیں، جو غریب اور مفلوک الحال ہیں وہ بیفکر ہیں جنکے گھر سے چاہیں گے چھاچھ لے آئینگے، جنکی زمین سے چاہینگے سبزی ترکاری توڑ لائینگے اور مزے سے کھائینگے، جب فصل کٹے گی خوشی خوشی سب کے سب جمع ہوکر ایک دوسرے کی امداد کرینگے اور اپنی محنت کے صلے میں سال بھر کیلئے اناج پائینگے، تمام سال بغیر ایک پیسہ لئے خدمات بجا لائینگے، اگر کسی کھانے پینے گھر میں شادی بیاہ رچے گا تو کمینوں کے پاس اتنا روپیہ آجائیگا کہ اپنے لڑکے لڑکی کی شادی باسانی کر لینگے، اور اسکی بھی کیا ضرورت ہے وہ شادی کا نام منہ سے نکالیں تمام گاؤں والوں کے بٹوؤں کے منہ کھل جائینگے، ہر شخص حسب مقدور امداد کریگا، کمینوں پر کیا منحصر ہے جس گھر میں شادی بیاہ ہو نیوتے کی رسم میں روپوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں، باہر سے کوئی چیز لانے کی ضرورت نہیں جس گھر میں دریاں موجود ہیں دریاں آجائینگی، جنکے ہاں حقے ہیں وہ حقے لے آئے گا جس کے پاس فالتو چارپائیاں ہیں وہ چارپائیاں پہنچا دیگا، غرض جس چیز کی ضرورت ہے اول تو بغیر مانگے مل جائیگی نہیں تو صاحب ضرورت بغیر کھٹکے مانگ لیگا، بلکہ اگر ایسے موقع پر کسی کی چیز سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو آپس میں شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں، رنجشیں بڑھ جاتی ہیں کہ ہمیں کسی قابل نہیں سمجھا گیا، بھلا یہ باتیں شہروں میں کہاں، وہاں تو ہر چیز پر "بلا شرکت غیرے ملکیت" کا لیبل لگا ہوا ہے، اگر شادی بیاہ اور مرنے جینے کے موقع پر کسی سے کوئی چیز مانگو تو کورا جواب ملتا ہے، اور بازار کا رستہ بتایا جاتا ہے،

دیہات قدیمی تہذیب و تمدن کا مرکز ہیں | مغربیت کی رو نے شہر والوں کی زندگی کو بالکل بدل

دیا ہے، پرانی تہذیب کی جگہ نئی تہذیب لے رہی ہے، اور ایسا انقلاب رونما ہو رہا ہے جسکی روک تھام نہایت مشکل نظر آتی ہے، لیکن دیہاتوں میں اب بھی پرانی تہذیب کے اثرات باقی ہیں، اگرچہ دیہاتی قدامت پرستی کے باعث مطعون کئے جاتے ہیں لیکن اس حیثیت سے وہ یقیناً قابلِ تعریف ہیں کہ اپنی پرانی تہذیب کے دلدادہ ہیں اور اس کو باوجود شدید مخالفت کے نباہ رہے ہیں۔

نئی تہذیب کی ترقی کا انحصار زیادہ تر دیہاتی ماحول پہ ہے، صنعت و حرفت کے کارخانے عام طور پر دیہاتوں ہی میں بنائے جاتے ہیں تاکہ کم اُجرت پر مزدور مہیا ہو سکیں، اسکے علاوہ نقل و حمل کی آسانیوں سے قدیمی دیہاتی صنعتوں کو بہت سخت نقصان پہنچ رہا ہے بلکہ عام طور پر دیہاتیوں کی ضروریات بھی شہروں کی منڈیوں سے پوری ہونے لگی ہیں اور انکی گھریلو صنعتیں روز بروز ختم ہوتی جاتی ہیں، اکثر اشیاء جو رؤساء اور امراء کے لئے مخصوص تھیں اب دیہاتوں میں عام لوگوں کے استعمال میں آتی ہیں، اس طرح سے دیہاتیوں کے عادات اور خیالات میں ایک انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔

اگر اس انقلاب کو دیہاتو نکی ترقی قرار دیا جائے تو واقعی دیہات شہرونکے قریب تر ہوتے جاتے ہیں، پھر بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ انمیں اور شہروں میں جو خصوصیت مابہ الامتیاز ہے اسے قائم رکھنے کی کوشش کیجائے تاکہ شہری زندگی کی جھمک جھمک سے محفوظ رہنے کا ذریعہ باقی رہے اور دیہات والوں کیلئے شہرونکی کشش بدستور باقی رہے۔

دیہاتی شہر میں | جب کسی آدمی کو اس کے ماحول سے نکال کر نئی فضا میں لایا جائے تو اس کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، بجنسہٖ ایسی ہی کیفیت اس دیہاتی

رتی ہے جو اپنے دیہات سے شہر میں آتا ہے، شہر کی ہر چیز اسے عجوبہ
تی ہے، جس چیز پر نظر پڑتی ہے حیرت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے،
کھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں، بچارہ دیہاتی جب شہر میں آتا ہے تو اپنی
ت وسکنات سے فوراً پہچانا جاتا ہے، اس کی سادگی سے شہر والے فائدہ
تے ہیں اور بچارے کو بات بات پر بیوقوف بناتے ہیں، وہ بھی انکے جال
سانی سے پھنس جاتا ہے، ہر چیز کی دوگنی تگنی بلکہ اس سے بھی زیادہ
ت ادا کرتا ہے اور الٹی سیدھی باتیں الگ سنتا ہے، کہیں اسے شہری
گی کے تکلفات شرمندہ کرتے ہیں اور کہیں اس کے دل میں استعجاب اور
ں کا جذبہ برانگیختہ کرتے ہیں، وہ اپنے گاؤں کی سادہ اور بے تکلف
گی کو دل ہی دل میں سراہتا ہے اور شہر والوں کو کوستا ہے۔
ی دیہات میں | شہروں کی گہما گہمی اور مصروفیتوں سے نکل کر جب کوئی شہری
ت میں جاتا ہے تو وہاں کی پر سکون زندگی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا
اور دیہاتی زندگی سے دلچسپی کا اظہار کرتا ہے، لیکن تھوڑی مدت میں
چسپی ختم ہو جاتی ہے، اور شہروں کی پُر تکلف زندگی اسے اپنی طرف
تی ہے، دیہاتوں میں شام ہوئی اور لوگ باگ فطرت کے ساتھ ہم آہنگ
گے، ہر طرف خاموشی چھا گئی اور سناٹے کا عالم طاری ہو گیا، دن بھر کے
ہارے دیہاتی لمبی تانے بے غل وغش پڑے سوتے ہیں، علی الصبح
ٹھینگے اور اپنے کام میں مصروف ہو جائینگے، شہروں کی حالت ہی کچھ اور
ے، رات کے بارہ ایک بجے تک جاگنا معمولی سی بات ہے، بازار کھلے

رہتے ہیں، سیلانی چھوڑے اِدھر اُدھر الٹے گیلے پھرتے ہیں، سینما ہالوں میں رونق ہے، معلوم ہوتا ہے سارا شہر اُمنڈ آیا، گلی کوچے بجلی کی روشنی سے دن کا سماں پیش کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے شہروں میں شام کو دن کی نسبت زیادہ رونق ہوتی ہے۔

دیہاتی خصوصیات

دیہات اپنی گوناگوں دلچسپیوں اور دلفریبیوں کے باعث ہمارے مُلک کی جان ہیں، سارے ملک کا رزق دیہاتیوں کی ہمّت سے پیدا ہوتا ہے، وہ سیدھے سادے اور فطرت پسند انسان محنت کر کے اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں لیکن افسوس کہ ان کو اپنی سخت کوش زندگی اور محنت شاقہ کا پھل خود کھانا نصیب نہیں ہوتا، وہ جب تک جیتے ہیں ان کی محنت میں کمی واقع نہیں ہوتی، کیسی نیک اور پُر لطف زندگی ہے کہ دوسروں کے لئے جیتے ہیں، اور ہمّت نہیں ہارتے، سچ ہے اگر وہ کندھا ڈال دیں تو ہم لوگوں کے لئے اناج کہاں سے آئے۔

غرض دیہات کیا ہیں ہمارے لئے رزق پیدا ہونے کی جگہ، صحتوں کو درست کرنے کے مقامات، اور وُہ ارضِ مقدّس جہاں فطرت اور انسانیت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں، نمائش کا نام نہیں، تکلّف کوسوں دُور ہے، جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے قُدرت کے ہرے بھرے شاداب مرغزار نظر آتے ہیں، نہ ان کو مالی ضرورت ہے نہ میونسپل کمیٹی کی نگرانی اور امداد کی حاجت، شب و روز ایسی جاں بخش اور رُوح افزا ہوا چلتی ہے، کہ نئی زندگی بخشتی اور قوّتِ عمل کو تحریک میں لاتی ہے۔